بسم اللہ الرحمن الرحیم

پروفیسر رشید احمد صدیقی

(اپنے مضامین کے آئینے میں)

مؤلفہ

(پروفیسر) محمد معین الدین دردائی۔ ام۔ اے (علیگ)

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ناظم آباد۔ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پروفیسر رشید احمد صدّیقی

(اپنے مضامین کے آئینے میں)

مؤلفہ

(پروفیسر) محمد معین الدین دردائی۔ ام۔ اے (علیگ)

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ناظم آباد۔ کراچی

جملہ حقوق دائمی بحقِ ادارہ محفوظ

ناشر

(سید الطاف علی بریلوی (علیگ)

سیکریٹری

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

نزد سر سید گرلس کالج

بی۔ روڈ۔ ناظم آباد کراچی ۱۸

تعداد [redacted]

قیمت

Secretary,
Educational Conference

مطبوعہ ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس کراچی

سنہ ۱۹۷۹ء

انتساب

مادرِ درس گاہ علی گڑھ میں گذرے ناقابلِ فراموش خوشگوار
ایام کے نام

محمد معین الدین دردائی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست اندراجات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

پیشِ نظر کتاب پروفیسر رشید احمد صدیقی کی آپ بیتی یا مکمل سوانح حیات نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ ہے۔ اس میں ان کے حالات زندگی، افتاد طبع، اور فتوحات سے متعلق تلاش کرنے سے سب کچھ مل جائے گا۔ رشید صاحب نے اپنے بارے میں باقاعدہ کبھی کچھ نہیں لکھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ شاید ہی ان کا کوئی مضمون ایسا ملے جس میں انہوں نے کسی نہ کسی عنوان سے اپنا ذکر نہ کیا ہو۔ چنانچہ ان کے مضامین کے آئینے میں آپ ان کے بچپن سے آخر وقت تک کے اکثر و بیشتر واقعات مثلاً ان کی پیدائش، بچپن، معصوم شرارتیں، پرائمری اسکول میں داخلہ، وہاں کے اساتذہ کا تعارف، ساتھیوں کا تذکرہ، علی گڑھ کالج میں داخلہ، کچی بارک کی دلآویز شوخیاں، علی گڑھ کالج میں داخلہ کے بعد ان کی غیر معمولی ادبی اور تعلیمی سرگرمیاں، علی گڑھ اور علی گڑھ والوں سے والہانہ محبت، علی گڑھ کالج کے ماحول، اور وہاں کے بعض ساتھیوں کا ان کی شخصیت اور کردار سازی میں حصہ ان کی خانگی زندگی، بیوی بچوں سے غیر معمولی محبت و شفقت، بعض اکابر علماء، شعراء، صلحا اور ادبا کے ساتھ ان کے تعلقات، اپنے کالج کے اساتذہ کا تذکرہ، ان کے مخصوص عادات و خصائل اور میلان طبع، ان کے بعض نظریات، اردو شاعری اور شعراء سے متعلق وضاحت

اور پسند و ناپسندیدگی کی جھلک دیکھ سکتے ہیں اور میں نے ان کے مجموعہ مضامین اور تصانیف سے ان ہی باتوں کو چن کر ذیلی عنوانات کے تحت یکجا کر دیا ہے۔

رشید صاحب میرے شفیق استاد تھے۔ چھ برس تک میں ان کے ساتھ رہ کر ان کے فیض اور تبحر علمی سے فیض یاب ہوتا رہا ہوں اور ایک عقیدتمند شاگرد کی حیثیت سے مجھے ان کو بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع ملتے رہے۔ وہ اپنے شاگردوں کو اپنے قریبی اعزا کی طرح سمجھتے تھے اور ان پر ہمیشہ شفقت کی نظر رکھتے تھے۔ ابواللیث صاحب اور مجھ پر ان کی خاص نظر عنایت تھی۔

اسکول ہی کے زمانے سے میں رشید صاحب کے انداز تحریر پر فریفتہ تھا اور جس رسالے میں ان کے مضامین شائع ہوتے اسے ڈھونڈھ کر پڑھتا۔ ۱۹۳۲ء میں جب میں علی گڑھ یونیورسٹی میں داخل ہوا تو وہاں کے اساتذہ میں سب سے زیادہ میں رشید صاحب سے ملنے کا متمنی تھا اور اولین فرصت میں ان سے ملا اور پھر چھ برس تک ان کے ساتھ رہ کر مستفید ہوتا رہا۔

رشید[1] صاحب کی سنہ پیدائش ۲۵ دسمبر ۱۸۹۶ء ہے۔ آپ ضلع جونپور کے مردم خیز قصبہ مڑیاہو کے ایک محلہ پیر ذکریا میں علما اور صوفیا کے خاندان میں پیدا ہوئے۔ حضرت پیر ذکریا جن کے نام سے یہ محلہ منسوب ہے، آپ کے جد اعلیٰ تھے۔ آپ کے والد کا نام شیخ عبدالقدیر تھا۔

رشید صاحب بچپن سے ہی ذہین اور ہوشمند تھے۔ ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ اس کے بعد جونپور گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ میٹرک کے بعد سال دو سال ان پر سخت ابتلا اور آزمائش کا دور گذرا۔ جس پر انہوں نے جلد قابو حاصل کر لیا۔ ۱۹۱۵ء میں علی گڑھ کالج چلے آئے اور یہیں سے ان

---

[1] یہ تمام معلومات رشید صاحب کے صاحبزادے احسان رشید صاحب وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی سے حاصل ہوئیں۔

کی زندگی کا تابناک دور شروع ہوتا ہے۔ انگریزی اور فارسی ادب میں ام۔اے کرنے کے بعد علی گڑھ کالج میں اردو فارسی کے لیکچرر ہو گئے۔ پھر جب مسلم یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ قائم ہوا تو اس میں لیکچرار، پھر ریڈر، اور اس کے بعد صدر شعبہ ہوئے۔

تعلیمی دور میں رشید صاحب اچھے طالب علم کے ساتھ اچھے مقرر، ممتاز مضمون نگار اور اچھے کھلاڑی بھی تھے۔ کئی سال تک ٹینس کے چیمپین رہے ام۔اے میں تعلیم کے دوران علی گڑھ منتھلی (جو بعد میں علی گڑھ میگزین ہوا) کے اردو انگریزی دونوں کے مدیر رہے اور یہ اعزاز طلبا میں بہت کم کو نصیب ہوا کہ انگریزی اردو زبان کے دونوں حصّوں کا ایک ہی مدیر ہو۔

سنہ ۱۹۶۳ء میں رشید صاحب کی ادبی خدمات کے سلسلے میں حکومت ہند نے ان کو ادبی اعزاز اور خطاب "پدم شری" سے نوازا۔ سنہ ۱۹۷۷ء میں عالم جاودانی کو کوچ فرمایا۔ اللہ ان کی تربت کو عنبرین رکھے۔ آمین۔

میرے وہ استاد تھے۔ ظاہر ہے مجھے تو ان کی ہر بات پسند تھی۔ ان کی انکساری، شفقت، سادھو کی سی بے نفسانہ زندگی ——— میں ہی نہیں بلکہ ایک عالم معترف ہے کہ ان کے جیسے مخلص، خلیق، متواضع، مردم شناس، منکسر مزاج، شریف طبع، اعلیٰ ظرف، بے تعصب، تکلفات اور تصنع سے مبرا، سادگی پسند انسان بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔

حتی الامکان، انہوں نے کبھی کسی کی دل شکنی نہیں کی۔ یہ ان کے یہاں گناہ کبیرہ میں سے تھا۔ دوسروں کے ہر وقت کام آنے والے اور دوستوں پر تو جان نثار کرنے والے آدمی تھے۔ وہ کم گو تھے لیکن ان کی گفتگو میں، ہمیشہ مزاح کی چاشنی موجود ہوتی۔ اپنی سادگی پسندی اور دوسروں کی خدمت کرنے کے

شوق کے بارے میں انہوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے:۔

"یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی ہے کہ دل میں خوشی اور خلوص ہو تو رسمی تکلفات بے معنی ہیں۔ مجھے اپنے اوپر وقت، دولت، راحت اور اسی قبیل کی دوسری چیزیں صرف کرنا بڑا شاق ہوتا ہے لیکن مجھے یہ چیزیں بجائے خود ناپسند نہیں ہیں۔ مجھے ہر پسندیدہ چیز پسند ہے۔ البتہ میں اس کے درپے رہتا ہوں کہ اپنے بجائے ان کا فائدہ دوسروں کو پہنچاؤں۔ میں اس آدمی سے بہت خوش ہوتا ہوں جو مجھ سے کم ملے اور زیادہ سے زیادہ مجھ سے کام لے۔"

گلاب سے ان کو بہت پیار تھا اور ان کی کوٹھی میں نادر الوجود انواع و اقسام کے گلاب لگے تھے۔ باغبانی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اپنی فرصت کے اوقات وہ زیادہ تر گلاب کی کیاریوں میں گذارتے۔

رشید صاحب نے اپنے بارے میں وقتاً فوقتاً جو کچھ لکھا ہے اس کی جھلک تو آپ آئندہ صفحوں میں دیکھیں گے لیکن ان کے بارے میں ان کے بعض ہم عصر جو رائے رکھتے تھے اسے بھی ایک نظر دیکھ لیں۔

محمد عبد الواحد خاں واحد رشیدی ایڈیٹر مسلم ٹیلیکار لکھتے ہیں:۔

"پروفیسر رشید احمد صدیقی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ اردو ادب میں ان کا بلند مقام ہے۔ وہ ادیب، انشاپرداز، محقق، نقاد صحافی، عالم اور معلم ہیں۔ مزاح نگاری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اپنی طرز کے انوکھے نثر نگار ہیں۔ گو اور بھی لوگ اس طرز پر لکھتے ہیں مگر ان کا انداز نرالا ہے۔ اور طنزیات میں اچھوتا اسلوب ہے۔ ان کی تحریریں مزاح کی چاشنی، فکر اور فلسفہ، روانی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ یہ کمال ہے کہ تحریر میں ظرافت

بھی ہے اور وقار بھی۔" (روزنامہ جنگ کراچی جنوری ۱۹۷۱ء)

مفتی انتظام اللہ شہابی کا خیال ہے کہ :-

"ایک عالم و محقق کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ادیب، انشاپرداز ہونے کے اعتبار سے پروفیسر رشید احمد صدیقی کا شمار مسلمہ طور پر برصغیر کے بہترین لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ ان کی ہر تحریر نہ صرف مخصوص اور اچھوتے طرز نگارش کی وجہ سے، ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما، کی مصداق ہے بلکہ ان کا مفکرانہ انداز اور فلسفیانہ مضمون نگاری "زندگی زندہ دلی کا نام ہے" کا پیغام جاں فزا ہے۔"
(سہیل کی سرگزشت)

پروفیسر اعجاز ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں :-

"رشید صاحب طنز کے واحد لکھنے والے ہیں اور نہایت کامیابی کے ساتھ اپنا رنگ سب سے جداگانہ قائم کئے ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں ایک طرح کی شستہ ظرافت ہے۔ رمز و کنایہ میں تنقید کے دشوار گذار مراحل طے کر لینا رشید صاحب ہی کا کام ہے۔ ان کے ذاتی جذبات اور احساسات جو واقعہ کے متعلق ہوتے ہیں ایک طنزیاتی انداز میں اس طرح ظاہر ہو جاتے ہیں کہ پڑھنے والا انہیں مذاق سمجھ کر ٹال نہیں سکتا۔ وہ کانٹوں کی طرح دامن میں الجھ کر اپنا اثر پیدا کر ہی لیتے ہیں۔ (تاریخ ادب اردو)

پروفیسر آل احمد سرور رقم طراز ہیں :-

"رشید صاحب کے اسلوب میں ایک خاص شعریت ہے۔ ان میں خشکی کا کہیں پتہ نہیں۔ اس میں کہیں ایسا درد و کرب چھپا

ہوا ہے کہ انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس اسلوب میں حکیمانہ نکتہ سنجی بھی ہے اور شاعرانہ لطف و انتباہ بھی۔ اس کی بلاغت اور تاثیر میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہو سکتا۔ رشید صاحب کے خلوص، ان کی شرافت، دوستی، فراخ حوصلگی، ان کی انسانیت، ان کا سادھوؤں جیسا جذبہ، خدمت خلق، ان کی شخصیت کی پاکیزگی اور ان کی ظرافت کی بلندی کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔" (ادب اور نظریہ)

جلیل الرحمٰن اعظمی صاحب ان کی طرز نگارش پر اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

"رشید صاحب کی ادبی خدمات اور ان کا طرز نگاش دونوں کی انفرادیت مسلّم ہے۔ جس طرح غالب نے اپنے خطوط کے لئے اپنے مزاج کے مطابق ایک طرز اختیار کر لیا تھا جس میں دماغی کاوش اور مشق انشا پردازی کے بغیر خود لکھنے والے کے تجربات و احساسات ڈھلتے جاتے ہیں۔ اسی طرح رشید صاحب نے اپنے مضامین کے لئے ایک ایسی روش وضع کی ہے جسے صرف وہی نبھا سکتے ہیں اور اس کی تقلید ممکن نہیں۔"

(علی گڑھ تحریک)

ڈاکٹر مسعود حسن خاں فرماتے ہیں:

"رشید صاحب ایک ادبی قامت بھی ہیں۔ ایک تاثر بھی اور ایک ادیب بانفوذ بھی۔ ان کے طنز و مزاح نے اُردو ظرافت کو ایک شستہ ذہن اور شائستہ لہجہ عطا کیا ہے جس میں اُردو شعر و ادب کی صدیوں کی بازگشت ملتی ہے۔ اپنے طرز نگارش سے انہوں نے اردو ادیبوں کی ایک نسل کو متاثر کیا ہے۔"

(مقدمہ بہ رشید احمد صدیقی تصنیف ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید)

ایک طالب علم کی حیثیت سے میرا مطالعہ ہے کہ رشید صاحب اُردو ادب کے چند چوٹی کے طنز نگاروں میں سے ایک ہیں۔ لیکن ان کے طنز میں بھڑ کے ڈنک کی صرف سوزش نہیں بلکہ شہد کی مکھی کی مٹھاس بھی پائی جاتی ہے اور یہ کچھ تو مزاح سے پیدا کر لیتے ہیں اور کچھ خود اپنے کو اس طنز کا ہدف بنا کر۔ اکبر الٰہ آبادی نے اپنے اشعار کے ذریعے قوم کی سماجی، معاشرتی، مذہبی اور سیاسی حالات میں تبدیلی لانے اور اصلاح کرنے کی کوشش کی اور رشید صاحب نے وہی کام اپنی نثر سے لیا۔ ان کا ہاتھ ہمیشہ قوم اور بالخصوص نوجوانوں کی نبض پر رہتا تھا وہ اپنے مضامین کے ذریعے ان کو ان کی غلطیوں پر متنبہ کرنا چاہتے تھے لیکن اس طرح کہ مزاج میں برہمی نہ پیدا ہو۔

ان کے مضامین غزل کی طرح غیر مربوط ہوتے ہیں۔ نظم کی طرح مسلسل نہیں وہ ایک ہی مضمون میں ایک سے زیادہ مختلف موضوعات پر اظہارِ خیال کر جاتے ہیں۔ جن کا ایک دوسرے سے تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی ہر ایک اپنی جگہ پر مکمل ہوتا ہے اور یہ ان کے مضامین کی امتیازی خصوصیت ہے۔

رشید صاحب کے طنز و مزاح میں وقار اور خلوص پایا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ سماج اور معاشرہ پر ان کی تنقید اور طنز کسی کو بدمزا نہیں کرتی۔ ان کے یہاں تلخی سے زیادہ شیرینی پائی جاتی ہے۔ پھر وہ چونکہ اپنے کو قوم و معاشرہ سے علیحدہ نہیں سمجھتے اس لئے وہ زیادہ تر طنز اپنے اوپر رکھ کر کرتے ہیں۔ ان کے یہاں مزاح اور طنز محض مزاح اور طنز کے لئے یا لوگوں کو خوش کرنے کے لئے نہیں ہوتا بلکہ وہ معاشرہ اور سماج کی اصلاح کے لئے صدقِ دل سے قلم اٹھاتے ہیں۔ ان کے طنز میں گہرائی، صداقت اور خلوص پایا جاتا ہے۔

طنز نگاری کے بارے میں رشید صاحب ایک خاص نظریہ رکھتے

تھے اور اس کو ایک جگہ انہوں نے اپنے مضمون میں لکھا بھی ہے۔

وہ طنز و ظرافت آسانی سے ہاتھ آجانے والے لیکن پُر پیچ اور خطرناک آلے ہیں۔ ہنسی دل لگی یا طعن و تشنیع کسے نہیں آتی لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کب ہنسنا چاہیئے، کس پر ہنسنا چاہیئے۔ کتنا ہنسنا چاہیئے اور سب سے مشکل یہ کہ کیسے ہنسنا چاہیئے۔ جو بات ظرافت کے بارے میں کہی گئی ہے وہی طنز پر بھی صادق آتی ہے۔ دونوں کی بدنصیبی یہ رہی ہے کہ سہل الحصول ہونے کے سبب سے ہم ان ذمہ داریوں کا خیال نہیں کرتے جو ان کی طرف سے ہم پر عائد ہوتی ہیں اور ان کو بھول جاتے ہیں کہ سستی طنز و ظرافت بہت مہنگی پڑتی ہے یعنی احتیاط سے کام نہ لیا جائے تو طنز و ظرافت سے کام لینے والا خود طنز و ظرافت کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہم میں سے اکثر شکار ہیں۔ طنز کی محرک برہمی یا بیزاری ہوتی ہے۔ ظرافت کی تفریح و تفنن، ان کا رشتہ نفس واقعہ سے بھی ہے اور فن کار کے ردعمل سے بھی۔ ایک ہی واقعہ ایک شخص کو ایک طرح سے متاثر کرتا ہے اور دوسرے کو دوسری طرح۔ ایک اس سے برہمی یا بیزاری کا اظہار کرے گا۔ دوسرا اس کے مضحک یا تفریحی پہلو کو اُبھارے گا۔ اس کے بعد یہ دیکھتے ہیں کہ جس فنکار کا جیسا ردعمل ہوا ہے اس کا اظہار اس نے کس طرح کیا ہے یعنی فن کار کی شخصیت کس پایہ کی ہے اور فن پر اس کی گرفت کیسی ہے۔

نادانستہ طور پر یہ بحث اس منزل پر آگئی جہاں فن اور شخصیت کے رشتے سے بحث کرنا ضروری ہو جاتا ہے لیکن یہاں صرف اتنا

کہنے پر اکتفا کروں گا کہ فن کو شخصیت سے توانائی اور توثیق ملتی ہے اور فن کی غلامی شخصیت کی نامحکمی کی دلیل ہے۔ فن ٹیکنیکل اور شخصیت عطیۂ الٰہی ہے جو ریاضت اور انتظار سے جلا پاتی ہے۔"

"آج کل طنز و ظرافت میں جس چیز کی کمی خاص طور پر محسوس ہوتی ہے وہ شخصیت ہے۔ سبب یہ ہے کہ ہمارے بیشتر لکھنے والے بندھے ٹکے موضوعات کے اسیر ہو گئے ہیں جن پر طنز و ظرافت کا عمل کوشش کئے بغیر کارگر ہو سکتا ہے۔ یہ سستا اور فضول کاروبار ہے۔ شخصیت کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ معمولی کو غیر معمولی بنا دے۔ یعنی طنز و ظرافت کے پہلو وہاں دیکھ لے جہاں کسی دوسرے کا ذہن آسانی سے نہ پہنچ سکتا ہو۔ طنز و ظرافت کے یہی نمونے فن کار کی شخصیت کی کشید ہوتے ہیں اور اچھے ادب اور اچھے ذہنوں میں جگہ پاتے ہیں۔"

مقدمات اور خطبات کے علاوہ رشید صاحب کی مندرجہ ذیل کتابیں چھپ کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔

(۱) طنزیات و مضحکات (۲) مضامینِ رشید (۳) آشفتہ بیانی میری (۴) سہیل کی سرگذشت (۵) شیخ نیازی (۶) ذاکر صاحب (۷) خنداں (۸) گنج ہائے گراں مایہ (۹) ہم نفسانِ رفتہ۔

طنزیات و مضحکات ایک علمی اور تحقیقی کتاب ہے۔ اس کی اہمیت اس سے اور بڑھ جاتی ہے کہ اردو زبان و ادب میں صنف طنز نگاری پر اب تک کسی نے فنی اور علمی حیثیت سے ایسی کتاب نہیں لکھی تھی۔ اردو ادب میں طنز و مزاح بہت عرصے سے آ چکا تھا لیکن تاریخی اور فنی حیثیت سے جس

تفصیل کے ساتھ رشید صاحب نے اپنی کتاب "طنزیات و مضحکات" میں اس صنف پر روشنی ڈالی ہے وہ حد درجہ قابلِ قدر ہے۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں بتایا گیا ہے کہ طنز یات کی ابتدا یورپ میں کب اور کس طرح ہوئی۔ دوسرے حصہ میں مختلف افراد کا مثلاً سوداؔ مصحفیؔ، انشاءؔ، غالبؔ آزادؔ اور کبیرؔ وغیرہ کا الگ الگ ذکر کیا گیا ہے۔ رشید صاحب کے اسلوب تحریر نے اس میں حد درجہ دل کشی پیدا کر دی ہے۔

گنج ہائے گراں مایہ اور ہم نفسانِ رفتہ میں انہوں نے اپنے ہم عصر علماء صلحا، ادبا، شعراء اور سیاست دانوں کے انتقال پُر ملال پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ بقیہ کتابیں ان کے مضامین کا مجموعہ ہیں۔

اس کتاب کو لکھنے اور ترتیب دینے میں عزیزی ڈاکٹر منہاج الدین سلمہٗ لیکچرار ملتان یونیورسٹی نے میری بہت امداد فرمائی۔ کتابیں فراہم کیں۔ بار بار تقاضا کیا۔ میں ان کا بدل شکر گذار ہوں۔

آخر میں برادر محترم سید الطاف علی بریلوی صاحب علیگ کا شکر گذار ہوں جنہوں نے اس کتاب کی طباعت اور اشاعت میں گہری دلچسپی لی اور اس کو آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی جانب سے شائع کر کے میری ہمت افزائی فرمائی۔ [1]

محمد معین الدین دردائیؔ۔

کراچی ۲۰ دسمبر ۱۹۷۸ء

---

[1] دلی رنج اور صدمہ ہے کہ اس انتہائی دل آویز کتاب کی تکمیل کے بعد ۱۴ اپریل ۱۹۷۹ء کو فاضل مصنف جناب پروفیسر معین الدین دردائیؔ کا انتقال ہو گیا اور وہ ہمیشہ کے لئے ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ اللہ مغفرت فرمائے۔

قبل ازیں ہم نے پروفیسر دردائی مرحوم کی دو مزید کتابیں "صوفیائے بہار اور اُردو" نیز "صوفیائے سندھ اور اردو" بھی شائع کی تھیں۔ (بریلوی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا آبائی مسکن جونپور کا ایک مردم خیز قصبہ مڑیاہو تھا جہاں ان کا خاندان باعزت اور پُرسکون زندگی بسر کرتا رہا۔ وہ وہیں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ "ماضی کے دھندلکوں سے یادوں کا کارواں"[1] میں انہوں نے اس کی ایک جھلک پیش کی ہے۔

پیدائش اور بچپن معلوم نہیں کیا عمر تھی۔ کون سا قریہ یا قصبہ تھا۔ ان اشخاص کا بھی علم نہیں جو میری پرورش اور دیکھ بھال کرتے تھے۔ البتہ کچی دیوار کی ایک کشادہ کوٹھری یاد ہے۔ اس کی مٹیالی لیکن ستھری اور روشن دیواریں اور دروازے . . . . . یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ ماں باپ اور گھر کے دوسرے لوگ یا اس کوٹھری کے باہر کے اطراف و مقامات کب اور کیسے پہچان میں آئے۔ . . . . . .

"پھر ایک اور جگہ سے سابقہ ہوا۔ وہاں تصورات میں وسعت آئی۔ ماں باپ کو پہچاننے لگا اور وہ ہر تکلیف و راحت میں یاد آنے لگے۔ چاروں طرف طرح طرح کے لوگ، چیزیں حالات و حوادث روز بروز بڑھنے لگے، پھیلنے لگے۔ اچھا کھانا، اچھا لباس، اچھا سلوک، اچھے لوگ پسند آنے لگے۔ بُرے اور بدصورت بُرے معلوم ہونے لگے۔ کیوں اور کیسے؟ یہ نہیں معلوم۔ جس "تاثراتی تنقید" سے آج متہم ہوں اس کی چھوت شاید اسی وقت سے دامن گیر ہو۔

---

[1] "ماضی کے دھندلکوں سے یادوں کا کارواں" مطبوعہ نگار، اپریل ۱۹۶۵ء

"اس کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جب پڑھانے کے لئے ایک مولوی صاحب مقرر کئے گئے۔ جو کچھ پڑھاتے وہ سمجھ میں نہ آتا۔ ان کی شکل بھی اچھی نہ تھی لیکن ان کا طور طریقہ بات چیت کرنے اور بتانے سمجھانے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ بہتوں کی خوبصورتی سے ان کی بدصورتی زیادہ اچھی لگتی۔ بہت دنوں بعد خیال آیا کہ وہ مذہبی آدمی تھے۔ اتنے ہندو مسلمان کے معنوں میں نہیں جتنے اللہ رسول کے مفہوم میں۔ دنیا کے کیسے کیسے نشیب و فراز سے گذرا ہوں۔ مذہب و اخلاق کی اس کشش سے میں نے اپنے کو آزاد نہ پایا۔ . . . . طفولیت کے اس خیاباں سے شگفتہ و شاداب یادوں کی کیسی دل نواز خوشبو آتی ہے۔

گھر کے مکتب کے ساتھ ساتھ پرائمری اسکول میں داخلہ

مولوی صاحب کے ہمہ گیر و ہمہ وقت تسلط کے علاوہ دیہات کے اسکول کی گرفت میں آیا جہاں ہم عمروں کے ساتھ پڑھنے لکھنے، سیکھنے، کھیلنے، جھگڑنے اور جلد صلح صفائی کر لینے کے لطف اٹھانے کے طور طریقے سیکھے۔ یہ پہلی جگہ تھی جہاں میں نے گھر میں پلے ہوئے جانوروں کے علاوہ انسانوں سے محبت کرنے اور ان کی محبت سے سرخوش و سرفراز ہونا محسوس کیا۔ ہر روز گھر سے خوش گوار امیدوں کے ساتھ جاتا اور اس ناقابلِ اظہار احساس سے مطمئن و مفتخر واپس آتا کہ گھر پر کتنا پُر تپاک خیر مقدم ہوگا جیسے میرا جیسا کوئی دوسرا نہ تھا۔

پرائمری اسکول سے شہر کے انگریزی اسکول میں داخل ہونا

دیہاتی مدرسے سے شہر کے انگریزی اسکول میں آنا یاد ہے۔ عمر و شعور کے بڑھنے اور ماحول کے بدلنے سے دفعتاً اب معلوم ہوا جیسے زمان و مکان، حالات و حوادث، انسان و اشیاء سب ہی بدل

گئے ہوں. معلومات کے کتنے دروازے کھلتے ہوئے معلوم ہونے لگے. کیسے کیسے مسائل سے سابقہ ہونے لگا. بڑوں کا پاس، اعلیٰ اقدار سے وابستگی اور کبھی کبھی ان سارے بندھنوں سے آزاد ہو جانے کی بے پناہ خواہش۔"

ایک اور جگہ "آشفتہ بیانی میری" میں رشید صاحب نے اپنے بچپن کے دور کی تعلیمی سرگرمیوں کی بڑے دلکش انداز میں عکاسی کی ہے۔ اس میں اپنے دیہاتی اسکول کے چند اساتذہ کا نہایت دلچسپ خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رشید صاحب کو اپنا یہ دورِ طفلی حد درجہ محبوب اور کیف آگیں نظر آتا تھا۔ نیز اسی دورِ طفلی میں مذہب اور اقتدار کی جو چھاپ اُن پر پڑی وہ آخر وقت تک قائم رہی۔

قاعدہ بغدادی سے انٹرنس پاس ہونے تک

جیساکہ[1] پچھلے زمانے کے بیشتر مسلمان گھرانوں کا دستور تھا، میں نے بھی قاعدہ بغدادی، کلام پاک اور تختی لکھنے کی تعلیم اپنے گھر پر اس عہد سے بھی پرانے ایک مولوی صاحب سے پائی۔ اس طرح کے ایک دوسرے مولوی صاحب نے کچھ دنوں بعد فارسی کی کچھ کتابیں فارسی سے بھی مشکل اور زبان و بیان کے اعتبار سے مضحکہ خیز اُردو میں پڑھائیں۔ اس دوران میں ایک اور مولوی صاحب سے چند رسالے عربی کے بھی پڑھے۔ قاعدہ کچھ اس طرح کا بن گیا تھا کہ جس طرح کے مولوی صاحب ہوں اسی طرح کی پڑھائی ہو۔ یعنی مولوی صاحب صرف قرآن شریف پڑھا سکتے ہوں تو قرآن شریف پڑھائیں اور فارسی پڑھا سکتے ہوں تو فارسی، عربی جانتے ہوں تو وہی سہی، مقصد غالباً یہ تھا کہ مولوی صاحب

---

[1] آشفتہ بیانی میری صفحہ ۳۴-۳۸-۳۹-۴۰

کی پرورش ہو، گھر والوں کو ثواب ملے اور طالب علم اتنی دیر گھر اور محلہ والوں کی عافیت میں خلل انداز نہ ہو۔

ان مضامین میں اور اس طرح کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اُردو، پہاڑے، حساب وغیرہ سیکھنے کے لئے دیہات کے پرائمری سے بھی پرائمری اسکول میں جانا پڑتا تھا جس پر پرائمری سے زیادہ پریمیٹو (PRIMITIVE) ہونے کا اطلاق ہوتا تھا۔ انٹرنس میں نے گورنمنٹ ہائی اسکول جونپور سے کیا۔

رشید صاحب نے اپنے پرائمری اسکول کے اساتذہ کا خاکہ اور اسی دور کے ماحول اور معاشرہ کا نقشہ اپنے مخصوص انداز میں جس چابک دستی سے پیش کیا ہے وہ نہ صرف اُردو مزاح نگاری میں ایک شاہکار کی حیثیت سے قائم و دائم رہے گا بلکہ اُس دور کے ہندو مسلمان طلباء کی یگانگت، رواداری اور بہت سی ایسی چیزوں کو نمایاں کرتی ہے جس سے خود رشید صاحب مدت العمر متاثر رہے۔

دیہات کے پرائمری اسکول کے اساتذہ کے خاکے

اس بات پر اکثر ہنسی آتی ہے کہ جو زبان تمام عمر کے لئے وجہ معاش قرار پائی یعنی اُردو، وہ میں نے اسکول میں سیکھی ایسے ماسٹر صاحب سے جو اُردو میں غالباً صرف اپنے دستخط کر سکتے تھے اور جو اتنے ہی کٹر برہمن تھے جتنے شریف النفس اور دردمند انسان۔

کوئی کلاس سامنے ہو وہ پڑھتے تھے بڑے زور زور سے صرف رامائن، لوٹا ڈوری گھر سے ساتھ لاتے۔ راستے میں کسی متبرک کنوئیں سے پانی بھر لیتے اور صبح اسکول پہنچتے ہی سب سے پہلے اپنی کرسی کو غسل دے دیتے۔ پانی نتھر جاتا تو کرسی پر اُکڑوں بیٹھ جاتے اور اس کی احتیاط رکھتے کہ پاؤں کے تلووں

کے سوا جسم کا کوئی اور حصہ کرسی کو نہ چھو جائے. مضبوط کھردری رسی سے مرصع و مستحکم کم و بیش چھ اِنچ اونچی کھڑاؤں پہنتے تھے. اس کھڑاؤں پر وہ چار پانچ میل کا روزانہ سفر کر کے اپنے گاؤں سے اسکول آتے جاتے تھے. اسکول پہنچتے ہی دس پندرہ منٹ تک اُن سانپ بچھو اور مینڈکوں اور کبھی کبھی ایک آدھ خرگوش کی اچانک رحلت پر تعزیت کے ریزولیشن پاس کرتے جو ہر روز کھیتوں اور پگڈنڈیوں پر اُن کی کھڑاؤں ٹرک کے تلے آکر آنجہانی ہو جاتے. وہ شاید ہندی سے بھی کچھ زیادہ لطف نہ رکھتے تھے. اس لئے کہ میں نے ان کو کسی طالب علم کے قلم پینسل، کاپی، تختی کو چھوتے نہ دیکھا. ان پر جو کچھ لکھا یا بنا ہوتا دور سے دیکھ کر صحیح قرار دے دیتے. نہ خود کبھی سبق دیتے نہ سنتے. صرف رامائن سناتے. نہ کسی ہندو لڑکے کا لایا ہوا پانی پیتے نہ کسی شخص یا شے کو ہاتھ لگاتے. دور سے ترس کھاتے، مسکراتے اور شفقت کرتے نظر آتے.

اچھے مُعلّم کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ اس کا علم متعدی ہو یعنی طالب علم کو اُڑ کر لگے اور ایسا معلم ناکارہ قرار دیا گیا ہے جس کا علم اُسی تک محدود رہے. معلوم نہیں ماسٹر صاحب اس نکتے سے واقف تھے یا نہیں لیکن ان کا عقیدہ کچھ اس طرح کا ضرور تھا کہ چھوت چھات کے اصول پر پڑھے ہوئے طالب علم کا علم اس کے ساتھیوں کو جا لگے گا. اس لئے وہ خود پڑھانے لکھانے کا دھندا نہ کرتے. معلوم نہیں وہ ایسا کر بھی سکتے تھے یا نہیں. اور یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ خود ماسٹر صاحب کلاس میں اس طرح کی علمی یا تعلیمی چھوت چھات سے بہرہ مند ہوئے یا نہیں. بہر حال کلاس میں ہوتا یہی رہا کہ پڑھے لکھے طالب علم اَن پڑھ ساتھیوں کو اسکول کا کام بڑی خوش اسلوبی سے کروا دیتے تھے.

اس زمانے میں تقریباً تمام پوربی اضلاع میں سال کے زیادہ حصے طاعون پھیلا رہتا۔ ان مواقع پر ہمارا اسکول پاس ہی کے ایک مندر میں منتقل ہو جاتا۔ ہم دو تین لڑکے مسلمان تھے جو مورتیاں مندر کے برآمدے اور صحن میں تھیں اُن کو چھونے کی ہم کو اجازت تھی۔ ہم سب یعنی ہندو مسلمان دونوں اس پر خوش تھے کہ مورتیوں کے چھونے کا منصب ہم کو حاصل تھا۔ ماسٹر صاحب کو نہ چھو سکتے نہ سہی۔ ماسٹر صاحب تو ہمارے ہی جیسے گھریلو قسم کے لوگوں میں سے تھے ان کو تو نہ چھونا ہی افضل تھا۔ چھونے سے معلوم نہیں ہم پر کیا مصیبت نازل ہو یا ماسٹر صاحب کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں۔

ہر لڑکا مندر ہی کے کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتا۔ مندر سے متصل گیندے اور کنیر کے پھولوں کا بڑا قطعہ تھا۔ پھول توڑنے اور چڑھانے میں دوسرے بچوں کی طرح مجھے بھی کسی قدر دلچسپی تھی۔ ان پھولوں کی بو عام طور پر لوگ پسند نہیں کرتے۔ مجھے پسند ہے۔ کہتے ہیں کہ پھول کی خوشبو سے جوانی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ کنیر اور گیندے کے علاوہ ایسے پھول ہیں جن کی خوش بو سے مجھے اپنی ہی نہیں دوسروں کی جوانی بھی یاد آ جاتی ہے لیکن کنیر اور گیندے کی بو مجھے اس لئے پسند ہے کہ اس سے مجھے اپنا بچپن یاد آتا ہے۔ جوانی کی "ملوث" یاد سے طفلی کی "معصوم" یاد میرے نزدیک زیادہ قابلِ قدر ہے۔

ماسٹر صاحب رامائن بڑے والہانہ انداز سے پڑھتے اور اُس کا مطلب اتنی ہی نرمی اور محبت سے اپنی زبان میں جو ٹھیٹھ پوربی سے بھی زیادہ ٹھیٹھ کوئی چیز ہوتی سمجھاتے۔ اِس طور پر رامائن کی پوری

داستان مجھے یاد ہو گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیہات اور شوالے کی فضا میں جو ابتدائی تعلیم میسر آئی اس نے ذہن و دل کو اس طرح اپنی گرفت میں لیا کہ طنز و ظرافت باوجود مدت العمر کے ادبی مشغلے ہونے کے آج تک اس کا اتفاق نہ ہوا کہ طنز و ظرافت کا کوئی فقرہ ہندو معتقدات کے بارے میں زبان یا قلم سے نکل جائے ۔ علی گڑھ آیا تو اس پر مزید مُہر لگ گئی اور شاید یہ دونوں کا تصرف تھا کہ حتی الوسع میں نے کسی مذہب پر نہ تو کبھی نکتہ چینی کی اور نہ اس کا مذاق اُڑایا ۔

اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب چھ فٹ سے اونچے قد کے بڑے کڑوے کڑیل ٹھاکر تھے ۔ پڑھانے لکھانے سے اُن کو بھی دلچسپی نہ تھی ۔ زیادہ وقت لکڑی پھاڑتے اور رسوئی بناتے رہتے ۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد رسوئی سے باہر نکل آتے ۔ سانس پھُولا ، چہرہ تمتایا ، آنکھیں انگارہ سی دہکتی ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وسطِ اسکول میں پہنچ کر نعرہ لگاتے ۔ مہاراج پاٹھ پرشاد بند لکھائی پڑھائی کرو ، ہیڈ ماسٹر صاحب کی گرج سن کر سارا اسکول ایک زبان ہو کر جو دل میں آتا چیخ چیخ کر پڑھنے لگتا ، جس میں ماسٹر صاحب کی ایک آواز سب سے اونچی ہوتی اور پہچانی جاتی ۔ اس لئے کہ ساری بامعنی آوازوں میں وہی ایک آواز بے معنیٰ ہوتی ۔"

رشید صاحب موضوعی انشا پرداز (SUBJECTIVE WRITER) ہیں ۔ وہ اپنی کسی تحریر میں اپنا ذکر کرنے سے نہیں چوکتے ۔ اُن کے طنز و مزاح کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جہاں اشخاص ، معاشرہ اور ماحول پر طنز

کے تیر چلاتے ہیں وہاں خود کو بھی نہیں بخشتے۔ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے زخم کو چھیڑنے میں جیسے اُنہیں لطف آتا ہو۔ ایک جگہ اپنے بچپن کی شرارتوں، بے وقوفیوں اور مخصوص عادتوں کو ایسے دل کش انداز میں پیش کیا ہے کہ اُردو ادب میں اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔

سادگی اور معصوم شرارتیں

بہت دنوں کی بات ہے جب میں بہت چھوٹا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے شرارت کبھی نہیں کی لیکن اب یہ کیا چھپانا ہے بے وقوفیاں البتہ خوب کی ہیں۔ میں بے وقوف ہوں اس لئے بچے عقل مندی سیکھنے کے لئے میرے پاس آتے رہتے ہیں۔ بچے بڑے ہوں گے تو اُن کو ایسے بہت سے عقل مند ملیں گے جنہوں نے بے وقوفوں سے عقل مندی سیکھی ہوگی۔ خود میں نے ایسے عقل مندوں سے بے وقوفی سیکھی ہے۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں بے وقوف ہوں۔ میں نے شرارت کبھی نہ کی۔ اسی لئے ماں باپ کے ہاتھ سے کبھی نہیں پٹا۔ لیکن بے وقوفیوں کے سلسلے میں مجھے بعض سزائیں ضرور بھگتنی پڑی ہیں۔ میں جہاں رہتا تھا اس سے قریب ہی ایک ٹوٹی مسجد تھی جس میں بہت سارے چمگادڑ ٹپسیا میں اُلٹے لٹکے رہتے تھے۔ کچھ بے ٹونٹی کے مٹی کے لوٹے جہاں تہاں رُکوع اور سُجود میں نظر آتے تھے۔ کسی زمانے میں مسجد کے گرد احاطہ بھی تھا۔ جس کی دیوار گر چکی تھی لیکن سامنے کا دروازہ قائم تھا جس میں کواڑ اور کنڈی بھی تھی۔ گھر کا ایک بوڑھا ملازم تھا فضلو۔ نہایت دُبلا پتلا اس کے ہاتھ ایسے لکڑی کے بنے معلوم ہوتے تھے جس پر سے سوکھی چھال علیحدہ نہ کی گئی ہو۔ خاموش جھکا ہوا بالکل اُسی ٹوٹی مسجد کی مانند

لہ ہیچ نیازی صہ ۴۳ - ۴۴ - ۴۵

کبھی کبھی میں اُسے پسند بھی کرتا تھا لیکن آگے چل کر آپ کو معلوم ہوگا کہ میں کیوں اُس سے بیزار ہوگیا۔

والدہ کی تاکید تھی کہ بڑے بھائی کا نام نہ لیا کرو۔ اُس زمانے میں اپنے سے بڑے کا نام لینا اور رشتہ یا تعظیم کا کوئی لفظ شامل نہ کرنا بدتمیزی خیال کیا جاتا تھا۔ بڑے بھائی کا پیار کا نام ممنا تھا۔ اکثر غصے میں ان کو ہمنا کہہ دیتا۔ اس کی شکایت ہوتی تو ماں باپ مجھ کو سمجھاتے اور بُرا بھلا کہتے۔ چنانچہ معلوم نہیں کیوں اور کیسے میں یہ سمجھنے لگا کہ ممنا نام نہیں بلکہ کوئی گالی یا بدتمیزی تھی۔

ایک دن بھائی کی شکایت کرنے ماں کے پاس پہنچا۔ بے وقوف ہونے کے علاوہ میں کمزور اور مریض بھی تھا۔ اس لئے ہر شکایت رو کر پیش کرتا یہی نہیں بلکہ روتا زیادہ اور شکایت کم کرتا۔ والدین سمجھنے لگے تھے کہ جب تک میں رونے کا پورا کورس ختم نہ کرلوں گا مطلب کی بات زبان پر آنے نہ دوں گا اس لئے میرے رونے کی طرف توجہ نہ کرتے۔ اس سلوک سے ظاہر ہے مجھے اور زیادہ رونا پڑتا۔ اس لئے میرے رونے کی مدت ہمیشہ بڑھتی رہی لیکن جلد ہی مجھ پر یہ بھید کھُلا اور آنکھیں کھُلیں (میں آنکھیں بند کر کے روتا تھا) کہ اس طرح روتے رہنے میں اتنی دیر لگ جاتی ہے کہ شکایت کرنا ہی بھول جاتا ہوں۔ اس طرح نہ جانے میری کتنی معصوم شکایتوں کا خون ہوتا رہا۔ اور مجھے کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ آخر میں مجھے کچھ ایسا بھی معلوم ہونے لگا تھا کہ شاید میرے رونے کا تال سُر ٹھیک نہ تھا اس لئے کہ لوگ ہمدردی کرنے کے بجائے مجھ پر ہنسنے لگتے تھے اور پیٹھ پیچھے ہنستے

تو ایسا کچھ بُرا بھی نہ تھا۔ رونا تو اس کا تھا کہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنستے۔ اس لئے خاص طور پر میں نے آنکھیں بند کر کے رونا شروع کر دیا تھا۔

جب تک میں روتا رہا والدہ خاموش رہیں۔ میں یہ سمجھا کہ میرے رونے کا اثر ہو رہا ہے۔ اس لئے میں نے اس سلسلے کو جاری رکھا۔ نتیجہ وہی ہوا جو میں بتا چکا ہوں یعنی رونے کا کورس ختم ہو گیا اور میں وہ بات بھول گیا جس کے لئے رونا شروع کیا تھا۔ والدہ نے پوچھا کیا بات تھی۔ تو بجائے بات یاد آنے کے مجھے رونا یاد آ گیا۔ یہ دیکھ کر وہ پھر دوسری طرف متوجہ ہو گئیں۔ میں نے چیخ کر کہا کہ بھائی صاحب نے مجھے گالی دی ہے۔

والدہ کو گالی سے بڑی نفرت تھی۔ اکثر کہا کرتیں کہ گالی سے بہتر مار پیٹ ہے۔ والدہ کا یہ کہنا مجھے یاد تھا۔ ایک دفعہ میں نے اس پر عمل بھی کیا لیکن جلد ہی معلوم ہو گیا کہ مار پیٹ یک طرفہ نہیں بلکہ دو طرفہ ہوتی ہے۔ جہاں اس طرح کا دو طرفہ کاروبار ہو رہا ہو وہاں مجھ جیسا بے وقوف جس کا ذہن یک طرفہ ہوتا ہے ہمیشہ گھاٹے میں رہے گا۔ بھوت اور بے وقوف دونوں کے بزرگوں نے مار پیٹ سے بچنے کی بڑی قیمتی وصیتیں چھوڑی ہیں۔

بھائی صاحب بلائے گئے اور ان سے جواب طلب کیا گیا۔ الزام سن کر وہ ہکا بکا رہ گئے۔ پھر بولے ان ہی سے پوچھئے میں نے کب کون سی گالی دی ہے۔ میں نے ایک نعرہ لگا کر کہا کہ "انہوں نے مجھے بڑے زور سے حمنا کہا ہے۔" لیکن میں یہ دیکھ کر خود ہکا بکا رہ گیا کہ سارے گھر والوں نے میرے نعرے سے کہیں بلند قہقہہ لگایا۔ اس کے بعد بھائی صاحب نے میرے خلاف اپنی کتاب پھاڑ ڈالنے کا جو الزام لگایا اس پر مجھے سزا دی گئی۔ فضلو بلایا گیا اور یہ

ہدایت کی گئی کہ مجھے جاکر ٹوٹی ہوئی مسجد میں بند کر دیا جائے جہاں مجھے سیار دگیدڑ) کھا جائے گا۔ وہ مجھے پیٹھ پر لاد کر مسجد لایا اور اندر دھکیل کر صدر دروازہ کی کنڈی باہر سے چڑھا دی۔

میں دیر تک روتا، شور مچاتا اور دروازے کو دھکے دیتا رہا۔ اس میں شک نہیں کہ آس پاس دیواریں گری ہوئی تھیں اور میں کسی طرف سے باہر نکل سکتا تھا لیکن میرے ذہن میں یہ بات کس طرح آسکتی تھی اور آتی بھی تو میں اُسے مان کیوں لیتا کہ جس دروازے سے مجھے مسجد میں داخل کیا گیا، نکلنے کے لئے میں اُس کے بجائے کوئی اور دروازہ تلاش کرتا۔ قاعدہ کی بات یہ ہے اور بے وقوف سے زیادہ قاعدہ کا پابند کون ہوسکتا ہے کہ جس راستے سے داخل ہوں اُسی راستے سے باہر نکلیں۔ اگر وہ راستہ بند ہے تو قصور اس راستے کا ہے اسے کھلنا چاہیئے اور میں یہی کوشش کر بھی رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میری ہی عمر کا ایک لڑکا بھی آیا اس نے بھی مجھے بتایا کہ ہر طرف سے دیوار گری ہوئی تھی جدھر سے چاہوں نکل جاؤں۔ اس کی عمر اور گستاخی دیکھ کر میں نے اس پر ایک ڈھیلا پھینکا جس کا اس نے قہقہہ سے جواب دیا۔ میں آپے سے باہر ہوگیا۔ ساتھ ہی ساتھ لڑکے سے نپٹنے کے لئے مسجد سے باہر ہو گیا لیکن لڑکا بھاگ گیا اور میں پھر مسجد کے اندر دروازے سے جا لگا۔

کافی دیر بعد فضلو نے دروازہ کھولا اور میں باہر نکلا اور پیدل مکان واپس آگیا اور فضلو کے کہنے پر بھی نہ تو اس کی گود میں گیا نہ اس کی انگلی پکڑی۔

میں اپنی ہر بے وقوفی پر مسجد میں قید کیا جاتا۔ سیار کبھی نظر نہ آیا۔ اس لئے میں کچھ ایسا سمجھنے لگا تھا کہ مسجد میں بند ہونا اور نہ نکل پانا سیار تھا۔ البتہ

مجھے فضلو سے نفرت ہو گئی تھی اور میں اس پر خدا کا شکر کیا کرتا کہ اس نے میرے لئے مسجد کو سیارہ بنا دیا تھا فضلو کو نہیں. میں اس کی بھی دعا مانگا کرتا تھا کہ خدا وہ دن لائے جب فضلو کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر مسجد میں قید کر آؤں.

مجھے مٹی اور فضلو کو چغلی کھانے کا بڑا شوق تھا. میرا یہ شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اکثر مجھے کچھ ایسا بھی خیال ہوا جیسے میں نے مٹی نہیں کھائی تھی بلکہ مٹی نے مجھے کھایا تھا. ممکن ہے فضلو کے ساتھ چغلی نے بھی یہی سلوک کیا ہو. مٹی کھانے میں بڑا مزا آتا تھا. یہ مزا فضلو کے چغلی کھانے سے کرکرا ہو جاتا. کبھی کبھی مٹی بھی کرکری ہوتی.

مٹی کھانے پر والد صاحب نے ایک دن میرے دونوں کان پکڑ کر اتنا اونچا کر دیا جتنا کہ میں اب ہوں. میرے لئے یہ تجربہ بالکل نیا تھا اور تکلیف دہ بھی. خاص طور پر ایسی حالت میں جب کہ مٹی منہ میں ہو اور زبان باہر. اور مٹی کی یہ دنیا کچھ ایسی معلوم ہو رہی ہو جیسے مٹی کھانے پر اسے بھی کان پکڑ کر اٹھا لیا ہو. والدہ نے دوڑ کر مجھے زمین پر آنے سے پہلے ہی گود میں سنبھال لیا. میں نے اس وقت خیال کیا کہ جب اپنا کان دوسرے کے ہاتھ میں ہو اور پاؤں ہوا میں تو ماں کی گود سب سے اچھی چیز ہے. اس واقعہ سے مجھے فضلو سے سخت نفرت ہو گئی."

دیہات کے اسکول سے نکل کر رشید صاحب جونپور کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل ہو گئے اور وہیں سے انہوں نے انٹرنس (میٹرک) کا امتحان پاس کیا تھا. اُس زمانہ میں جونپور شہر کی معاشرتی، ادبی، سماجی حالت کا نقشہ انہوں نے اپنے مضامین میں بڑے دلکش انداز میں کھینچا ہے. پھر اسی ضمن میں اپنے بعض ساتھیوں اور اساتذہ میں خاص کر شاہ نذیر صاحب غازی پوری

کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے. خود ان کا بیان ہے کہ ابتدا میں شاہ صاحب کی شخصیت اور اسلوبِ تحریر کا مجھ پر خاصا اثر ہوا ہے۔[1]

جونپور کے تاریخی سماجی ادبی اور معاشرتی حالات کا تذکرہ

جون پور تاریخی شہر ہے. وہاں شاہانِ مشرقی کے آثار اب تک موجود ہیں. دریائے گومتی وسطِ شہر سے گذرتا ہے جس پر شاہی زمانے کا بڑا مضبوط پل ہے. برسات میں بالضرور طغیانی آتی ہے. یہ زمانہ شہر میں تردّد اور تفریح دونوں کا ہوتا ہے. شہر سے متصل دریا کے کنارے شاہانِ مشرقی کا ویران قلعہ ہے. کتنا اونچا، مستحکم اور شاندار، پل کے ایک سرے پر پبلک لائبریری کی دو منزلہ عمارت ہے جس کی دیوار کے ایک رخ پر دریا کا اُتار چڑھاؤ ظاہر کرنے کے لئے نمبر لگا دیئے گئے ہیں۔

جن لوگوں نے جونپور کا قلعہ اور مسجدیں نہیں دیکھی ہیں وہ شاید اندازہ نہ کرسکیں کہ یہ کتنی ٹھوس کوہ پیکر اور پُرشکوہ عمارتیں ہیں. دہلی اور آگرے کی مغلیہ عہد کی عمارتوں میں حُسن، نفاست، نزاکت اور پُرکاری زیادہ ہے اور ان باتوں میں ان کا جواب دور دور نہیں لیکن جو سطوت و جلال جون پور کی مسجدوں اور آثار قدیمہ میں نظر آتا ہے وہ بھی اپنی جگہ پر مسلم ہے۔

اب سوچتا ہوں اس زمانے کا جون پور علم و فضل اور شاعری و شرافت کی قدیم روایات کے اعتبار سے کتنا قابلِ قدر خطہ تھا. بیشتر مسلمان گھرانے ایسے تھے جو کسی نہ کسی اعتبار سے اپنی ایک حیثیت رکھتے تھے. رؤسا، علماء اور فضلا کے علاوہ عوام کا طبقہ تھا جس کے افراد پہلوانی کرتے تھے. پنجہ لڑاتے تھے.

[1] آشفتہ بیانی میری صفحہ ۲۰ - ۲۳

پنجہ باندھتے تھے۔ عَلَم اٹھاتے تھے، طبل بجاتے، سوز خوانی اور ماتم کرتے۔ فیرینی کباب بیچتے تھے۔ بٹیر لڑاتے اور کبوتر اُڑاتے تھے۔ بہ ایں ہمہ سوسائٹی میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ کرتے کچھ ہوں، بیٹھتے سب برابر تھے نجابت اور شرافت کا اس زمانے میں کتنا لحاظ رکھا جاتا تھا۔

میری طالب علمی کے زمانے میں سربرآوردہ شریف شیعہ خاندانوں کی تعداد جون پور اور مضافات میں کافی تھی۔ اسکول کے ساتھی زیادہ تر اِن ہی خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اکثر اُن کے گھروں پر جایا کرتا۔ گھر کے بزرگ مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے اور بڑی شفقت سے پیش آتے۔ چھوٹوں سے شفقت اور عزت سے پیش آنے کا جو انداز میں نے اسی زمانے کے بزرگوں میں پایا اب وہ کہیں نظر نہیں آتا۔ کبھی اپنے خاندان یا باہر کے شعرا کا منتخب کلام یا خاندانی بیاض سے مرثیے اور سوز اس خوبی سے سناتے کہ جی خوش ہو جاتا۔ ان کا اندازِ شعر خوانی اور شعر کی خوبیوں کی توضیح اتنی مکمل اور دل نشین ہوتی کہ آج اچھے اچھے فنکاروں اور معلموں میں نہیں نظر آتی۔ شعر و ادب کا جتنا چرچا میں نے ان خاندانوں میں دیکھا کہیں اور نظر نہیں آیا۔

اسکول کے ساتھیوں کی یاد

لکھنے پڑھنے اور کھیل کود کا زمانہ اسکول میں بڑے لطف کا گذرا۔[1]

اچھے ساتھی، ان سے اچھے استاد اور سب سے اچھے اپنے ماں باپ، بہن بھائی پھر دوستوں کے ماں باپ، بھائی بہن سبھی تو مجھے عزیز رکھتے تھے۔ ان سب کی محبت نے دل میں اپنی وقعت کچھ اس طرح سے روشن کر دی تھی اور دوسروں کی

---

[1] آشفتہ بیانی میری صفحہ ۱۹

عزت اور خدمت کرنے کا ایسا حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ تمام عمر کسی حال میں ادنیٰ درجہ کی حرکت کرنے پر طبیعت مائل نہ ہوئی۔ البتہ ریاضی اور ذریات "الجبرا، اقلیدس اور مساحت" ایسے تھے جن سے تمام عمر دوستی تو درکنار کسی شرط پر مفاہمت تک نہ ہو سکی۔ ان سبھوں نے مجھے اور میرے دوستوں کو ایسا رسوا کیا کہ ع "انگلیاں دور سے اٹھتی تھیں کہ وہ آتے ہیں"

ہم تین چار دوست ایک ہی بنچ پر ہر درجہ میں سالہا سال بیٹھتے آئے ریاضیات میں ہم سب کے حاصل کردہ نمبر جوڑ دیئے جاتے۔ جب بھی پاس مارکس تک رسائی نہ ہوتی۔ امتحانات میں ہم سب کے نمبر دوسرے مضامین میں بہت اچھے آتے تھے۔ اچھے کھلاڑی ہونے کا بھی لحاظ کیا جاتا اس لئے ترقی دے دی جاتی۔"

ادبی شعور رشید صاحب کا اسکول ہی کے زمانے سے بیدار ہو چکا تھا۔ اور وہ کتب بینی اور نثر نویسی کی طرف بہت زیادہ مائل ہو چکے تھے۔ اسکول میں اپنے ایک استاد شاہ نذیر غازی پوری مرحوم کی ادبی صلاحیت، قابلیت اخلاق، شفقت اور محبت سے وہ بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ ان کا ذکر بڑی عزت اور عقیدت سے کیا ہے۔

شاہ نذیر غازی پوری مرحوم کا ذکر

اسکول کے زمانے[1] میں تھوڑی بہت نثر لکھ لیتا تھا۔ ایسی نثر جو اس زمانے کے معمولی اخبارات اور رسائل میں جگہ پا جاتی تھی۔ یہاں میں شاہ نذیر غازی پوری مرحوم کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ان کی

---

[1] آشفتہ بیانی میری صفحہ ۳۰

شخصیت وقابلیت اور اسلوب تحریر کا مجھ پر اثر ہوا ہے. تعجب ہے شاہ صاحب کا نام اردو کے ممتاز لکھنے والوں میں کیوں نہیں لیا جاتا. شاہ صاحب بڑے شریف، اونچے اور ذی علم گھرانے سے تعلق رکھتے تھے . . . . خوب رو، خوش گفتار، نیچی نگاہ رکھتے، گفتگو میں جوں جوں گرمی آتی آنکھیں مسحور کن انداز سے کھلنے بند ہونے لگتیں جیسے والہانہ کیفیت طاری ہو. بڑی ستھری اور شائستہ زبان میں ترشے ہوئے فقرے، جذبات کی تھوڑی سی برہمی اور لب ولہجہ کی تھوڑی سی سنجیدگی سے مل کر ادا ہونے لگتے. جیسے کسی پہاڑی جھرنے سے پانی گر رہا ہو. اور کبھی کبھی ہوا کے ہلکے جھونکے سے آواز کے تسلسل وترنم میں فرق آجاتا ہو.

مدتوں بعد جب میں اسکول چھوڑ کر کالج آگیا تھا. نظم ونثر کے حُسن و قبح کو پہچاننے کی شُد بُد ہو گئی تھی. شاہ صاحب کی نثر کو میں اتنی ہی دل آویز پُرمغز اور فکر انگیز پاتا جتنا کسی دوسرے سربر آوردہ نثر نگار کی نثر کو . . . میں نے کبھی رفتار، گفتار، کردار میں ان کو بے جھجک نہ پایا. اکثر سوچ میں رہتے لیکن مخاطب کیجئے تو فی الفور مُتبسم ہو کر متوجہ ہو جاتے اور پھر کوئی نہ کہہ سکتا کہ اس سے پہلے استغراق میں تھے. آج اِن سُطور کو لکھتے وقت وہ بے اختیار یاد آگئے جیسے وہ پاس آکر گفتگو کرنے لگے ہوں. وہی انداز، وہی باتیں اور وہی ماحول."

ہائی اسکول کے تعلیمی دور میں رشید صاحب کو کھیلنے کے علاوہ اردو انگریزی افسانوں اور ناول پڑھنے کا بہت شوق تھا. اس کا ذکر انہوں نے کئی جگہ اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں کیا ہے.

اُردو انگریزی ناول کا مطالعہ دل پسند مشغلہ

طالب علمی کے زمانے میں میرا دل پسند مشغلہ بالخصوص برسات کے موسم میں جب میدان میں کوئی کھیل کھیلا نہ جاسکتا تھا۔ اس کتب خانہ میں جو دوسری منزل پر کھڑکی سے متصل آرام کرسی پر دراز ہو کر اُردو انگریزی افسانوں اور ناولوں کا مطالعہ تھا۔ . . . اس عمر، زمانے اور ماحول و معاشرہ میں اس مقام پر طرح طرح کے افسانے اور ناول پڑھنے میں جو لطف آیا وہ پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا جیسے ان افسانوں اور ناولوں کا میں ہی مصنف تھا۔ میں ہی ماحول اور میں ہی ہیرو۔ لائبریری سے باہر نکلوں گا تو میرے احترام میں پُل کے نیچے بہتا ہوا پانی، پُل کے اوپر چلتی ہوئی مخلوق اور فضا کا نم ناک رست خیز رُک جائے گا۔ ان کتابوں اور مصنفین کے نام گنانے سے کچھ حاصل نہیں اور خطرے سے بھی خالی نہیں۔ اس لئے کہ اندیشہ ہے کہیں ایسی کتابوں کے نام نہ لینے لگوں جو میں نے نہیں دوسروں نے پڑھی ہوں۔

انگریزی ادب سے مرعوبیت

مجھے ہر طرح کی چیز پڑھنے میں لطف آتا تھا۔ البتہ یہاں ایک بات کا ذکر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ اس لئے کہ اس پر آج بھی مجھے اتنا ہی یقین ہے جتنا آج سے چالیس پینتالیس سال پہلے تھا۔ وہ یہ کہ اس زمانے میں بھی جب مجھے اُردو سے کہیں کم انگریزی آتی تھی میں زبان و ادب کے اعتبار سے انگریزی کو اُردو سے اونچا درجہ دیتا تھا۔ انگریزی کتاب پڑھتا تو کچھ ایسا محسوس کرتا جیسے مصنف جو کچھ کہہ رہا ہے سچ کہہ رہا ہے اور میرا بھی خواہ

لہ آشفتہ بیانی میری صفحہ ۴۶

ہے۔ اُردو کتابوں کی عبارت کا اثر یہ ہوتا تھا جیسے مصنف کا مقصد اپنا کرتب دکھانا ہو کوئی مجھے فائدہ پہنچانا نہ ہو۔ یہ باتیں اور اس طرح کی باتیں وضاحت سے نہیں بلکہ گڈمڈ ہوکر ذہن میں آتیں ممکن ہے اس کا سبب یہ بھی رہا ہو کہ ذہنوں پر انگریز، انگریزی حکومت اور انگریزی زبان کی گرفت عام تھی۔ غرض یہ تعبیر صحیح رہی ہو یا غلط۔ مجھے انگریزی کے مطالعے سے فائدہ پہنچا۔ انگریزی سے میرا کچھ ایسا سروکار کبھی نہیں رہا۔ لیکن انگریزی زبان و ادب سے اب بھی بہرہ مند ہوتا ہوں۔ علوم و فنون کے بے پایاں ذخائر سے قطع نظر جو انگریزی میں ملتے ہیں۔ وہ اُردو میں برائے نام سے بھی کم ہیں۔ ابھی اُردو کو انگریزی سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔

ایک عجیب عادت

میری ایک یہ عادت ہے[۱] کہ اردو کا چھپا ہوا کاغذ کیسا ہی کٹا پھٹا، گرا پڑا کیوں نہ ہو میں اُسے اٹھا کر ایک نظر دیکھ لوں گا۔ اس میں نہ دیر لگتی ہے نہ زحمت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ میں اُردو کی ہر چھپی ہوئی تحریر اکثر ترتیب سے فقرہ فقرہ یا جملہ جملہ نہیں پڑھتا بلکہ سطروں اکثر صفحوں میں پڑھتا ہوں جیسے کوئی تحریر نہ پڑھی جا رہی ہو بلکہ تصویر دیکھی جا رہی ہو۔ ان متفرق تحریروں میں مجھے کوئی نہ کوئی انوکھی دلچسپ یا کوئی بے تکی بات ضرور مل جاتی ہے جس طرح کس مپرس، فاقہ کش اور فلاکت زدہ بچے، عورتیں، بوڑھے کوڑے کرکٹ کی ڈھیریاں چھانتے پھرتے ہیں اور اپنے کام کی کوئی نہ کوئی چیز ان میں سے نکال لیتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ضروریات کی بنا پر ایسا کرتے ہیں۔ میں عادتاً یا تفریحاً۔

---

۱ آشفتہ بیانی میری صفحہ ۳۰

اسکول ہی کے زمانے میں علامہ اقبال کے کلام سے مانوس اور متاثر ہو چکے تھے

جنگِ طرابلس کا زمانہ تھا. دسویں پندرھویں اقبال کا ترانہ پڑھتا ہوا شہر سے جلوس گذرتا. ستھرا، شریفانہ اور پُروقار جلوس . . . . . معلوم نہیں ترانہ کون پڑھتا، ساتھ سبھی دیتے. پڑھنے کا انداز اتنا مؤثر اور پُروقار ہوتا کہ رگ وپے میں بجلیاں کوندتی معلوم ہوتیں. ہندو مسلمان، مرد عورت، بوڑھے، بچے، سب غور و احترام سے سنتے. تھوڑی دیر کے لئے کاروبار کا ہمہمہ تھم جاتا. اقبال سے غائبانہ شغف مجھے اس جلوس اور ترانے سے ہوا. گویا یہ بھی یاد آتا ہے کہ جون پور کی پبلک لائبریری کے برآمدے میں ایک شام اقبال کی نظم

ع "خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا." ایک صاحب نے بڑے پُراثر لہجے اور انداز سے سنائی تھی. محفل پر دیر تک سکوت طاری رہا. بعض حضرات آب دیدہ بھی ہو گئے تھے اور "رہے نام اللہ کا" کہتے ہوئے یکے بعد دیگرے اُٹھ کھڑے ہوئے اور محفل خاموشی کے ساتھ برہم ہوئی۔"

ہائی اسکول سے انٹرنس (میٹرک) کا امتحان پاس کرنے کے بعد رشید صاحب پر ایک سال بیکاری اور یاس و نااُمیدی کا بہت سخت گذرا. اس کے بعد انہیں عدالتِ دیوانی میں عارضی کلرکی مل گئی اور پھر وہ سنبھل گئے. یہ کلرکی دیوانی کی گشتی عدالت کی تھی جس میں کچھ روز کام کرنا پڑتا تھا اور بقیہ وقتوں میں تعلیمی مشغلہ جاری رکھا جاسکتا تھا. چنانچہ انہوں نے کلرکی کے ساتھ ساتھ علی گڑھ کالج میں داخلہ بھی لے لیا اور اس طور پر انہوں نے کئی سال گذارے. جب کالج میں چھٹیاں ہوتیں تو کلرکی کر لیتے اور کالج کی چھٹیاں ختم ہوتیں تو پھر کالج چلے آتے. مختلف تجربات، اور

آزمائشوں سے گذرے۔ ہیڈ کلرک اور منصرم کی جھڑکیاں بھی سہیں اور علی گڑھ کالج کے یارانِ باصفا کی صحبتوں کے لطف بھی اٹھائے، ان پر اور ان کی تحریروں پر اس دور کا بہت گہرا اثر مرتب ہوا ہے۔ اس پوری داستان کو انھوں نے اپنے مختلف مضامین میں ایسے شگفتہ اور دل آویز انداز میں پیش کیا ہے کہ ان کی پچھلی تصویر نظر کے سامنے آجاتی ہے۔

ہائی اسکول سے نکلنے کے بعد

اسکول اور کالج کے درمیان کا ایک سال ایسا گذرا جب زندگی کا قافلہ راستے سے بھٹک گیا۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے دنیا میں کوئی خوبی باقی رہی ہے نہ خوبصورتی۔ اپنے اور دوسروں کے بارے میں جتنی اچھی رائے قائم کی تھی وہ نقش بر آب نظر آنے لگی۔ دل میں یہ خیال گذرنے لگا جیسے مجھ جیسا بے مصرف آدمی اور کوئی نہ ہوگا۔ کیسی بددلی اور بے بسی کے دن تھے۔ یادوں کے وہ کریہہ و قبیح پیکر ماضی کے دھندلکوں میں کریہہ و قبیح تر نظر آتے۔ یکایک قلم کا یہ فیتہ کٹ گیا اور وہ منظر سامنے آتا ہے جب علی گڑھ کالج میں داخل ہوا۔ یہ زمانہ اور کتنا زمانہ حاصلِ زندگی رہا۔ اعلیٰ با مقصد زندگی کے کیسے امکانات کا علم ہوا اور ان پر عمل کرنے کی سہولتیں نصیب رہیں۔ یہ سہولتیں مجھے کہیں اور میسر نہیں آسکتی تھیں۔

اعلیٰ اقدار و روایات کا احترام خوردوں کی سعادتمندی، بزرگوں کی شفقت علم و ہنر کا چرچا، ذوق کی تازہ کاری، طرح طرح کی شوخی و شرارت، رزم ہو یا بزم اعلیٰ انفرادی انسانی صلاحیتوں کو کام میں لاکر ممتاز رہنے کا حوصلہ، یہ یادیں محض یادیں نہیں ہیں۔ وہ تو جسم و جاں کا جزو اور سوچنے کا انداز بن چکی ہیں۔

---

[1] ماضی کے دھندلکوں سے یادوں کا کارواں۔ مطبوعہ نگار اپریل ۱۹۶۵ء

یہ وہ جگہ تھی جہاں نہ صرف اچھی صلاحیتوں کو برگ و بار لانے کا موقع ملتا ہے بلکہ یہ صلاحیتیں یہاں پیدا بھی کی جاتی تھیں۔ میرا تو یہاں تک خیال ہے کہ جن بعض اچھی استعدادوں کو پیدا کرنے میں فطرت بُخل کرتی تھی یہ دانش گاہ اُسے بڑی فیاضی سے اپنی طرف سے پورا کر دیتی تھی۔

مڈل[1] اسکول کو الوداع کہنے کے بعد عدالت دیوانی میں عارضی کلرکی ملی۔ اس زمانے میں گورنمنٹ کے دفتر میں کلرک ہونا بڑی بات تھی۔ کلرکی کرتا رہا اور کبھی کبھی ڈبل روٹی بھی کھا لیتا لیکن خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ (اکبرؔ کا مشہور مصرعہ ہے کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا) جب کالج میں چھٹیاں ہوتی تھیں تو کلرکی پر چلا جاتا تھا اور چھٹیاں ختم ہوئیں تو کالج چلا جاتا۔ اس طور پر پانچ سال گذرے مجھے دیوانی کی گشتی عدالتوں میں کلرکی کر کے بہت سے مقامات اور عجیب و غریب انسانی کاروبار کے عجیب و غریب تجربات حاصل ہوئے جو بجائے خود ایک مستقل داستان ہے۔ ایک بار دو مہینے کے اندر اندر ایک طرف میں ہجی نالڈ کریڈک گورنر برما سے گورنمنٹ ہاؤس میں علی گڑھ کے حالات و حوادث بالخصوص علی برادران کی حمایت میں تیز و تند گفتگو کی دوسری طرف بنارس کی عدالت دیوانی میں فرش پر بیٹھ کر شام تک مسلسل مسل کی نقل کی ہے اور ہیڈ کلرک اور مُنصرم کی جھڑکیاں اور چپراسیوں کی بے اعتنائیاں اٹھائی ہیں۔ تیسری طرف علی گڑھ میں اکرٹینس کے معرکتہ الآرا میچ اور معرکتہ الآرا ترلوینین کے الکشن جیتے ہیں کس طرح سالہا سال کُلرکی کی اور علی گڑھ کا طالب علم بھی رہا۔ کلرکی کے چکر میں کہاں کہاں گیا۔ کیا دیکھا، کیا گذری اور اس کا اثر مجھ پر اور میری تحریر پر کیا پڑا بڑی طویل داستان ہے اور دلچسپ بھی۔ لیکن اسے چھیڑے کون۔ اس لئے

---

[1] آشفتہ بیانی میری صفحہ ۴۷

کہ پھر اُس کا سمیٹنا میرے لئے بہت مشکل ہو گا۔ تمام زندگی میں یہی ایک موقع ایسا آیا تھا جب میں نے کلرکی کے نقد کو طالب علمی کے اُدھار پر ترجیح دی اور میرا عشق بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑا۔ گو مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میری عقل بھی کچھ اس طرح کی تھی کہ محوِ تماشائے لبِ بام ہونے میں بھی اس کو کافی خطرہ نظر آتا تھا۔ بہر حال پھر میں نے تمام عمر نہ کبھی عشق کو منہ لگایا نہ آتشِ نمرود کے منہ لگا۔

علی گڑھ کالج میں داخل ہونا

میں بڑے تردد اور ناکسی کے عالم میں ریلی لائن سے دس بجے رات کو علی گڑھ پہنچا تھا۔ کالج کے ہم سفر طلبا نے حال پوچھے بغیر صرف ہیئت و حالت کو دیکھ کر میری دل داری نہ کی ہوتی اور اپنے ساتھ لاکر اپنا ناشتہ کھلا کر اپنے کمرے میں اپنی چارپائی اور بستر پر جگہ دے کر خود کہیں اور جا کر ساتھیوں کے جمگھٹے میں تمام رات ہو حق میں بسر نہ کر دی ہوتی تو میں شہر جا کر معلوم نہیں کہاں قیام کرتا اور میرا کیا انجام ہوتا۔ ایک درماندہ اجنبی طالب علم کے ساتھ علی گڑھ کے ہم سفر طالب علموں کی یہ بے ساختہ دوستی اور دردمندی آج (۶۰ سال بعد) بھی میرے دل کو اسی طرح شاداب اور شادماں کرتی ہے جیسے کل کا واقعہ ہو۔

[ا] ۱۹۱۵ء میں علی گڑھ کالج آیا۔ قدم قدم پر النور ہے اور سلطان محمد خامس اور بات بات پر سلام علیکم۔ کچی بارک کے ایک کمرے میں ٹول صاحب داخلہ کرتے تھے۔ نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے، باہر دروازہ پر ماگھ میلا، آٹھ بجے دن سے کھڑے کھڑے دن کے دو بج گئے۔ شکل سے یوں ہی اُردو مڈل فیل معلوم ہوتا تھا۔ ٹول صاحب کی گول گول آنکھ اور تصف بُریدہ انگلی دیکھ کر کلکٹر صاحب یاد آ گئے۔ فرمایا کہاں سے آ رہے ہو۔ بولا کچی بارک سے۔ ٹول صاحب مسکرائے

ا؎ مضامین رشید صفحہ ۱۰۷

وہ مسکراہٹ جس سے آج تک کسی کو نہ معلوم ہو سکا کہ آفت آنے والی تھی یا رحمت.
ایک ہی فارم داخلہ تھا. اس پر سب کچھ لکھ دیا گیا. وہاں سے بابو رفیع اللہ خاں صاحب کے پاس پہنچا. اُن کو دیکھ کر خیال آیا کہ کوئی محدث دہلوی ہیں یا پنشنر تحصیل دار، آنکھ اور عینک کے درمیان تقریباً چھ انگل کا فاصلہ . . . .
اوپر سے نیچے نیچے سے اوپر، کچھ دیر تک دیکھتے رہے. اس کے بعد پان کی پیک کو منہ میں تولتے ہوئے گرج کر بولے. لہجہ سے معلوم ہوتا تھا عراق عرب میں افواجِ برطانیہ کے ساتھ رہ چکے ہیں. تمہارے باپ کا کیا نام ہے. کہاں کے رہنے والے ہو. امرتیاں لائے ہو. اب مجھے یقین ہو گیا کہ ضرور گورنمنٹ کے ملازم رہ چکے ہو. غرض گلو خلاصی ہوئی. کچی بارک آیا. نورٌ علی نور ے

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے　　زمیں جس کی چہارم آسماں ہے

لے پڑھنے کو کالج میں داخلہ ملا اور رہنے کو کچی بارک (مِرل منزل) میں جگہ ملی. اُس زمانہ میں جون میں داخلہ ہو جاتا. موسم کے اعتبار سے جون جولائی کا مہینہ علی گڑھ میں جس آزمائش کا ہوتا تھا اس سے کچھ اسی عہد کے طلباء واقف ہیں. بالخصوص کچی بارک کے طلباء.

جس کسی نے کچی بارک (سید محمود کورٹ) دیکھا نہ ہو وہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ کچی بارک کیا چیز تھی. کوئی عمارت تھی، عبادت تھی، علامت یا حادثہ یا یہ سب تھی. ایسی زار و زبوں عمارت اس وقت کالج کے رقبہ میں کہیں اور نظر نہیں آتی تھی. معلوم نہیں کب کی بنی ہوئی کھپریل کی چھت مٹی کی دیوار و در نہایت درجہ نیچا. بوسیدہ برآمدہ جس کی کڑیاں جگہ جگہ سے گل بھی گئی تھیں

لے آشفتہ بیانی میری صفحہ ۶۸ - ۶۹

اور کھسک بھی رہی تھیں جن میں لکڑی کے آڑے ترچھے طرح طرح کے پیوند لگائے گئے تھے۔ جون کی گرمی اور آندھی میں ایسا معلوم ہوتا جیسے پوری بارک مٹیالی گرم زمین دھول اور دھند میں جھول رہی ہو ــــ کانپتی، کوستی، کراہتی، کھانستی۔

شام کو موسم کی سختی کم ہو جاتی تو لڑکے غسل کر کے صاف سفید کپڑے پہن کر باہر نکلتے اور ایک دوسرے کو (چاہے وہ کتنے ہی فاصلے پر کیوں نہ ہوتا) پکار کر کوئی تفریحی جملہ کہتے یا فقرہ کستے۔ جیسے مبارک باد دے رہے ہوں کہ موسم کو زیر کر لیا ہے۔ رات گئے دیر تک طرح طرح کی چہل پہل اور دھوم دھام رہتی۔ ایک طرف اس زمانے کے علی گڑھ کا وہ طنطنہ، دوسری طرف یہ کچی بارک ہر حیثیت اور ہر درجہ کے گھرانوں کے لڑکے ان میں آباد تھے لیکن باوجود طرح طرح کی تکلیف اٹھانے کے ایک متنفس نے بھی کبھی اس کی شکایت نہ کی کہ کچی بارک میں رہنا صحت، عافیت، حیثیت، شان یا شرافت کے خلاف تھا۔ یہی نہیں بلکہ کتنے اس کی آرزو کرتے کہ کچی بارک میں جگہ مل جائے۔

اس زمانے کی کچی بارک کی صبح و شام اور زمین و آسمان کا خیال کرتا ہوں تو تصور میں ریگستان کا وہ منظر آجاتا ہے جہاں "خضر راہ" میں اقبال نے کہا ہے کہ

ع ریگ کے تودے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام

پھر کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ملت مصطفوی کا اس جہاں میں یہی نقشہ اور یہی نوید ہے۔ "وہی بدویوں کا سا حال جو ریگستان کی ہر طرح کی سختی جھیلیں گے لیکن منزل پر اتریں گے تو ہر چھوٹی بڑی نعمت کا حق اور ہر چھوٹے بڑے کا حق ادا کیے بغیر نہ رہیں گے۔"

رشید صاحب اُردو ادب کے مایہ ناز ادیب اور اسکالر تھے۔ انہوں نے علمی مبحث پر کئی کتابیں لکھیں لیکن ان کی اصل شہرت اور انفرادیت طنزیہ ادب سے وابستہ ہے۔ طنز و مزاح نگاری کے وہ امام تھے اور اس میں ان کو وہ مقام حاصل ہوا جو بجز ایک دو کے کسی کو نہ ہوا۔ ان کے تمام فقرے اور جملے طنز و مزاح کے شہ پارے نظر آتے ہیں۔ یہ رُجحان ان کا علی گڑھ کالج میں داخلے کے بعد پیدا ہوا۔ وہ اپنی ساری صلاحیتوں، کامیابیوں، شادمانیوں اور مخصوص طرزِ نگارش کے لئے علی گڑھ کالج کے ماحول اور زندگی کے مرہونِ منت نظر آتے ہیں۔ اپنی آشفتہ بیانی میں کئی جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔

> **رشید صاحب اپنے مخصوص طنزیہ اسلوبِ تحریر کے لئے علیگڑھ کالج کے منت کش ہیں**

"[1] لکھنے کے میرے جو اسالیب ہیں (طنز و ظرافت وغیرہ) ان میں علی گڑھ کس طرح اور کس حد تک دخیل ہے۔ یہ سوال جتنا دل چسپ ہے اتنا ہی اہم اور مشکل بھی ہے۔ علی گڑھ ہو یا کوئی اور خطہ محض اپنے نام اور جغرافیہ کی بنا پر قابلِ اعتنا حد تک کسی کو متاثر نہیں کرتا بلکہ ہر ادارے کے قیام کے اسباب اُس کی روایات، اس کی سرگرمیاں، اس کی فتح و شکست، اس کے چھوٹے بڑے اشخاص سبھی بہ حیثیت مجموعی اثر انداز ہوتے ہیں۔

طنز و ظرافت کی میری ابتدائی مشق کچی بارک اور ڈائننگ ہال سے شروع ہوئی۔ یہی کچی بارک اور ڈائننگ ہال علی گڑھ سے باہر کہیں نصیب ہوئے

---

[1] آشفتہ بیانی میری صفحہ ۴۴۔

ہوتے تو کچھ تعجب نہیں۔ طبیعت یا تو طنز و ظرافت کی طرف مائل ہی نہ ہوتی یا پھر ان کا وہ انداز میسر نہ آتا جو یہاں آیا۔ اس لئے کہ ان کے محرکات ہی سے جن کا بہت کچھ دارو مدار ماحول اور مطالعے پر ہوتا ہے۔ ان کا درجہ متعین ہوتا ہے۔ علی گڑھ اور متعلقہ ادارے جن میں ڈائننگ ہال بھی ہے ایک زندہ قوم کی امیدوں اور عزیمتوں کے آئینہ دار ہیں۔ ان اداروں میں اگر کوئی خلل راہ پائے گا تو وہ نوجوانوں میں بیزاری یا بد اطواری پیدا کرنے کے بجائے اپنے آپ کو ان کی طنز و ظرافت کا نشانہ بنانے اور اصلاح کرانے میں معین ہوگا جو قوم اپنی خامیوں کو جس حد تک طنز و ظرافت کا نشانہ بنانے اور اس طور پر ان کی اصلاح کرنے کا حوصلہ اور ظرافت رکھتی ہے اسی حد تک اس کی بڑائی کا درجہ متعین ہوتا ہے۔

علی گڑھ کالج میں رشید صاحب کی ادبی سرگرمیاں

لے میں نے کچی بارک پر "گل منزل" کے عنوان سے کئی نمبروں میں اس زمانے کے کالج میگزین (علی گڑھ منتھلی) میں مضامین لکھے تھے۔ طنز و ظرافت کے انداز میں لکھنے کی یہ میری سب سے پہلی کوشش تھی (کالج کے اس مشہور علمی رسالے کا نام منتھلی کے بجائے "میگزین" میری درخواست پر قرار پایا) اردو ہی نہیں انگریزی حصے کی ادارت بھی طالب علمی کے زمانے میں میرے سپرد کی گئی تھی ورنہ اس سے پہلے دونوں سیکشنوں کے علیحدہ علیحدہ ایڈیٹر ممبران اسٹاف سے مقرر کئے جاتے تھے۔ میرے بعد طلبہ کی جماعت سے انگریزی اور اردو

لے آشفتہ بیانی میری صفحہ ۱۴۹

کے علیحدہ علیحدہ ایڈیٹر اور اسٹاف سے نگران مقرر ہونے لگے ۔ یہ قاعدہ آج تک جاری ہے ۔ میں نے اُردو کے انداز کے انگریزی مضامین بھی لکھے تھے۔ لکھنے کا حوصلہ، لکھنے کی مشق اور برُا بھلا لکھنے کی شہرت یہ سب مجھے علی گڑھ میگزین کے طفیل نصیب ہوئی ۔ اتنا اور اس طرح کا نفع میگزین نے میرے علاوہ شاید ہی کسی اور کو پہنچایا ہو ۔ اس طرح کے چند مضامین کچھ عرصہ بعد سیاحتِ برما کے عنوان سے لکھے جو میگزین میں شائع ہو کر مقبول ہوئے ۔ یہ اُسی سفر کے تجربات یا تاثرات تھے جو ڈیوٹی ڈپوٹیشن کے سلسلے میں کلکتہ، چاٹگام کے دورے میں پیش آئے ۔ جو اصحاب اس عہد کے علی گڑھ سے واقف نہیں ہیں وہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ادب ، زندگی ، تنقید اور آرٹ کے کیسے کیسے فرعون اور موسیٰ اس وقت یہاں موجود تھے ۔ ان کا فرسٹ ایئر کے ایک شکستہ حال طالب علم کی ہمت افزائی کرنا کتنا عجیب واقعہ تھا ۔ اس کا مجھے اب تک تعجب ہے ۔ اب سوچتا ہوں تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس بات نے مجھ سے یہ مضمون لکھوایا جس نے مجھے زندگی اور ادب کے اس ڈھرّے پر ڈال دیا وہی میری تقدیر تھی جو کچی بارک کی صورت و معنیٰ میں مجھ پر منکشف ہوئی جو میری تحریر اور طور طریقوں میں جب جہاں اور جس طرح چاہتی ہے جلوہ گر ہو جاتی ہے ، نہ وہ مجھ سے جدا ہوتی ہے نہ میں اُسے جدا کر سکتا ہوں ۔ دراصل میں تمام عمر کچی بارک میں رہا اور اب بھی ہوں ۔"

علی گڑھ کالج رشید صاحب کے لئے صرف مادر تعلیم گاہ ہی نہ تھا بلکہ سب کچھ تھا ۔ محبوب تھا ، رہبر تھا معلم اخلاق و کردار تھا ، تحریر و تقریر کا جولان گاہ تھا اور کیا کچھ نہ تھا ۔ اُس سے اُن کو جنون کی حد تک عشق و پیار تھا ، وہ

سوتے جاگتے، چلتے پھرتے کسی وقت بھی علی گڑھ کو اپنے سے جدا نہیں کر سکتے تھے اس کا ذرہ ذرہ ان کے لئے مہرِ درخشاں تھا۔ ان کا جینا مرنا سب علی گڑھ ہی کے لئے تھا۔ وہ اس کی عظمت و عزت پر ہر وقت مرمٹنے کو تیار رہتے تھے۔ کوئی تحریر ان کی مشکل سے ایسی ملے گی جس میں علی گڑھ کی عظمت اور وہاں کی سرگرمیوں کا والہانہ انداز میں ذکر نہ کیا گیا ہو۔ ان کے نقادوں نے ان پر علی گڑھ پرستی کا الزام دھرا، ان کی تحریروں میں علی گڑھ کے بار بار ذکر کو نقص بتایا لیکن سب کے لئے ان کا صرف ایک جواب تھا ؎

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

علی گڑھ سے والہانہ محبّت وعقیدت

[1] آئندہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ علی گڑھ کے بارے میں میرے ذاتی خیالات اور تاثرات ہیں اور زیادہ تر مجھ ہی سے متعلق ہیں اُن میں کہیں درازنفسی ملے گی، کہیں ژولیدہ بیانی کہیں خود کلامی یا حُدی خوانی، ایک آدھ جگہ خام خیالی بھی۔ جابجا "رندانِ درمیکدہ" کی گستاخی نظر آئے گی۔ فقیہہ شہر یا ملائے مکتب کے فیصلے یا فضیحت سے بھی سابقہ ہو تو عجب نہیں لیکن ان سب پر بھاری وہ منطق ہے جو اس شعر میں ملے گی۔

؎ حدیث دلکش و افسانہ از افسانہ می خیزد وگر از سر گرفتم قصۂ زلف پریشاں را

قصۂ زلفِ پریشان" میں یہ سب داکٹران سے زیادہ بھی) انگیز کرنا پڑتا ہے۔ اس سے اپنی ہی کوتاہیوں کی جواب دہی مقصود نہیں ہے۔ ان سطور کے پڑھنے والوں کے بھی کسی نہ کسی قصۂ زلفِ پریشان کی جواب دہی مدِنظر ہے۔ اگر ان خیالات وتاثرات سے کسی کو اتفاق ہو تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ اختلاف ہو

[1] آشفتہ بیانی میری صفحہ ۱۱ — ۱۳

تو تعجب نہ ہوگا۔ علی گڑھ سے متعلق بعض دوستوں اور عزیزوں کے خیالات یقیناً ویسے نہ ہوں گے جیسے کہ میرے ہیں۔ وہ علی گڑھ کو اسی رنگ میں اور اسی طرح پر دیکھنا چاہتے ہوں گے جو ان کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ لاریب یہ بھی علیگڑھ کی خیر اندیشی میں ہوگی۔

"علی گڑھ نے[1] کسی کام کا نہ رکھا۔ اس نے مجھے اپنا بنالیا۔ یہ بڑا ہی سخت گیر اور شکی محبوب ہے۔ نہیں چاہتا کہ اس کے ادنیٰ مطالبات سے بھی گریز کیا جائے۔ یا اس کے سوا کسی اور سے التفات کی جائے۔ اس نے میری نظر میں مجھے محترم کردیا۔ اس قید سے مخلصی کہاں۔ بہت سی باتوں میں اب نہ علی گڑھ سے بہتر و برتر مجھے مقام نظر آتا ہے اور نہ علی گڑھ والوں سے بہتر و برتر لوگ مجھے جو شے یا شخص اچھا نظر آتا ہے جی چاہنے لگتا ہے کہ وہ علی گڑھ کا ہوجائے۔ کسی اجنبی سے ملاقات ہوتی ہے اور اس کے طور طریقوں سے خوش ہوتا ہوں تو اکثر پوچھ لیتا ہوں کہ وہ کبھی علی گڑھ کا طالب علم بھی رہا ہے یا نہیں۔ ہوتا ہے تو فخر سے گردن اونچی اور مسرت سے دل لبریز ہوجاتا ہے اور اس کے خوش اوقات خوش مذاق ہونے پر تعجب نہیں ہوتا۔ نہیں رہا ہے تو افسوس ہوتا ہے کہ ایسا اچھا آدمی علی گڑھ کے فیضان سے بھی کیوں محروم رہا۔

اس سے یہ جتانا مقصود نہیں کہ علیگڑھ کا ہر پڑھا لکھا ہر خوبی سے متصف ہوتا ہے اور جو علیگڑھ کا ہوتا ہے وہ ان خوبیوں سے عاری ہوتا ہے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ علیگڑھ کا ایک خاص رنگ، رکھ رکھاؤ یا ٹھیا ہوتا ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز یا متاثر کرتا ہے، اس ٹھے کی بھی اقسام ہیں بعض پسندیدہ بعض ناپسندیدہ۔ علی گڑھ کوئی جنت یا جہنم نہیں ہے۔ جہاں صرف منتخب لوگوں کے قیام و طعام کا بندوبست رہتا ہو۔ وہ تو اسی دنیا جیسی چیز ہے

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ صفحہ ۷۶

جہاں اپنی جنت یا جہنم بنانے کی ہر شخص کو آزادی ہوتی ہے۔ محض علی گڑھ کا ہونا کسی شخص کے معقول ہونے کی دلیل نہیں جس طرح محض مسلمان ہونا ہمارے آپ کے معقول و معتبر ہونے کا ثبوت نہیں۔

[1] بہت دنوں کی بات ہے گو بڑھاپے کی وجہ سے کل کی بات معلوم ہوتی ہے جب طالب علمی سے معلمی کی حدود میں داخل ہوا تھا۔ میں نے اپنی ایک کتاب "طنزیات و مضحکات" کا انتساب علی گڑھ کے نام ان الفاظ میں کیا تھا۔

"اپنے کالج کے نام جس کے فیضان نے کسی دوسرے کا محتاج نہ رکھا۔"

حال ہی میں ایک اہم موقع پر جہاں فضلائے عظام کا اجتماع تھا جس میں علی گڑھ اور باہر کے حضرات بھی شامل تھے یہ سوال کیا گیا کہ میں نے لکھنے کا انداز کہاں اور کیوں کر پایا؟ معلوم نہیں کیوں اور کیسے بے اختیار زبان پر یہ فقرہ آیا۔ "علی گڑھ نے دیا۔" تفصیل کسی نے نہ پوچھی۔ مطمئن سب ہو گئے۔

ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ یہاں اس امر کو واضح کرنے کی کوشش کیوں نہ کروں کہ علی گڑھ نے مجھے کیا دیا اور کیسے دیا؟ مگر یہ وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید مجھ پر یہ الزام رکھا جائے کہ میں اپنا پروپیگنڈا کرتا ہوں لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ میرا پروپیگنڈا دوسرے کیا کم کرتے ہیں کہ میں خود کرنے لگوں۔ پھر عمر کی جس منزل میں ہوں وہاں پروپیگنڈا نہیں کرتے۔ توبہ و استغفار اور عقد ثانی و ثالث لازم و ملزوم تو نہیں ہیں؟۔

ایک بات کا اور خیال آتا ہے وہ یہ علی گڑھ نیز اپنے بارے میں اکثر لکھتا رہا ہوں۔ کبھی اپنی عادت سے بے اختیار ہو کر کبھی دوستوں اور عزیزوں کے تقاضے سے برافروختہ ہو کر۔ نادانستہ طور پر بھی وہی باتیں یہاں دہرائی

---

[1] آشفتہ بیانی میری صفہ ۱۶

گئیں تو ممکن ہے ناظرین پر گراں گذریں. لیکن اتنی فرصت نہیں اور جی بھی نہیں چاہتا کہ پچھلی تحریروں میں اس طرح کے حالات اور واقعات اس خیال سے تلاش کرتا پھروں کہ ان کو یہاں دہرانے سے بچوں. ضمناً یہاں اپنی ایک کمزوری کا بھی اعتراف کر لینا چاہتا ہوں. وہ یہ کہ اب تک جتنے مضامین لکھ چکا ہوں وہ سب میری نظر سے گذر چکے ہیں اگر کوئی ان کا ذکرِ خیر کرتا ہے لیکن مجھ سے طاقتور ہوتا ہے تو درگذر سے کام لیتا ہوں، کمزور ہوتا ہے تو اس کو مار ڈالنے کا جی چاہتا ہے. اسی بنا پر میں اپنے مطبوعہ مضامین دوبارہ پڑھنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا. اپنے چھپے ہوئے مضامین بہ طیبِ خاطر شاید ہی میں نے دوبارہ پڑھے ہوں، آپ تو جانتے ہیں ایسے لوگ ناپید نہیں ہیں جو اپنے کسمپرس رشتہ داروں یا ہم وطنوں سے رشتے یا روپے کے اعتبار سے اونچے ہو جاتے ہیں تو ان سے تمام عمر منہ چھپاتے پھرتے ہیں.

[1] میری تحریروں میں یہ نقص بتایا جاتا ہے کہ ان میں علی گڑھ بہت ہوتا ہے اس لئے وہ لوگ جو علی گڑھ سے کم یا بالکل واقف نہیں ہوتے ان کو ان مضامین یا اس طرح کی باتوں سے دلچسپی نہیں ہوتی. میری اس حرکت سے بعض احباب مجھ سے چڑھنے بھی لگے ہیں. ان سب سے مجھے بھی ایک شکایت ہے وہ یہ کہ وہ خود علی گڑھ سے کیوں نہیں واقف ہیں. اُردو جاننا اور علی گڑھ سے واقف نہ ہونا بجائے خود کسی فتور کی علامت ہے. اُردو کا نام علی گڑھ بھی ہے.

میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ میری پسند، ناپسند، رہن سہن، گفتار و کردار اور فکر و نظر جسے بہ حیثیت مجموعی "شخصیت" کہہ سکتے ہیں، سب کی سب علی گڑھ

---

[1] آشفتہ بیانی میری صفحہ ۱۳-۱۴.

میں ڈھلیں۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی سیرت کی تعمیر یا تشکیل کے لئے بہت کچھ خام مواد گھر اور اسکول سے لایا تھا لیکن اس کو تب و تاب، رنگ و آہنگ، لمس و لذت اور صورت و معنی علی گڑھ نے دیا۔ اگر میں علی گڑھ نہ آتا اور میری صلاحیتوں کا سابقہ اس کسر و انکسار سے نہ ہوتا جو علی گڑھ کہلاتا ہے تو مجھے اندیشہ ہے وہ صلاحیتیں (کل نہیں تو اکثر) مفید ہونے کے بجائے میرے اور دوسروں کے لئے مضر ثابت ہوتیں۔ اب تک میں نے یہ کبھی محسوس نہ کیا، نہ کسی نے بتایا کہ مجھ پر علی گڑھ کا جو اثر ہوا وہ فی الجملہ میرے یا دوسروں کے لئے نامبارک ثابت ہوا۔ البتہ علی گڑھ نے جتنا فائدہ مجھے پہنچایا اس سے یقیناً بہت کم میں اُسے پہنچا سکا۔

مجھے اپنی کمزوریوں کا اعتراف ہے اور اس کے جواز میں کسی طرح یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ ایسا کون ہے جس میں کمزوریاں نہیں ہوتیں۔ لیکن یہ علی گڑھ کی دی ہوئی نہیں ہیں۔ میں ان کو ساتھ لایا تھا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ شاید علی گڑھ کی پیدا کی ہوئی مجھ میں کوئی کمزوری نہیں ہے۔ اگر ہے تو اس کو بیان کرنا نہیں چاہتا اس لئے کہ جب تک آدمی رتبے میں بہت بڑا نہ ہو جائے کمزوریوں کے اقرار کرنے میں نہ اس کا فائدہ ہے نہ دوسروں کا۔ پولس کی دست اندازی یا ملاؤں کی دست اندازی سے ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے۔

رشید صاحب علی گڑھ اور علی گڑھ والوں کی تعریف کرنے سے کبھی نہیں تھکتے۔ اُن کا کوئی مضمون مشکل ہی سے اس سے خالی ملے گا۔ ان کے جس مضمون کو پڑھئے علی گڑھ کے لئے ان کے قلم سے محبت کا دریا امنڈتا نظر آئے گا لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ علی گڑھ کا ماحول، اس کی سرگرمیاں، رہن سہن

اور بورڈنگ لائف طلباء کی کردار سازی میں بہت زیادہ معاون ہوتی ہیں اور ان کو ایک مخصوص ڈھانچے میں ڈھال دیتی ہیں۔

علی گڑھ کی وہ خصوصیات جو طلباء کے کردار پر اثر انداز ہوتی ہیں، اور اُن کو ایک سانچے میں ڈھال دیتی ہیں

"[1] علی گڑھ کی خصوصیت یہاں کی اقامتی زندگی ہے۔ یونیورسٹی کے حدود سے باہر طلبا کے لئے تفریح کی کوئی جگہ نہیں۔ کوئی دریا نہیں۔ پہاڑ نہیں۔ باغات نہیں، پر رونق بازار نہیں، تاریخی آثار نہیں۔ سال میں ایک بار نمائش البتہ ہوتی ہے جب طالب علم کباب پراٹھے کھانے اور کبھی کبھار پولیس والوں کے "سراپا ناز" ہونے یا نہ ہونے پر جشن منا لیتے ہیں۔

علی گڑھ میں ہر طرح کے نوجوان طلبا ہر گوشۂ ملک سے آتے ہیں۔ دن رات کا ساتھ رہتا ہے۔ ہر شخص کو خواہ وہ کسی مذاق یا میلان کا ہو اپنا رفیق و ہمدم مل جاتا ہے۔ علی گڑھ کی اس خصوصیت کا یہ اثر ہے کہ یہاں کا ہر طالب علم رفتار و گفتار و کردار میں بے نقاب ہو کر رہتا ہے خواہ وہ اس کے خلاف ہی کیوں نہ کوشش کرے، یہی سبب ہے کہ یہاں کے ہر طالب علم کا ایک ربطِ نہانی علی گڑھ سے مدت العمر قائم رہتا ہے اور وہ علی گڑھ کی یاد کو اپنی زندگی کی سب سے اچھی یاد سمجھتا ہے۔

"[2] علی گڑھ کے طلبا اور اساتذہ کو علی گڑھ اس لئے عزیز ہے کہ اس میں ہر ذوق کی تسکین و تفریح کا سامان مہیا ملتا ہے جو شخص جس قماش کا ہو گا اس کو اسی قسم کی مکمل سوسائٹی میسر آجائے گی۔ علی گڑھ کی ہر دل عزیزی کا یہی راز ہے

---

[1] ذاکر صاحب صـ ۴۴-۴۵ ۔ [2] گنج ہائے گراں مایہ صـ ۹۳ ۔

ورنہ مقامی اعتبار سے علی گڑھ میں کوئی جاذبیت نہیں ہے۔ دوسرے بڑے شہروں کے برخلاف یہاں نہ اعلیٰ درجہ کی دکانیں ہیں، نہ مناظرِ فطرت، نہ تفریح گاہیں یہاں کا کوئی شخص محض تفریح کی خاطر کبھی شہر نہیں جاتا اور نہ کسی کے لئے یونیورسٹی کی حدود سے باہر دل بستگی کا کوئی سامان ہے۔ ہر شخص کو اپنے ہی مخصوص حلقہ میں دلچسپی کا سارا سامان میسر آجاتا ہے۔

پڑھنا لکھنا، کھانا پینا، شوخی شرارت، کھیل کود، رندی و پارسائی۔ غرض یونیورسٹی کی مکمل زندگی میں جن اسباب یا مواقع کی ضرورت ہو سکتی ہے وہ سب یہاں ملتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ علی گڑھ والے جب کبھی اور جہاں کہیں ایک دوسرے سے ملتے ہیں فوراً بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ ان کو تصنع یا تکلف کی نہ ضرورت ہوتی ہے اور نہ وہ اس قسم کے طرزِ عمل پر قادر ہو سکتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ فریقین ایک دوسرے کی اچھائی اور برائی سے واقف اور علی گڑھ کی روایات سے آشنا ہیں۔ یہی سبب ہے کہ علی گڑھ والے کبھی اجنبی کی حیثیت سے نہیں مل سکتے۔

[1] میں خود جب علی گڑھ سے باہر گیا اور کسی علی گڑھ والے سے ملاقات ہوئی تو کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے گویا ہم دونوں ایک دوسرے کی پشت ہا پشت سے واقف ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک دوسرے کی کمزوری یا اس کے خاندانی حالات سے واقف ہوتے ہیں بلکہ علی گڑھ بجائے خود ایک "قومیت" یا ایک "خاندان" معلوم ہونے لگتا ہے۔ اگر ایک وائسرائے ہے اور دوسرا ایک کلرک، لیکن دونوں "پروردۂ علی گڑھ" ہیں تو اس طور پر ملیں گے یا ملنے

---

[1] مضامینِ رشید صفحہ ۵۲

کو جی چاہے گا گویا دونوں ایک سطح پر ہیں، وہی سطح جو علی گڑھ نے قائم کی ہے۔

علی گڑھ[۱] یونیورسٹی کی حیثیت محض ایک درسگاہ کی نہیں ہے اس کی نوعیت ایک وسیع خاندان کی بھی ہے۔ ایسا خاندان جو ہر طبقے اور مزاج کے "خورد و کلاں" پر مشتمل ہو۔ علی گڑھ کی روایات کی دھوپ چھاؤں میں مختلف دیار، مختلف طبائع اور طبقات کے جتنے طلباء ایک دوسرے کے کمروں میں، بورڈنگ ہاؤسوں میں، ڈائننگ ہال میں، کھیل کے میدانوں میں، یونین میں، بازار میں، مسجد میں، باغ میں، جماعت اساتذہ کے اراکین سے، اولڈ بوائز سے متواتر اور مسلسل ملتے جلتے رہتے ہیں۔ اتنے شاید ہی کہیں اور نظر آئیں۔ اس طور پر ظاہر ہے یہاں کے طلباء میں فراخی، فرزانگی اور فراز بینی کے اوصاف پیدا ہوں گے جو اعلیٰ ظرافت و طنز نگاری کے لئے ضروری ہیں علی گڑھ نے اچھے طنز نگار بھی پیدا کئے لیکن وہ جلن کے اتنے پیدا وار نہ تھے جتنے جلال کے۔ ان میں اتنی بد دلی یا بیزاری نہ تھی جتنی برہمی، وہ اتنے بد مزاج اور بد باطن نہ تھے جتنے بے باک اور بے پناہ طنز کے لئے یہ شرائط ضروری ہیں۔

میں[۲] سمجھتا ہوں کہ ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہیں خواہ وہ کتنے ہی پڑھے لکھے یا ملک و ملت میں مقتدر کیوں نہ ہوں جو دستر خوان کے آداب سے واقف ہوں اور ان کو برت سکتے ہوں۔ کھانے والوں کے ساتھ تبختر، بے جا تکلف، یا بے تکلفی برتنا بڑی کم سمجھی کی بات ہے جس کو لوگ بے تکلفی سمجھتے ہیں وہ بڑا نازک مرحلہ ہے۔ اس نزاکت کو سمجھنا اور نبھانا بڑا مشکل کام ہے۔ بے تکلفی کا تعلق فن سے نہیں تہذیب سے ہے۔ کھیل میں کھانے

---

[۱] آشفتہ بیانی میری صفحہ ۱۵۲-۱۵۳۔ [۲] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۵۴

پر اور سفر میں ہر شخص کا عیب و ہنر کھل جاتا ہے خواہ وہ اس کے چھپانے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے۔

[1] علی گڑھ کے طلباء کا یہ امتیاز رہا ہے کہ وہ اہم شخصیتوں سے ملنے، کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے، ہنسنے بولنے اور ہر طرح کے موقعوں پر مقررہ آداب سے عہدہ برآ ہونے کی خاص صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ استعداد کچھ تو اس زمانے کے عام مسلمان گھرانوں کی روایات کی دین تھی لیکن اس کی بہت کچھ تربیت ان یورپین پروفیسروں سے ملتی تھی جو دوسرے موقعوں کے علاوہ کھانے کی میز پر کھیل کے میدان میں ساتھ ہوتے اور ضروری آداب سے ہم کو آشنا کراتے رہتے۔ اس طرح ہم میں خود اعتمادی پیدا ہوتی اور جھجکنا، ہچکچانا ہمیشہ کے لئے دور ہو جاتا۔

[2] آج کل اہم اور اعلیٰ تقاریب میں جہاں دوسرے ممالک کے سربرآوردہ اصحاب خورد و نوش پر مدعو ہوتے ہیں۔ ہمارے بعض اکابر کھانے پینے، ہنسنے بولنے اور شائستگی کے آداب ملحوظ رکھنے میں ایسی غفلت برتتے ہیں یا ان سے اس درجہ ناواقف ہوتے ہیں کہ دوسرے در پردہ ان سے متنفر ہوتے ہیں یا ان پر ہنستے ہیں۔ اس کا زیادہ تر سبب یہ ہے کہ ان اکابر نے یا تو تمیزدار لوگوں کے ساتھ دسترخوان پر کھانا کھانے کے آداب نہیں سیکھے۔ یا کھیل کی مناسب تربیت نہیں پائی ہے۔

جن لوگوں میں ساتھ کھانے پینے کا دستور نہیں ان میں کبھی اتحادِ خیال، و اتحادِ عمل نہیں پیدا ہو سکتا۔ مل جل کر بیٹھنے کھانے پینے اور بات چیت کرنے

---

[1] آشفتہ بیانی میری صفحہ ۱۵۰ - ۱۵۱ [2] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۵۷

کے فوائد کا اندازہ بہت کم لوگ کر سکتے ہیں. علی گڑھ کی جن خصوصیات اور خوبیوں کو متفقہ طور پر سراہا گیا ہے ان کو بروئے کار لانے میں علی گڑھ کی اس روایت کو بڑا دخل ہے کہ یہاں ساتھ کھانا کھانے اور دستر خوان کے پورے آداب برتنے کا خاص طور پر التزام رکھا جاتا ہے.

عام طور سے دیکھا ہے کہ جس سوسائٹی میں لوگ الگ تھلگ رہتے ہیں یا رکھے جاتے ہیں وہاں کے افراد اپنے آپ پر اعتماد کرتے ہیں نہ دوسروں کا اعتبار کرتے ہیں. اس کے علاوہ تنگ نظر اور خود پسند بھی ہوتے ہیں. وہ انفرادی یا اجتماعی طور پر اعلیٰ کام کرنے کی نہ صلاحیت رکھتے ہیں نہ ایسا کرنے کا حوصلہ کر سکتے ہیں.[1]

میں نے آج تک یہ نہ دیکھا کہ یہاں کے جن لوگوں کی طالب علمی کی زندگی جیسی رہی ہے اس سے مختلف ان کی پبلک لائف ہو. علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ہر حال میں ہر جگہ ملیں گے، ان کا کردار بجنسہٖ وہی ہوگا جو یہاں تھا. خواہ وہ بڑے سے بڑے منصب پر فائز ہوں. خواہ ادنیٰ سے ادنیٰ درجے پر. یہ بات علی گڑھ کے سوا کہیں اور مشکل سے ملے گی.

"مجھے[2] ان لوگوں پر ترس آتا ہے جو علی گڑھ میں طالب علمانہ زندگی بسر نہیں کر سکے ہیں. علی گڑھ کے واقف کار اور "ہمدرد" بن کر اس پر اعتراض کرتے ہیں ان سے کوئی پوچھے آپ علی گڑھ کی مسرتوں سے کیا واقف. آپ کو کیا معلوم اس نام میں کیسی جاذبیت ہے اور یہ نام کیسا محبوب ہے. بعض کہیں گے. دیکھتے نہیں آج خود علی گڑھ والے علی گڑھ کو برا بھلا کہتے ہیں. میں کہتا ہوں یہ آپ کی کم فہمی اور سطحیت ہے جو ایسا کہتے ہیں. کوئی علی گڑھ والا علی گڑھ کو برا نہیں

---

[1] ذاکر صاحب صفحہ ۴۴ . [2] مضامین رشید صفحہ ۵۱

کہتا کیونکہ وہ ایسا کر نہیں سکتا۔ وہ علی گڑھ والوں کو بُرا کہتا ہو گا۔ مادرِ کالج سے کون منحرف ہو سکتا ہے۔ کسی علی گڑھ والے کے سامنے علی گڑھ کا نام لیجئے۔ پھر دیکھئے وہ چشم زدن میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے مصائب اور مناصب سب بھول جائے گا اور تھوڑی دیر کے لئے اس کا تصور اس کو زمان و مکان سے آزاد کرا کے اسے مادرِ کالج کی آغوش میں پہنچا دے گا۔ وہی کمرے، وہی ڈائننگ ہال، وہی مسجد، وہی یونین، وہی کچی بارک، وہی کرکٹ فیلڈ، وہی شرارتیں، وہی صحبتیں، وہی بے فکری، سب کچھ وہی جس سے اب وہ دور ہے۔"

رشید صاحب بڑی سادہ اور طالب علمانہ زندگی گذارنے کے عادی تھے۔ تصنع اور بے جا تکلفاتِ دنیوی سے ان کو نفرت تھی لیکن ساتھ ہی حد درجہ خلیق اور مہمان نواز بھی تھے۔ ان کی میزبانی اور مہمانی دونوں میں انفرادیت پائی جاتی تھی۔ مہمانوں کو ان کی مرضی پر چھوڑ دیتے اور ان کے کھانے پینے اور معمولات کا ان کی طبیعت کے مطابق انتظام کرتے تھے۔ اپنی خواہش اور رائے کو ذرا دخل نہ دیتے۔ اصرار کر کے کھلانا اور اس کے معمولات پر اپنی مرضی کو ترجیح دینا انہیں ذرا پسند نہ تھا۔ ساتھ ہی وہ خود کہیں آنے جانے اور مہمان بننے سے بہت کتراتے تھے اور اس کی وجہ غالباً وہی میزبان کا بے جا تکلف، تصنع اور اپنی مرضی کے مطابق چلانا ہی ہو سکتا ہے۔ بہر حال مہمان اور میزبان سے متعلق ان کا ایک خاص نظریہ تھا اور اس پر وہ کاربند بھی رہے۔ ایک دو جگہ اپنے مضامین میں انہوں

نے اس کا ذکر بڑے دلچسپ پیرایہ میں کیا ہے۔

مہمان اور میزبان کے بارے میں ان کا خاص نظریہ

بورڈنگ لائف کا ٹھپہ میری بقیہ زندگی پر نمایاں رہا۔ یعنی سپاہی اور قلندر کی زندگی آسودہ حال ہونے کے باوجود جیب میں علی گڑھ کی اصطلاح میں کافی عیاشی کر سکتا تھا۔ دیو جانس کلبی کی طرح ایک ہی مختصر کمرے میں پورا مکان اور اپنی ضروریات کا تمام سامان سموئے رکھا۔ سونے کا کمرہ، پڑھنے کا کمرہ، مہمان کا کمرہ، ملاقات کا کمرہ کھانے کا کمرہ، لباس کا کمرہ، غسل خانہ، بساط خانہ غرض بر گفتنی و ناگفتنی شدنی و ناشدنی اُمور کا جائے وقوع جغرافیائی اعتبار سے ایک ہی تھا۔[1]

چنانچہ میں مہمان کی حیثیت سے کہیں جاتا اور میزبان میری پذیرائی اور طعام و قیام میں اہتمام کرتا یا تکلف برتتا تو مجھے بڑی وحشت اور ذہنی تکلیف ہوتی تھی۔ ایک سبب یہ بھی ہے کہ میں کسی کا مہمان شاید ہی ہوتا ہوں۔

[2] مہمان بننے سے میں یوں بھی گھبراتا ہوں۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے میں کھاتا پیتا، ہنستا بولتا مہمان نہیں ہوں بلکہ اس دنیا میں چند دنوں کا مہمان رہ گیا ہوں اور لوگ خاطر مدارت کر کے اتنا خوش نہیں ہو رہے ہیں جتنا کسی مریض یا مسافر کی خدمت کر کے ثواب کمانے کی فکر میں ہوں۔ میرے دل میں یہ بات بیٹھ سی گئی ہے کہ کوئی بھلا مانس مہمان ضرورت سے زیادہ خاطر مدارت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

میں کسی آدمی کی سیرت اور شخصیت کا اس سے بھی اندازہ لگاتا ہوں کہ وہ میزبان یا مہمان کی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے اور

---

[1] سہیل کی سرگذشت　[2] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۱۲ ـ ۵۷

کسی حد تک دستر خوان کے آداب ملحوظ رکھتا ہے۔ میں اپنے مہمانوں سے خواہ ان میں محترم خواتین ہی کیوں نہ ہوں حتی الوسع اصرار نہیں کرتا کہ وہ فلاں چیز ضرور کھائیں یا کتنی کھائیں۔ کھانا سامنے ہے اور ان ہی کے لئے ہے۔ بڑے شوق اور اخلاص سے پیش کیا جا رہا ہے اب اگر وہ اس درجہ شرمیلے شاندار اور سادہ لوح واقع ہوئے ہیں کہ بغیر قول، قسم، منت سماجت کے کچھ نہیں کھانا چاہتے تو ذمہ داری ان کی ہے میری نہیں۔ میں مہمان کا خیر مقدم کرتا ہوں اس لئے کہ میں اس کی طرح طرح سے خدمت اور خاطر کروں گا اور اپنے طور پر اپنے لئے خوش ہوں گا نہ اس لئے کہ مہمان کو کھانا کھلانے سے ثواب ملتا ہے اور عاقبت سنورتی ہے۔"

رشید صاحب کی خانگی زندگی بہت مثالی تھی۔ وہ ہمدرد استاد کے ساتھ ساتھ ایک شفیق باپ، رحم دل آقا، اور محبت کرنے والے شوہر بھی تھے۔ ان کو اپنے بچوں سے بے حد محبت تھی۔ چھ برس تک ایک عقیدت مند شاگرد کی حیثیت سے مجھے ان کے بہت قریب رہنے کا اتفاق ہوا اور میں نے انہیں تقریباً ہر زاویۂ نگاہ سے دیکھا۔ میں نے انہیں اخلاق اور کردار میں غیر معمولی انسان پایا۔ ان کی زندگی بہت سادہ تھی۔ شیروانی اور علی گڑھ کٹ پائجامہ اور سر پر گرمی کے زمانے میں شولا ہیٹ، بس اس کے علاوہ میں نے ان کو اور کسی لباس میں نہیں دیکھا۔ پان وہ کثرت سے کھاتے۔ حقہ یا سگریٹ کی عادت ان کو بالکل نہ تھی۔ وہ اپنے شاگردوں سے بڑی محبت اور شفقت سے ہمدردانہ انداز میں ملتے تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا ان کی دشواریوں کو حل کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کی خانگی زندگی کا عکس ان کی تحریروں میں بہت نمایاں

ہے اور ان کے مخصوص اسلوب تحریر نے اس کو حد درجہ دل آویز اور دلچسپ بنا دیا ہے۔

رشید صاحب اپنی بیوی بچوں کے درمیان

کسی آدمی کے بڑے ہونے کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس کو غریبوں اور بچوں سے کتنی محبت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اولاد کی تقدیر بنانے میں والدین کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ بہرحال اپنے بچوں اور ساتھیوں کے ساتھ ہنس بول لینے میں زندگی کی تفریح پا لینا اور خوش ہونے کے لئے کسی بڑی تقریب کا منتظر نہ رہنا، چھوٹی خوشیوں میں بڑی خوشیاں ڈھونڈ لینا یہ بہت بڑی صفت اور نعمت ہے اور کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے۔ بچے خدا کا مصرعۂ طرح ہوتے ہیں جن پر خدا طرح طرح سے طبع آزمائی کرتا ہے۔[1]

کچھ دن ہوئے میری ملاقات شیخ نیازی[2] سے ہوئی۔ ایسی حالت میں کہ ان کے آنکھیں تھیں لیکن کسی کو پہچان نہیں سکتے تھے۔ کان تھے لیکن کسی کی سنتے نہ تھے، زبان تھی لیکن بول نہ سکتے تھے۔ ناک تھی لیکن خوشبو بدبو میں فرق نہ کر پاتے۔ ہاتھ پاؤں تھے لیکن چل پھر نہ سکتے تھے[3]۔ ان باتوں کے ہوتے ہوئے بھی ان سے دوستی ایسی ہوئی کہ ان کے بغیر مجھے چین نہیں، گو اب تک یہ

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۸۴ - ۱۰۲ - ۵ ۱۰ [2] شیخ نیازی صفحہ ۲ - ۳ - ۴۔

[3] رشید صاحب کے یہ تیسرے صاحبزادے ہیں۔ ان کے علاوہ سب سے بڑے اقبال رشید، دوسرے احسان رشید (وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی)، تیسرے نیاز رشید، چوتھے احمد رشید، پانچویں اکبر رشید اور دو لڑکیاں محترمہ سلمیٰ اور عذرا سلمہم اللہ تعالیٰ بفضلہ بقید حیات اور خوش و خرم ہیں۔ ایک لڑکی اسماء کا عرصہ ہوا کراچی ہی میں انتقال ہوا ہے۔ پیدائش کے وقت کا نقشہ اور کیفیت ہے۔

نہ معلوم ہو سکا نہ یہ بات کبھی دھیان میں آئی کہ خود شیخ صاحب کا میرے بارے میں کیا خیال تھا۔

شیخ کے دو بڑے بھائی اقبال اور احسان ہیں اور دو بڑی بہنیں سلمیٰ اور عذرا۔ گھر بھر میں شیخ کو صرف عذرا پر اعتبار ہے۔ یہ شیخ کی تمام کمزوریوں اور کارناموں سے واقف ہیں۔ بہت دنوں بعد ان کی یہ عادت چھوٹی ورنہ ہر جھوٹی سچی بات کے آخر میں ضرور کہتے "ہاں عذرا" اور عذرا شاید ہی ان سے کبھی اختلاف کرتیں۔ عذرا ان کی عمر کی تھیں تو ایک دن مجھے عینک اتارتے ہوئے دیکھ کر بولیں ابا میاں، آپ عینک اتار دیتے ہیں تو دوسرے کے ابا میاں معلوم ہونے لگتے ہیں۔ عذرا کی بڑی بہن سلمیٰ ہیں ان کا کام دونوں کو چڑھانا اور ان پر ہنسنا ہے۔

دونوں بہنیں اسکول کی ابتدائی جماعتوں میں ایک کلاس آگے پیچھے تھیں۔ سلمیٰ ایک سال اپنے درجہ میں رہ گئیں۔ اس کا انہوں نے بڑا غم منایا۔ ہم سب نے ان کو سمجھایا اور تسلی دی تو کچھ سنبھل گئیں۔ شام کو عذرا کو خیال آیا کہ چھوٹی بہن کی حیثیت سے انہوں نے سلمیٰ کا غم غلط کرنے میں حصہ نہیں لیا اور یہ بہت بڑی چوک ہوئی۔ چنانچہ بڑی یگانگت سے سلمیٰ کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔ کچھ دیر تک اپنے ہاتھ کے ناخن اور سلمیٰ کے تیور باری باری دیکھتی رہیں اور جب دونوں طرف سے اطمینان ہو گیا تو بولیں۔ آپا آپ روتی کیوں ہیں۔ یہ تو بڑا اچھا ہوا اب ہم آپ ایک ہی کلاس میں بیٹھا کریں گے۔ اپنی کتاب مجھے دے دیجئے۔ میں اپنی آپ کو دے دوں گی میری کتاب پڑھ کر میری طرح آپ بھی پاس ہو جائیں گی۔ ہمدردی کی یہ باتیں سن کر سلمیٰ نے ایک چانٹا رسید کیا اور پھر رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ عذرا بے چاری بھوچکا ہو کر ایک طرف جا کر کھڑی ہوئیں کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔

شیخ کو کھانے پینے کا بڑا شوق ہے اگر روک تھام نہ کی جائے تو یہ کھانے پر کبھی ترس نہ کھائیں. اس لئے ان کو بے تنگ اور بے تکان کھانے پینے سے باز رکھا جاتا ہے. کوئی اور ہو تو اس سلوک سے اس درجہ ناراض ہو کہ تمام عمر میرا منہ نہ دیکھے. لیکن شیخ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی پروا نہیں کرتے. ان کا خیال ہے کہ دنیا میں ہر چیز کھانے پینے کے لئے بنائی گئی ہے. وہ مار کھانا ہی کیوں نہ ہو.

شیخ کی شکل و صورت بھی دیکھنے کے لائق ہے. تربوز جیسا سر ہونٹ موٹے موٹے جیسے تنوری روٹی کے حاشئے. ناک چھوٹی گاجر کی مانند. دہانہ ایسا کہ مسکرائیں بھی تو باچھیں کانوں کی لو تک پہنچ جائیں اور رونے کے لئے اسے کھول دیں تو خاصا بڑا ٹماٹر منہ میں آجائے. آواز ایسی پاٹ دار کہ ایک نعرہ میں پاس پڑوس کے سارے شیخ ہی نہیں. چرند و پرند تک چونک پڑیں اور ادھر ادھر دیکھنے لگیں. لمبے کم چوڑے زیادہ نہ سردی کی خوشی نہ گرمی کا غم، آنکھیں نڈر اور بہت بڑی. ایک بار ایک صاحب نے بہت قریب سے ٹارچ کی روشنی ڈالی. شیخ صاحب آنکھ تو کیا جھپکاتے ٹارچ کی طرف اس طرح دیکھتے رہے گویا وہ بھی کھانے کی کوئی چیز تھی لیکن ذرا دور تھی.

شیخ کو اچھا پہننے اوڑھنے کا بالکل شوق نہیں. اکثر دوسرے بھائیوں کا کپڑا الٹا سیدھا پہنا دیا جاتا ہے تو اس میں مگن رہتے ہیں. لوگ چڑاتے یا طعنہ دیتے ہیں کہ فلاں بھائی یا بہن کی اترن ہے تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا. کہتے اترن کیا. یہ تو صدری ہے. خود اماں بی نے پہنائی ہے. لیکن آدمی کی طبیعت کچھ اس طرح کی بنی ہے کہ شک و شبہ کی کوئی بات کان میں ڈال دی جائے تو وہ کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی رنگ لا کر رہتی ہے. چنانچہ اترن والی بات ان

کے ذہن سے اتری نہ تھی بلکہ کسی کونے میں چھپ کر بیٹھ گئی تھی البتہ وہ جس رنگ میں ظاہر ہوئی وہ طعنہ دینے والوں کے لئے مایوسی کا باعث ہوئی۔ ایک ان کے بڑے بھائی ستھرے اور خوش نما لباس میں نظر آئے۔ دوسرے دن انہوں نے کہا اب تم پہن چکے اتار دو میں پہنوں گا۔ بھائی نے ان کا مذاق اڑایا۔ شیخ نے ذرا بھی برا نہ مانا بلکہ تھوڑا مسکرائے۔ کچھ پینترا بدلا اور چھلانگ مار کر عذرا پر جا گرے یہ کہتے ہوئے کہ اچھا میلا ہونے دو تب تو اتاروگے۔

شیخ کو صاف ستھرا رہنے کا بالکل شوق نہیں جہاں کہیں مٹی کوڑا کیچڑ، پانی دیکھا بیٹھ گئے اور اس گیان دھیان اور لطف و اطمینان سے گویا صاف ستھری چاندنی، قالین یا گدے پر براجمان ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ جتنے زیادہ میلے کپڑوں یا ناصاف جگہوں پر نظر آئیں اتنے ہی مجھے خوبصورت اور بھاری بھر کم معلوم ہوتے ہیں۔ دوسروں کا بھی یہی خیال ہے کہ اس حلیے میں شیخ کا رعب زیادہ پڑتا ہے۔

ایک دن میں نے جھنجلا کر کہا شیخ تم نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ نہانے دھونے کے بعد ذرا دیر تو صاف ستھرے رہا کرو۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے اپنی ناک پر ہاتھ پھیرا اور اس کی طرف سے اطمینان کرنے کے بعد کچھ اس انداز سے بولے جیسے انہوں نے میرا کہا سنا معاف کر دیا ہو۔ میں کب نہایا تھا۔ عذرا نے نہلا دیا تھا۔ صاف رہنے کے لئے جو باربار تاکید کی جاتی ہے اور کہنا نہ ماننے پر ان سے سختی سے پیش آیا جاتا ہے۔ اس سے یہ بہت گھبراتے ہیں۔ کھل کر کچھ نہیں کہتے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے صفائی کی طرف سے ان کے دل میں میل آگیا ہو۔ ایک دفعہ انہوں نے کافی دیر تک صاف ستھرا رہنے کی مصیبت جھیلی۔ ماں نے یہ دیکھ کر ان کی بڑی تعریف کی اور گود

میں لے کر پیار کیا۔ یہ تکلفات ختم ہوئے تو بڑی جبرت سے بولے "اماں بی، اب یہ کپڑے میلے کب ہوں گے۔

شیخ کی بڑی کمزوری ان کا کھانے پینے کا شوق ہے۔ ان کے کھانے پینے کی نگرانی کی جانے لگی۔ تو شیخ کی زندگی تلخی ترشی سے بسر ہونے لگی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دست آنے کو کھانے پینے سے کیا سروکار ہوتا ہے۔ عذرا سے پوچھا کیوں آپا، یہ دست کیوں آتے ہیں۔ انہوں نے بتایا زیادہ کھا جانے سے۔ پھر بولے اور زیادہ کس کو کہتے ہیں۔ عذرا نے اکتا کر کہا زیادہ کہتے ہیں کبابوں پر کباب ٹھونسے جانے کو۔ یہ سن کر شیخ کے چہرے پر رونق آگئی اور مسکرا کر بولے جیسے عقل کے معاملے میں عذرا منہ دکھانے کے قابل نہ رہ گئی ہوں۔ آپا کباب نہیں۔ میں نے تو گولیریں کھائی تھیں۔

شیخ کو دست آتے رہے۔ ایک دن ماں سے پوچھنے لگے دست آنے سے کیا ہوتا ہے۔ ان کو بتایا گیا کہ اس سے آدمی دُبلا اور کمزور ہو جاتا ہے۔ کھیل کود نہیں سکتا۔ اس کو گھومنے پھرنے، کھانے پینے نہیں دیا جاتا۔ پوچھا یہ کب بند ہو گا۔ کہا گیا کہ دوا پیتے رہو گے اور کھانا پینا بند کر دو گے تو بند ہو جائے گا۔

اتفاق سے اس زمانے میں میرے ہاں ایک شاعر آئے۔ دبلے پتلے، بوٹے قد کے، طور طریقہ نہایت نپا تلا، بات بات پر ہاتھ جوڑتے اور تعظیم دیتے جیسا کہ شاعروں کا قاعدہ ہے۔ مصرعہ اٹھانے، مکرر ارشاد کرنے اور دسترخوان پر ہاتھ بٹانے کے لئے کچھ شاگردوں اور ہاں میں ہاں ملانے والوں کو بھی ساتھ لائے۔ بڑی دیر تک میں ان کی اور وہ میری تعریف کرتے رہے۔ انہوں نے میری تعریف تو جلد ختم کر دی لیکن میں باز نہ آیا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ میں

نے ان کی تعریف بند کی تو ان کے شعر کی تعریف کرنی پڑے گی۔ اس دوران میں اللہ کی رحمت کا منتظر رہا کہ ان کا مصرعہ اٹھانے سے قبل وہ مجھ ہی کو اٹھالے۔

اتنے میں اندر سے چائے آئی اور میری جان میں جان آئی۔ چائے کے ساتھ کچھ پھل اور مٹھائی اور آگے پیچھے شیخ صاحب بھی تھے۔ مہمانِ عزیز کو جو چیز پیش کی جاتی ہاتھ جوڑ کر بڑی مسکنت کے ساتھ رد کر دیتے۔ میں گھبرا رہا تھا کہ یہ وار خالی گیا تو میں مارا گیا۔ چنانچہ جان پر کھیل کر اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ حضور التفات نہ فرمائیں گے تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ شیخ کے کان کھڑے ہوئے اور سیدھے میری گود میں آکر بیٹھ گئے اور ہاتھ سے میرا منہ اپنی طرف کرتے ہوئے بڑے پیار کے لہجے میں بولے، ابا میاں ان کو کچھ نہ دیجئے ان کو دست آتے ہیں ان کی اماں بی نے کھانے کو منع کر دیا ہے۔

شاعر، ان کے ساتھیوں اور اس خاکسار پر کیا گذری۔ اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ محفل درہم برہم ہو گئی اور شیخ مجھے اور چائے کے خوان کو میدانِ جنگ سے صاف نکال لائے۔[1]

شیخ صاحب شاعر اور گپی بھی واقع ہوئے ہیں۔ عام طور پہ ہمارے شاعر بھوکے اور گپی پیٹ بھرے ہوتے ہیں لیکن شیخ صاحب شعر اسی وقت کہتے ہیں جب پیٹ بھرا ہو ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ شیخ صاحب جس عمر اور جس حلیے کے ہیں اس کے ہوتے ہوئے یہ شاعر کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ سمجھ کا پھیر ہے۔ بچے بڑے اچھے شعر کہتے ہیں جو بات دل کو بھائے اور بہلائے وہی تو شعر ہے کسی بھولے بھالے تندرست بچے کو دیکھئے اس کی ہر بات شعر میں ڈوبی، ڈھلی ہوئی ملے گی۔ اپنے زمانے کے سب سے بڑے آدمی سے کسی نے پوچھا آپ کو سب سے زیادہ خوبصورت

---

[1] شیخ نیازی صفحہ ۱۵

کیا چیز نظر آئی تو انہوں نے جواب دیا تندرست بچہ تندرست ماں کی گود میں۔ رہا حلیے کا معاملہ تو بات یہ ہے کہ شاعر ہر حلیہ کا ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ حلیہ بدلتا بھی رہتا ہے۔ شعر کہتے وقت اس کا حلیہ کچھ ہوتا ہے۔ سناتے ہوئے کچھ اور شعر کے دام مانگتے ہوئے بس اللہ دے بندہ لے!

شیخ کے کارنامے ان کی زبان سے سنیئے تو معلوم ہوگا کہ ایسی باتیں نہ کبھی ہوئیں اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے مثلاً ایک بھیڑیا آیا اور شیخ صاحب اسے کھا گئے۔ چیونٹی نے ان کو ڈنڈا مارا اور انہوں نے ڈنڈا چھین کر پھینکا تو الموڑہ جا گرا۔ حالانکہ شیخ نے کبھی کوئی بھیڑیا دیکھا نہ تھا۔ صرف اس کا تذکرہ سنا تھا۔ ان کو بتایا گیا تھا کہ بھیڑیا چھوٹے بچوں کو جو کہنا نہیں مانتے اٹھالے جاتا ہے اور کبھی کبھی کھا جاتا ہے۔ خیال یہ تھا کہ یہ بات ان کے کان میں پڑے گی تو یہ وقت بے وقت گھر سے باہر نکل جانے یا دوسروں کے حصہ کی چیزیں کھا جانے سے باز رہا کریں گے۔ اس کا توڑ انہوں نے اس طرح کیا کہ خود بھیڑیئے کو کھانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ کے ماں باپ جس تردد میں مُبتلا تھے وہ تو رہا اپنی جگہ پر بھیڑیئے کے ماں باپ بھی تردد میں پڑ گئے۔

اب رہا یہ کہ انہوں نے چیونٹیوں پر کیا الزام لگایا اور ڈنڈے کے ساتھ کیا سلوک کیا یہ کچھ اس طرح کی باتیں ہیں جن کے بارے میں کوئی قطعی بات میں نہیں کہہ سکتا۔ کھوج لگانے سے اتنا پتہ ضرور چلا کہ ایک دفعہ گھر میں شیخ ایسی جلیبیاں کھاتے پکڑے گئے جن پر کثرت سے چیونٹیاں چھائی ہوئی تھیں۔ نوکر نے شور مچایا تو گھر کے سارے چھوٹے بڑے جمع ہو گئے۔ اور قریب تھا کہ ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا جو انہوں نے چیونٹیوں کے ساتھ کیا تھا کہ عذراً نے ایک قانونی پیچ ڈال دیا۔ انہوں نے کہا معاملہ عدالت

ماتحت کا نہیں بلکہ عدالت عالیہ کا تھا اس لئے ابا میاں کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ میں آیا تو یہ حاضر کئے گئے۔ جواب طلب کرنے پر انہوں نے ایک دوسرا جھگڑا کھڑا کر دیا بولے چیونٹیاں بھی تو جلیبی کھا رہی تھیں۔ اس جواب سے میری حالت کچھ ایسی ہوئی کہ اگر میں اس کو ظاہر ہو جانے دیتا تو شیخ تو صاف بری ہو جاتے۔ عدالت کا فضیحتا ہو جاتا۔ اتنے میں سلمیٰ نے کہا کہ تمہارا قصور یہ نہیں ہے کہ تم نے جلیبی کھائی بلکہ تم نے چیونٹیاں کھائیں۔ بے چاری چیونٹیوں نے تمہارا کیا قصور کیا تھا۔ . . . میں نے دیکھا اب عدالت نہیں رہ گئی تھی بلکہ مشاعرہ برپا ہو گیا تھا اور اس طرح کے شوشے نکلتے رہے تو معاملہ عدالت اور ہجوم دونوں کے قابو سے باہر ہو جائے گا۔ میں نے حکم دیا آئندہ سے ایسا انتظام رکھا جائے کہ شیخ نیازی، جلیبی اور چیونٹیاں اکٹھا نہ ہو پائیں۔

شیخ صاحب شاعر کے علاوہ گویئے بھی ہیں۔ شاعر کا گویا، یا گویئے کا شاعر ہونا تو کوئی اچنبھے کی بات ہے نہ بری بات . . . یہ صرف بات کا پھیر ہے ورنہ در اصل دونوں قریب قریب ایک ہیں۔ البتہ شیخ کا یہ حال ہے کہ وہ اوٹ پٹانگ میں ایک مصرعہ کہتے ہیں اور اپنے ہی بنائے طرح طرح کے سروں میں الاپ کر اس کے موزوں ہونے کا ہی نہیں بلکہ بھرپور شعر ہونے کا یقین کر لیتے ہیں۔ اس طرح کی دھاندلی شیخ برابر کرتے رہتے ہیں۔

پرانی چال کا معلم ہونے کی حیثیت سے میں نے شیخ کے اس فن میں فی نکالی تو جواب میں انہوں نے پھر اسی طرح کا ایک شعر کہہ دیا۔ میں چپ ہو گیا۔ اس لئے نہیں کہ شیخ کی بات میرے ذہن میں اتر گئی تھی بلکہ شیخ کی اس حرکت پر چھوٹے بڑے کچھ اس طرح پر ہنس پڑے کہ میرے دل میں شک گذرا کہ

اس ہنسی کا رُخ کچھ کچھ میری طرف بھی تھا۔ اس لئے ایک خاص طرح کا گھونٹ پی کر چپ ہو گیا۔

شیخ[1] تلفظ کا جھگڑا کبھی نہیں مول لیتے۔ جس لفظ کو جس طرح چاہتے ہیں بولنے لگتے ہیں۔ ان کی یہ حرکت مجھے اکثر کھٹکتی اور میں نے اس کی کوشش کی کہ یہ لفظوں کی آبرو کا خیال رکھیں۔ لیکن سوچنے پر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ قدرت شیخ کے ذریعہ اپنی بات منوانا چاہتی ہے یعنی وہی کرو اور ویسے ہی کرو جس میں آسانی ہو یا آرام ملے۔ اگر زبان سے کوئی لفظ مشکل سے ادا ہوتا ہے تو ہم سب کا دل یہی چاہتا ہے کہ اسے کوٹ پیٹ کر یا کاٹ چھانٹ کر ایسا بنالے کہ وہ زباں سے آسانی سے اور جلد سے جلد ادا ہو جائے۔ اس لئے زبان کے جان کاروں کا کہنا ہے کہ وہی زبان اچھی ہے جو آسانی سے بولی اور سمجھی جائے شیخ نے اس بھید اور بھاؤ کو خود سمجھا ہو یا نہیں۔ ہم کو سمجھایا بڑے مزے سے ہے

ایک دن سولن[2] میں بارش ہو رہی تھی۔ بادل اور کہر سے چاروں طرف دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ ہوا میں نرمی اور تازگی تھی۔ دور پہاڑی پر رنگ برنگ کے گھر ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے ہرے بھرے درختوں اور جھاڑیوں کے جھنڈ میں تلے اوپر کبوتر کے کابک رکھ دیئے ہوں۔ پہاڑی ریل اس طور پر گھڑگھڑاتی، گونجتی، گنگناتی، گذرتی تھی جیسے بڑے بڑے گو۔ بلے یا بھونرے ایک کے پیچھے ایک چلے جا رہے ہوں۔ پاس کی پہاڑی سے مویشیوں کا گلہ سر جھکائے دھیرے دھیرے نیچی اونچی پگڈنڈی پر چلا جا رہا تھا جن کے گلے کی چھوٹی بڑی گھنٹیاں بجتی جاتی تھیں جیسے پہاڑ کی دیوی پر سے آرہی

---

[1] شیخ نیازی صفحہ ۲۲-۲۷

[2] ہندوستان کا ایک پہاڑی اسٹیشن جہاں رشید صاحب ہر سال موسم گرما گذارتے تھے۔

اتاری جارہی ہو۔ چرواہا کوئی پہاڑی گیت گا رہا تھا جس کی گونج پہاڑی کے معلوم نہیں کن کن دور اور نزدیک کے گوشوں سے ٹکراتی پھیلتی، سننے والوں کے دل کی معلوم نہیں کن گہرائیوں میں ڈوبتی ابھرتی اس کو آس اور نراس کی وادیوں میں پہنچا دیتی۔

مکان سے ملا ہوا نیچے کی جانب مکّے کا کھیت تھا۔ جس کی جتائی بوائی گھر والوں کی طرف سے ہوئی تھی اور اس کا بٹوارہ اس طور پر کر دیا گیا تھا کہ ہر چھوٹا بڑا بچہ اپنے اپنے ٹکڑے کا زمیندار اور کاشت کار دونوں تھا۔ کھیت کے بیچ میں ناشپاتی کا ایک چھوٹا سا درخت تھا جس پر بیٹھ کر شیخ کھیت کی رکھوالی کیا کرتے تھے۔ شیخ کے سپرد جو کام کیا گیا تھا اس میں بھید یہ تھا کہ اس طرح ان کی اور کھیت دونوں کی رکھوالی ہوتی اور ناشپاتی کی رونق بڑھتی رہے گی۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ ناشپاتی کی رونق جس تیزی سے بڑھتی گئی اس سے کہیں زیادہ تیزی سے اس کے پھلوں کی تعداد گھٹتی گئی۔

شیخ صاحب ایک دن کودتے پھاندتے چلے جارہے تھے۔ ایک جگہ بڑا اجغادری مینڈک بیٹھا ہوا تھا۔ چلائے، عذرا دوڑو۔ عذرا پہنچیں۔ ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی آگئے۔ دیکھا تو شیخ مینڈک کے گرد "شیو" کا رقص کر رہے ہیں۔ عذرا بولیں ارے یہ تو مینڈک ہے۔ فرمایا اور کیا دیکھو کیسا بیٹھا ہوا ہے جیسے ثمر بہشت دائم) اس فقرے کی سب نے اس طرح تعریف کی جیسے کسی اچھے شعر پر دل کھول کر مشاعرہ میں داد دیتے ہیں۔ اسی دوران میں سلمیٰ نے پکارا اماں بی اماں بی!! ذرا چلی آئیے۔ وہ دوڑتی بھاگتی پہنچیں تو سلمیٰ نے مینڈک کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ وہ دیکھئے منّا (شیخ کا گھریلو نام) بیٹھے ہیں۔ شیخ کے معاملے میں سلمیٰ اور ان کی اماں میں اکثر نوک جھونک رہتی

تھی لیکن آج کے اس فقرے نے ماں کو اس طرح زچ کر دیا کہ وہ اپنے ان گنت اور من مانے اختیارات کے ہوتے ہوئے کچھ نہ کر پائیں۔

ایک دن بیٹھے بٹھائے انہیں کیا خیال آیا۔ اٹھے اور اسکول چلے گئے۔ کسی کا کوٹ، کسی کی ٹوپی، ایک جوتا اپنا ایک دوسرے کا، کمر بند ڈالنے کی سلائی بطور قلم کے، کتاب یا کاپی کے بجائے کوئی پھٹا پرانا رسالہ۔ کچھ دنوں اسی طرح آتے جاتے رہے۔ ایک دن واپس آئے تو کہنے لگے۔ میڈم نے بارہ روپے ماہوار مانگے ہیں، داخلہ ہوگا۔ میں نے کہا ایسے اسکول میں داخلہ سے کیا فائدہ جہاں میڈم کو یہ بھی نہیں معلوم کہ شیخ صاحب کے داخلہ کی فیس لی نہیں بلکہ دی جاتی ہے۔ فرمایا اور کیا؟ میں نے کہا پڑھ لکھ کر کیا کرو گے۔ قوم کو تم سے اور تم کو قوم سے اور کام لینے ہیں۔ بولے قوم کسے کہتے ہیں۔ میں نے کہا اس کا قصہ پھر کبھی سناؤں گا۔ اس وقت اتنا سمجھ لو کہ ایک طرح کی رسی کو کہتے ہیں جس کے سہارے جادوگر طرح طرح کے کرتب دکھاتے ہیں۔ شیخ نے کھڑے کھڑے ایک چھلانگ لگائی اور غائب ہوگئے۔[۱]

عمر کے ساتھ شیخ کی عقل اور لمبائی چوڑائی بھی بڑھ گئی ہے۔ آواز اور زیادہ پاٹ دار ہوگئی ہے۔ ابھی یہ اتنا لکھ پڑھ نہیں پائے ہیں کہ ان کے بارے میں جو کچھ لکھا جاتا ہے اسے خود پڑھ سکیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں نے ان کی جو باتیں اِدھر اُدھر لکھیں ان کو ان کے بھائی بہن کچھ اس طرح نمک مرچ لگا کر ان کو سناتے ہیں کہ یہ جامے سے باہر ہو جاتے ہیں اور اس کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے کہ جامے سے باہر ہو کر شیخ کیا رنگ لاتے ہوں گے۔ اول تو میں نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی تھی جس سے یہ ناراض ہوتے

---

[۱] شیخ نیازی صفحہ ۳۴ - ۳۶

دوسرے یہ مجھ سے اقرار کر چکے ہیں کہ ان کے بارے میں جو لکھا گیا ہے وہ سب صحیح تھا۔

شیخ صاحب کو گھر والے کبھی کبھی یوں بھی چھیڑ دیا کرتے ہیں۔ اس حال میں یہ کسی کو پکڑ پائیں تو پھر اسے اسی طرح جھنجھوڑ ڈالتے ہیں کہ بہت دن تک زندگی کی لذت سے اس کا دل کھٹا رہتا ہے۔ اس طرح کے حادثہ کا حال سن کر ایک دن میں نے جھنجھلا کر کہہ دیا اور میں یقین دلاتا ہوں اس سے ان کی توہین نہیں بلکہ اپنی جھنجھلاہٹ دور کرنی تھی کہ پکڑ لاؤ اس گوریلے کو ذرا اس کی مرمت کر دوں بات ختم ہو گئی تھی لیکن بعض باتوں کا خاصہ یہ ہے کہ آپ چاہیں یا نہ چاہیں وہ ختم نہیں ہوتی اور بعض لوگوں کا بھی خاصہ ہوتا ہے کہ وہ بات ختم نہیں ہونے دیتے۔ چنانچہ گوریلے کے لفظوں پر لوگوں نے چپکے چپکے ہنسنا شروع کر دیا۔ شیخ کے بھی کان کھڑے ہوئے۔ ظاہر ہے جب کان کھڑے ہوں تو بے تکی سے بے تکی بات بھی کان میں داخل ہو جاتی ہے۔

شیخ صاحب میرے پاس آئے اور نہایت غصیلی اور گونجیلی آواز میں بولے دیکھئے سب لوگ مجھے گوریلا کہتے ہیں۔ شیخ کا تیور دیکھ کر میں خود سٹپٹا گیا۔ میں نے کہا آؤ بیٹھ جاؤ۔ سب نالائق ہیں۔ کب سے پانی مانگتا ہوں کوئی سنتا نہیں۔ ذرا تم پانی پلا دو۔ میں اس کا قصہ سناؤں۔ شیخ کچھ ڈھیلے پڑے اور گلاس میں پانی لائے۔ میں نے پانی پیا اور جو بچ رہا تھا اس کو ان کے سر پر چھڑک دیا۔ میری اس بے تکلفی پر ہنس پڑے تو مجھے اطمینان ہوا۔

میں نے کہا تم کو معلوم بھی ہے گوریلا کہتے کس کو ہیں۔ انہوں نے جواب دیا اقبال، احسان (ان کے دو بڑے بھائی) کہتے ہیں کہ گوریلا ایک طرح کا بڑا ڈراؤنا بدشکل بندر ہوتا ہے۔ میں نے کہا ان کو کیا معلوم گوریلا کسے کہتے

ہیں۔ گوریلا کے معنی ہیں غوریلا۔ پوچھا غوریلا کیا؟ میں نے عرض کیا غور کرنے والا۔ کہنے لگے (اور آواز میں غور اور غراہٹ دونوں شامل تھی) غور کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں نے کہا غور کرنے کے بڑے فائدے ہیں۔ ایک تو یہی دیکھو غوریلا ہمیشہ اچھے اچھے پھل کھاتا ہے پوچھا کون کون سے پھل؟ میں نے کہا بس یہی امرود، آڑو، ناشپاتی، بُھٹے، اچھا تم کون سا پھل پسند کرتے ہو؟ فوراً بولے امرود۔ میں نے جیب سے اکنی نکال کر ان کے حوالے کی اور تاکید کردی کہ جوں ہی پھل والا آئے امرود خرید لینا۔ انہوں نے قہقہہ لگاکر ایک چھلانگ ماری اور میری جان بچ گئی۔

[1] شیخ اب اسکول جانے لگے ہیں۔ بڑی پابندی سے جاتے ہیں اور بڑی مُستعدی سے واپس ہوتے ہیں اور سیدھے وہاں پہنچتے ہیں جہاں سے کھانا تقسیم ہوتا ہے۔ سب سے اچھی پلیٹ چنتے ہیں اور سب سے زیادہ کھانا لینا چاہتے ہیں۔ کھانا ختم ہونے پر ایک روز ان کے بھائی بہنوں نے مجھ سے کہا ابا میاں، نیازی کا حساب بڑا اچھا ہے۔ آپ امتحان لیجئے۔ میں تیار ہو گیا۔ . . . . میں نے کہا بھئی شیخ! تمہارے حساب جاننے کا سب پر بڑا رعب ہے۔ ایک آدھ سوال میں بھی کروں؟ کڑک کر بولے۔ ہاں ہاں!! میں نے پوچھا تمہاری عمر کیا ہے؟ بولے چھ برس کی۔ میں نے پوچھا عذرا کی۔ کہا سمجھ لو آٹھ برس کی۔ میں نے کہا اچھا اب یہ بتاؤ کہ کتنے سال میں تم عذرا کے برابر ہو جاؤ گے۔ فوراً بولے دو برس میں۔ سوائے عذرا کے سب نے اس جواب پر شیخ کو مبارکباد دی۔ میں نے عذرا سے پوچھا کیوں عذرا تم نے شیخ کی سوجھ بوجھ کی تعریف کیوں نہ کی؟ تو سلمیٰ نے جواب دیا ان کو اس کی کوفت

---

[1] شیخ نیازی صفحہ ۴۲-۴۴

ہوئی کہ بنا زی ان کے برابر کیوں ہو گئے۔ عذرا گھٹ کر رہ گئیں۔

کچھ دن بعد شیخ کی حساب کی قابلیت کا معاملہ پھر سامنے لایا گیا اور مجھ سے فرمائش کی گئی کہ میں شیخ کا ایک بار پھر امتحان لوں۔ میں نے پوچھا شیخ تم کو اپنی عمر تو معلوم ہے۔ بولے جی ہاں چھ برس کی۔ میں نے سوال کیا اور تمہاری اماں بی کی کیا عمر ہے؟ بولے مجھے کیا معلوم۔ میں نے کہا پوچھ کر بتاؤ۔ اتنے میں ایک دوسرا احساب کتاب شروع ہو گیا۔ ماں چڑ کر بولیں۔ یہ تم عمر کا جھگڑا کیا کھڑا کر دیتے ہو۔ کچھ اور پوچھنے کو نہیں رہا۔ میں نے عرض کیا یہ تو بچوں کا کھیل ہے اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے۔ بولیں اگر بچوں کا کھیل ہے تو بچوں کو کھیلنے دو۔ تم کہاں سے عمر پوچھنے آ گئے۔ میں نے بھی کچھ گرم لیکن جلد اس سے زیادہ نرم ہو کر کہا۔ شادی کے وقت تو تمہارے ماں باپ نے میرے پوچھے بغیر تمہاری عمر بتادی تھی اور آج اپنے بچوں کے پوچھنے پر بھی اپنی عمر نہیں بتاتیں۔ اس پر اور زیادہ خفا ہو کر کہا اچھا میری عمر پچاس سال کی ہے تب؟ میں نے کہا مجھے تو یاد آتا ہے یہ عمر تم نے اپنی والدہ کی بتائی تھی۔ غصہ میں رونے کے قریب ہو کر بولیں۔ مجھے کیا پڑی تھی۔ میں کیوں بتاتی۔ میں نے کہا اچھا جانے دو۔ کسی اور نے کسی اور کی بتائی ہو گی۔

اتنے میں شیخ نے پکارا ابا میاں جلدی پوچھیے۔ عذرا آپا نے انعام دینے کا وعدہ کیا ہے۔ میں نے کہا اچھا قریب آ جاؤ۔ آئے تو میں نے کہا اس وقت تمہاری عمر چھ سال کی ہے نا؟ میں نے کہا فرض کرو تمہاری اماں بی کی عمر چھبیس سال کی ہے۔ خوب سمجھ گئے؟ کہا ہاں ہاں سمجھ گیا۔ میں نے پوچھا اچھا اب بتاؤ جب تم پیدا ہوئے تھے تو تمہاری اماں بی کی عمر کیا تھی؟ شیخ نے سوچا۔ چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ ناک، ہونٹ، دہانہ، تھوڑی، گال دھیرے دھیرے بڑھنے

پھولنے لگے۔ کچھ جھوٹے اور قہقہہ لگا کر لوٹ گئے۔ پھر بولے سمجھ گیا۔ مجھ کو دھوکا دیا جا رہا ہے۔ ہاں عذرا آپا؟ عذرا نے اکتا کر کہا آخر کیا دھوکا دیا جا رہا ہے۔ جواب دو۔ بولے۔ دیکھئے جب میں پیدا ہوا تھا تو بالکل ننھا منا سا تھا جیسے احمد (ان کا چھوٹا بھائی جس کی عمر مشکل سے ڈیڑھ دو مہینے کی تھی) مجھے کیا معلوم اماں بی کی عمر کیا تھی۔

اس جواب کی ہر شخص نے داد دی۔ کسی نے چیخ کر، کسی نے اچھل کر بعضوں نے لوٹ پوٹ کر۔ میں نے شیخ سے ہاتھ ملایا اور ان کے سامنے جھک کر تعظیم دی۔

اُس سال جنگِ جبش کا خاتمہ اور شیخ بنیازی کا ختنہ ہوا۔ شیخ صاحب کو ختنہ کی اطلاع دی جا چکی تھی اور اس پر ان کی رائے بھی لے لی گئی تھی لیکن جیسا کہ زبردست کا ہمیشہ قاعدہ رہا ہے وہ فیصلہ پہلے کر لیتا ہے۔ رائے بعد میں لیتا ہے۔ شیخ کے ساتھ ناانصافی ہو گی اگر یہاں اس بات کا اقرار نہ کر لیا جائے کہ شیخ کی کمزوری جان کر ختنہ کا مسئلہ ان کے سامنے اس طرح رکھا گیا کہ ختنہ کیا وہ اس سے بھی بڑے حادثے سے گذرنا قبول کر لیتے۔

چنانچہ ایک ختنہ بہ ہے موقوف گھر کی رونق۔ ہم سب ایک دن "یومِ ختنہ" منانے کے لئے تیار ہو گئے۔ یہاں تک کہ ختنہ کرنے والا ایک میلی بقچی، سفید پگڑی اور چڑھی ہوئی ڈاڑھی لئے گھر کے دروازے پر نمودار ہوا۔ نائی کی سج دھج اور تیور دیکھ کر شیخ تو کیا شیخ کے بزرگوں کے بھی ہوش اڑنے لگے۔ اس کے بعد جو پکڑ دھکڑ اور چیخ و پکار مچی ہے اس سے بچے ہی نہیں ان کی سات پشت واقف ہے۔

شیخ بنیازی نے جتنے دن ختنہ کے سلسلے میں چارپائی پر گذارے ان میں

لے شیخ بنیازی صفحہ ۵۱ - ۵۲ - ۵۳ -

طرح طرح کی کہانیاں سنتے سنتے عذرا کی کوشش سے لکھنے پڑھنے میں کچھ شُدبُد پیدا کر لی۔ چنانچہ صحت پا کر دنیا کی چھین جھپٹ میں آئے تو پہلا خط انہوں نے اپنے چچا کے نام لکھا۔ اس خط میں انہوں نے لکھاوٹ کی بہت ساری ایسی اُلجھنیں دور کرنے کی کوشش کی تھی جو ہم جیسے لکھے پڑھے جاہلوں نے پھیلا رکھی ہیں۔ یہ خط پینسل سے کاغذ کے ایسے پُرزے پر لکھا گیا تھا جو سوا تحریر کے ہر مصرف میں آ چکا تھا۔ جس بات کو ہم یوں لکھتے "جواب دو" اس کو انہوں نے یوں لکھا تھا "ج واب ۲"۔

اس حادثہ پر شیخ کو ہموار کرنے میں جب ان کے تمام بھائی بہنوں کا ہنسنا سمجھانا اور غرانا بے کار ثابت ہوا تو یہ مسئلہ میرے سامنے لایا گیا۔ میں نے شیخ کو سراہا اور کہا۔ شیخ تم نے جس طرح لکھا ہے وہ صحیح ہو یا نہ ہو اس کے معقول ہونے میں شبہ نہیں۔ لیکن ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ اسے سمجھیں یا مانیں۔ کیونکہ اس دنیا کا جس میں ہم تم آ پھنسے ہیں قاعدہ یہ ہے کہ وہ ایکا ایکی نہ تو سینکڑوں ہزاروں سال پیچھے ڈھکیلی جا سکتی ہے اور نہ سینکڑوں ہزاروں سال آگے بڑھائی جا سکتی ہے۔ اُردو لکھنے کا جو کینڈا تم نے نکالا ہے وہ اُردو املا کے پورن راج کا طریقہ ہے۔ بولے پورن راج کسے کہتے ہیں؟ میں نے کہا شاید ایسے زمانے کو کہتے ہیں جب دنیا میں اچھائی کا راج ہوگا اور برائی دیکھنے کو نہ ملے گی۔ بولے ختنے بھی نہ ہوں گے۔ لوگ ہنسنے سے باز نہ آئے اور مجھ سے کوئی ٹھکانے کا جواب نہ بن پڑا تو میں نے کہا۔ دیکھو بات ختم ہو لینے دیا کرو۔ پورن راج میں کبھی کوئی آدمی بات کے بیچ میں نہیں ٹوکے گا۔

اچھا سنو تم جو چائے پیتے ہو اس میں کیا چیزیں ملی ہوتی ہیں۔ بولے پانی چائے، شکر دودھ۔ میں نے کہا اگر یہ چیزیں میز پر علیحدہ علیحدہ رکھ کر تمہارے

سامنے پیش کی جائیں تو تم کتنے پریشان ہو گے۔ اس لئے ضروری ہے کہ چائے کو پینے کے لائق بنانے کے لئے قاعدہ کے مطابق چائے پانی، شکر دودھ کو ملانا چاہیئے۔ چائے کا نسخہ جب شیخ کے حلق سے نیچے اتر گیا تو میں نے کہا اسی طرح ہر حرف کو موقع موقع سے ملا کر یا علیحدہ علیحدہ لکھتے ہیں تو پڑھنے میں آسانی ہوتی ہے اور مطلب صاف ہو جاتا ہے۔ جیسے ہر چیز ٹھیک طور پر ملانے سے گوشت، کباب، کھچڑی، ترکاری تیار ہوتی ہے۔ وہ علیحدہ علیحدہ رکھنے سے نہ تو کھانا تیار ہوتا ہے نہ بھوک دور ہوتی ہے، نہ جی بھرتا ہے۔ اسی طور ان کو ۲ اور "دو" کا مطلب سمجھایا گیا۔

[1]گھر کے صحن میں پھولوں کی کیاریاں تھیں اور ہر کیاری ایک ایک بچے کے قبضے میں دے دی گئی تھی۔ ایک[2] دن ان کے کلاس کے کچھ لڑکے ہمارے ہاں آئے۔ شیخ اپنی کیاری کے پھول پودے سب کو دکھا رہے تھے اور ہنسنے بولنے میں مشغول تھے۔ میں نے لڑکوں سے پوچھا تم لوگوں میں سے کون کون کلاس میں مار کھاتا ہے اور مار کھانے پر روتا ہے۔ سب نے اقرار کیا۔ مار بھی کھاتے ہیں اور روتے بھی ہیں۔ ایک نے کہا نیازی بھی تو مار کھاتے ہیں۔ شیخ صاحب چمک کر بولے لیکن روتا تو نہیں۔ میں نے پوچھا روتے کیوں نہیں۔ بولے رونے سے اور مار پڑتی ہے۔ ماں نے پوچھا آخر اس کا کیا سبب ہے کہ گھر پر بغیر مار کھائے بھی روتے ہو۔ لڑکوں کی طرف چپکے سے اشارہ کر کے بولے۔ یہ جو وہاں ہوتے ہیں۔

فرمائش کرنے میں شیخ سب سے آگے رہتے ہیں۔ ایک دن شہر جا رہا

---

[1] شیخ نیازی صفحہ ۶۴ [2] شیخ نیازی صفحہ ۲۴

تھا کہنے لگے میرے لئے فٹ بال لائیے گا۔ میں نے کہا اچھا۔ اب میری خدمت خاطر میں مصروف ہو گئے جوتا لاکر سامنے رکھ دیا۔ ٹوپی ہاتھ میں لے لی۔ کسی مکھی کی مجال نہ تھی کہ دو دو چار چار گز تک میرے قریب آ سکے۔ اسی دوران میں برابر فٹ بال کی شکل، رنگ، فٹ بال میچ، اپنے کھیلنے کی تعریف، فٹ بال کے گم ہو جانے کے اندیشے اور اس کے محفوظ رکھنے کی تدبیر میں اپنے دوستوں کی بڑائی، دشمنوں کی برائی، ماں کو دوا نہ پینے پر ملامت، خود ہر طرح کی دوا پینے پر آمادہ رہنا۔ غرض کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جس پر ایک ہی سانس میں یہ اپنے سارے خیالات نہ ظاہر کرتے جا رہے ہوں۔ اتنے میں عذرا میرے قریب آئیں۔ شیخ نے لپک کر ایسا دھکا دیا کہ وہ گرتے گرتے بچیں۔ بولے دیکھتی نہیں ہو ابا میاں میرے لئے فٹ بال لینے جا رہے ہیں۔

میں تانگے پر سوار ہوا۔ تانگے تک یہ بھی آئے اور برابر فٹ بال کے مسئلے پر گفتگو کرتے رہے۔ تانگہ کچھ آگے بڑھا کہ انہوں نے پکارا اور دوڑ پڑے۔ میں رک گیا۔ بولے یہ کہنا تو بھول ہی گیا تھا کہ فٹ بال کا فیتہ بھی لائیے گا۔ میں نے کہا اچھا۔ گھر تک پہنچے تھے کہ پھر پکارا۔ ابا میاں جلدی جلدی جائیے۔ زور کی بارش آ رہی ہے۔ میں شہر سے دیر میں واپس ہوا۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ دیکھا تو شیخ دروازے پر اندھیرے میں کھڑے ہیں۔ تانگہ آتے ہی پکارا "ابا میاں فٹ بال"۔ میں نے برآمدہ میں پہنچ کر بھرا ہوا فٹ بال ان کے حوالے کیا۔ فٹ بال پا کر ان کے چہرے پر خوشی کی جو کرنیں پھوٹی ہیں اور میرے احسان اور اپنی شکر گزاری کے اظہار میں یہ جس جس طرح تھر کے ہیں اور حلق اور منہ سے جیسی جیسی سریلی اور گونجیلی آوازیں نکالی ہیں مجھے کچھ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے یہ ساری دنیا ایک فٹ بال ہے جسے خدا نے مجھے اس طرح تحفہ میں دیا ہے

جس طرح میں نے شیخ کو فٹ بال دیا تھا۔

[1] آج کل مکان بننے والا ہے۔ زمین کی صفائی ہو رہی ہے۔ گدھے اور خچر مٹی اور اینٹیں لالا کر ڈال جاتے ہیں۔ بچوں کی عید ہے۔ اس لئے نہیں کہ مکان بننے والا ہے بلکہ والدین کے بجائے اب خچر اور گدھوں سے واسطہ ہے۔ تمام دن مٹی پر لوٹتے اور خچر اور گدھے پر سواری کرتے ہیں۔ ہر بچے نے اپنا اپنا خچر اور گدھا چن لیا ہے۔ شیخ نے جس گدھے کو اپنایا ہے وہ سب سے زیادہ غریب صورت ہے لیکن سب سے زیادہ دولتی جھاڑتا ہے۔ لدا پھندا جوں ہی پہنچا۔ شیخ نے بڑھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بوجھ اتارنے میں گدھے والے کی مدد کی اور فوراً گدھے پر قابض ہو گئے۔

شیخ کو گدھوں کا تجربہ نہ تھا اور انصاف کی بات یہ ہے کہ گدھوں کو بھی شیخ صاحب کا تجربہ نہ تھا۔ پہلے دم کی طرف سے چڑھنے کی کوشش کی اس نے دولتی جھاڑ دی اور یہ زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ اِدھر اُدھر دیکھ جلدی سے اٹھ بیٹھے اور اس کے منہ کی طرف سے چڑھنے لگے۔ گدھے نے منہ مارا تو پھر زمین پر آرہے۔ گدھے نے فتح کی خوشی میں اپنا قومی ترانہ الاپنا شروع کیا تو یہ عزا کر بولے۔ واہ بے گدھے، مارتا بھی ہے اور شور بھی مچاتا ہے۔ اب انہوں نے گدھے کا آگا پیچھا سوچ کر پہلو سے حملہ کیا اور اس کی پیٹھ پر بیٹھ گئے۔ دو چار قدم چلنے کے بعد گدھے نے جھرجھری لی اور شیخ مٹی کے ایک بڑے ڈھیلے کی طرح زمین پر لڑھک گئے۔ شام کو گھر واپس آئے تو حلیہ بتا رہا تھا کہ تمام دن ان کا گدھوں سے اور گدھوں کا ان سے کیسا سابقہ رہا ہو گا۔

---

[1] شیخ نیاز صفحہ ۶۸

معمول کے خلاف چپ چپ سے رہے اور کھا پی کر سو رہے۔ سویرے اٹھے تو چہرے پر ایک خاص انداز کی لٹک نظر آئی۔ دوستوں کا خیال تھا کہ شیخ کے دھیان میں کچھ اونچی باتیں تھیں۔ دشمن یہ کہتے تھے کہ کچھ نہیں فقط گدھے کی لاتیں تھیں۔ ناشتہ وغیرہ کے بکھیڑوں سے جلد جلد اور چپ چاپ گذر گئے اور گھر سے چلتے ہوئے عذرا کو بھی اپنا پروگرام نہ بتایا۔ عذرا کو شبہ ہوا۔ پوچھا کیوں مُنا کیا بات ہے۔ کدھر کا ارادہ ہے۔ بغل میں کیا دبا رکھا ہے۔ شیخ نے اِدھر اُدھر دیکھا اطمینان کر لینے کے بعد بغل سے بغچی نکالی۔ اس میں ماں کا موباف اور عذرا کا دوپٹہ تھا۔ عذرا نے گھبرا کر پوچھا یہ تم کیا کرنے والے ہو۔ کہا کل گدھے نے بڑی بدمعاشی کی پہلے تو چڑھنے نہیں دیتا تھا اور لاتیں اوپر سے مارتا تھا۔ آج میں (موباف دکھا کر) اس سے تو اس کی ٹانگیں باندھوں گا اور دوپٹہ منہ پر لپیٹ لوں گا کہ لاتیں نہ لگیں۔ عذرا نے جل کر کہا تم بھی کیسے گدھے ہو اس کی ٹانگ باندھ دو گے تو وہ چلے گا کیسے؟ اور اپنا منہ لپیٹ لو گے تو دیکھو گے کیسے کہ گدھا کدھر لئے جا رہا ہے یا کیا کر رہا ہے۔ میرا دوپٹہ اس کام کے لئے نہیں ہے۔

اتفاق سے ادھر ماں کا گذر ہوا جہاں گدھے کے خلاف دونوں میں گفتگو ہو رہی تھی۔ انہوں نے اپنے موباف کا یہ مصرف سنا تو شیخ کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہا جو ان سے پہلے گدھا کر چکا تھا۔ ادھر دوپٹہ کا پیچ کچھ اس طرح آن پڑا تھا کہ عذرا کے دل میں شیخ کے لئے محبت کے جتنے خانے تھے ان میں بہت سے سونے ہو گئے تھے جتنے آباد رہ گئے تھے وہ رہ رہ کر اپنا رنگ دکھا جاتے۔ یعنی ماں کی طرف سے جو حملہ شیخ پر ہوتا تھا اس کی روک تھام تو کرتیں لیکن اپنے دل کا جو بخار اٹھتا اس کو قابو میں نہ رکھ پاتیں۔ یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ میں

پہنچ گیا۔ دوپٹہ میں نے عذرا کے حوالے کیا۔ انہوں نے اسے پہلے کھول کر اور بعد میں اچھی طرح جھٹک کر اپنا اطمینان کر لیا کہ اس میں گدھا یا شیخ صاحب تو بندھے ہوئے نہ تھے۔ پھر شیخ کو اپنے ہمراہ لے کر واپس چلی گئیں۔ ماں کی برہمی ابھی دور نہیں ہوئی تھی۔ میں نے کہا شیخ پر تمہارا بگڑنا بجا ہے لیکن وہ ابھی ناسمجھ ہے۔ وہ کیا جانے۔ موباف کا کتنا مان دان ہم نوریاف کرتے ہیں۔ یہ دنیا ہے۔ شیخ گدھے کے ساتھ جو سلوک کرنا چاہتے تھے یا گدھے نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ بالکل ایسا ہے جیسے تم نے دیکھا ہوگا۔ میاں بیوی یا لیڈر اور قوم ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ اس طرح کی کھڑکھڑاہٹ اور گڑگڑاہٹ ہوئی جیسے ریڈیو سٹ میں ہوتی ہے اور وہ یک بیک رک جاتا ہے۔

مکان بنے کتنے سال ہو گئے۔ کل کے ناسمجھ بچے بچیاں آج سیلانے ہو گئے اور زندگی کے ایسے کاموں میں لگ گئے جن میں ان کو خوشی اور نیک نامی نصیب ہے۔ جب کبھی اکٹھا ہوتے ہیں اور مکان کے خوبصورت، کشادہ اور آرام دہ ہونے کی بات نکلتی ہے تو اس زمانے کا ذکر کرنے لگتے ہیں جب مکان کے لئے نیو کھد رہی تھی اور وہ اسی کے اندر بھاگے بھاگے پھرتے اور طرح طرح سے دھومیں مچاتے تھے۔

عذرا کا چھوٹا بچہ طارق ہے اس کے کھانے پینے رہنے سہنے، کے کام میں وہ دن رات اس درجہ سر کھپاتی ہیں کہ دوسرے بھائی بہن ان کو اکثر چڑایا کرتے ہیں۔ بچوں کی تندرستی برقرار رکھنے کے لئے میں بھی یہی سب کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں۔

حال میں طارق نے ایک خوانچہ والے کی ریوڑیوں کے لئے جس پر مکھیاں

بھنبھنا رہی تھیں مچلنا شروع کیا ۔ بہلانے چمکارنے سے نہ مانا اور شور وغل زیادہ ہوا تو عذرا پہنچیں ۔ کچھ دیر چپ کھڑی رہیں اور پھر ریوڑی خرید کر بچے کو دے دی ۔ واپس آئیں تو سلمیٰ کو بڑا اچنبھا ہوا اور اس کی وجہ پوچھی ۔

عذرا کے آنسو نکل آئے جسے وہ جلد ہی پونچھ کر ہنس پڑیں اور کہنے لگیں ۔ سلمیٰ وہ دن بھی یاد ہیں جب یہ مکان بن رہا تھا ۔ مزدوروں کے ننگ دھڑنگ میلے کچیلے بچے بچیاں موجود ہوتیں ۔ جن کے ساتھ ہم سب کس بے فکری اور بے تکلفی سے کھیلا کودا کرتے تھے ۔ کوئی خوانچہ والا آتا تو مزدوروں کے یہ بچے کس طرح ٹوٹ کر گرتے ۔ خوانچہ والے کو گھیر لیتے ۔ ماں باپ کچھ دلوا دیتے تو کتنے خوش ہوتے تھے ۔ جن کے ماں باپ کچھ نہ دلوا سکتے اور بچوں کے بلکنے پر ان کو جھڑکتے ، گالیاں دیتے اور کبھی ایک آدھ تھپڑ مار دیتے تو کتنے مایوس ہوتے اور بجھ سے جاتے ۔ ہم تم بھی خوانچہ والے کی ریوڑی کے لئے کتنے بے قرار ہوتے تھے ۔ ابا میاں کی تاکید اور نوکروں کی نگرانی کی وجہ سے ریوڑیوں تک نہ پہنچ پاتے تو کیسی مایوسی اور بے بسی کا سامنا ہوتا ۔ مجھے اس وقت وہ زمانہ یاد آ گیا اور وہی باتیں نظر کے سامنے آ گئیں اور دل نہ مانا کہ طارق کو وہی تکلیف ہو ۔

عذرا کے اس کہنے سے میں چونک پڑا اور دل کو دھچکا سا لگا ۔ زندگی کا یہ کیسا انوکھا پھیر تھا کہ جو کام اپنے خیال میں ماں باپ ، بھولے بھالے ناسمجھ بچے کی بھلائی کے لئے پیار اور سمجھ داری سے کرتے ہوں وہ بچے کو اتنا دکھ پہنچاتا ہو ۔ تھوڑی دیر تک وہ باتیں یاد آئیں جو میں نے بچوں کو اپنے خیال میں دکھ سے بچانے اور آرام پہنچانے کے لئے کی تھیں ۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی ستانے لگا کہ ان کے کہنا نہ ماننے پر میں نے کبھی کبھی ڈانٹا

اور مارا بھی تھا۔ اس سے ان کے دل پر کیا گذری ہوگی۔

○

رشید صاحب کا حلقۂ احباب بہت زیادہ وسیع کبھی نہیں رہا۔ لیکن جو تھے وہ قلبی اور جاں نثار، ایک دوسرے پر فدا ہو جانے والے۔ رشید صاحب کی تحریروں میں مختلف منازل پر ہمیں ان کے احباب کی جھلک ملتی ہے۔ علی گڑھ کالج میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے ان کا سابقہ مولانا سہیل سے ہوا اور پھر ان کے توسط سے ذاکر صاحب سے۔ یہ دونوں ان کی زندگی، طرزِ تحریر اور حالات پر بہت زیادہ اثر انداز ہوئے۔ ان تینوں میں آپس میں والہانہ محبت تھی، رہی اور زندگی کے ساتھ گئی۔ ان دونوں کا خاکہ رشید صاحب نے جس محبت اور فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے اُردو ادب میں اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔

پھر علی گڑھ یونیورسٹی میں مُعلمی کے دوران ڈاکٹر اصغر اور ڈاکٹر عبادالرحمٰن صاحب بھی ان کے بڑے بے تکلف، مخلص اور جگری دوستوں میں نظر آتے ہیں ان کی تصویر کشی میں رشید صاحب نے آپس کی نوک جھوک کو بڑے دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔

مولانا سہیل اور ذاکر صاحب کی جیتی جاگتی تصویریں

[1] مولانا سہیل اور کچی بارک دو چیزیں تھیں جن سے میں علی گڑھ میں سب سے پہلے دوچار ہوا۔ انہیں دونوں کا طفیل تھا کہ ذاکر صاحب سے سابقہ پڑا۔ میرے لئے یہ بتانا کس

---

[1] مضامین رشید صفحہ ۲۷۳

قدر دلچسپ اور دشوار ہے کہ میری زندگی کے کتنے نشیب وفراز، کتنی کامیابی و کامرانی ان سے وابستہ ہے۔ مولانا سہیل ہی کے ایما، اصرار اور ہمت افزائی سے میں نے موجودہ رنگ میں مضمون لکھنا شروع کیا۔ یادش بخیر! (کچی بارک دگل منزل) اسی رنگ میں میرا پہلا مضمون تھا۔

مولانا سہیل (اقبال احمد خاں ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی علیگ) سے میری ملاقات ۱۹۱۵ء میں ہوئی۔ اس زمانے میں مولانا شاعری کرتے تھے۔ یونین کے الیکشن لڑاتے اور معجون کھاتے تھے۔ جس دن مولانا سے ملا ہوں مولانا الیکشن میں مبتلا تھے۔ کچی اور پکی بارکوں میں یوں ہی کیا کم چشمک رہا کرتی تھی۔ جب سے مولانا کچی بارک میں آگئے تھے۔ فریقین میں مقابلہ و مسابقت کا جذبہ خطرناک حد تک بڑھ گیا تھا۔ الیکشن کا زمانہ قریب تھا۔ ہر شخص اس آشوب میں مبتلا تھا۔ ایک فریق کے ایجنٹ میرے کمرے میں بھی آگئے۔ مولانا کو خبر ہوئی تو قاآنی کا ایک شعر گنگناتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ پانوں کی ڈبیا ہاتھ میں۔ پیک منہ میں اور اس کے دھبے شیروانی پر۔ کمرے میں بیٹھنے کی چیز کہاں۔ بکس پر فریق مخالف کے ایجنٹ بیٹھے ہوئے اپنے امیدوار سے زیادہ میری قابلیت کا خطبہ پڑھ رہے تھے۔ مولانا بھی داخل ہوئے۔ بیٹھنے کو جگہ نہ ملی۔

کچی بارک کے غسل خانے معلوم نہیں آپ نے دیکھے بھی ہیں یا نہیں۔ میرے غسل خانے کی آبادی صرف ایک گھڑے پر مشتمل تھی۔ دوسرے کی جگہ خالی تھی۔ اس پر مولانا بلا تکلف اس طور پر بیٹھ گئے گویا موصوف آج تک صرف اسی قسم کی نشست پر بیٹھنے کے عادی تھے۔ مجھ پر اس کا بہت اچھا اثر پڑا۔ یہ البتہ نہیں معلوم کہ اس گھڑے پر اس کا کیا اثر پڑا جس کے رفیق کی جگہ

مولانا نے غصب کر لی تھی۔

اب میں تو الگ رہا۔ مولانا اور ان کے حریف میں گلخپ ہونے لگی جریف نے آخر اس اعتراف پر بحث ختم کرنی چاہی کہ دونوں امیدوار احمق، مولانا نے برجستہ فرمایا تو جناب میرا احمق کیوں نہ ووٹ پائے۔

وطن[1]، خاندان، احوال، معتقدات، تعلیم و تربیت، رہن سہن کے اعتبار سے مولانا قطعی مشرقی اور مذہبی واقع ہوئے تھے بایں ہمہ علمی مسائل کو علمی نقطہ نظر سے دیکھنے پرکھنے یا شعر و ادب میں اصلاح و ترقی کے رجحانات کو پہچاننے اور اس کی تائید کرنے میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ ہر مسئلے پر اظہارِ خیال کرنے میں اس کا لحاظ رکھتے کہ نقطہ نظر وہ ہو جس کا مسئلہ مطالبہ کرتا ہو نہ یہ کہ ہم آپ کیا چاہتے ہیں

ذاکر صاحب[2] اور میں مولانا کے ساتھ کالج میں کم و بیش چار سال رہے۔ دن رات کا اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، بات چیت، سیر و سفر، رنج و راحت میں ایک دوسرے کے شریک رہے۔ گفتگو یا مباحثے میں فارسی اور اردو کے سربرآوردہ شعرا کے چیدہ اشعار مولانا کی زبان پر اتنے برمحل آتے کہ اکثر شعر ہی سن کر محفل کا رنگ بدل جاتا۔

اپنے نیاز مندوں میں مولانا نے جن دو چار کو تادمِ آخر تقریباً چالیس سال تک عزیز و محترم رکھا۔ ان میں سے ایک راقم السطور بھی تھا۔ مجھے تو جیسے وہ کسی حال میں متردد و مایوس نہ دیکھ سکتے ہوں اور ہر طریقے سے جو ان کے بس میں ہوتا خوش کرنے یا تسکین و تقویت پہنچانے کی کوشش کرتے۔ مرحوم کے اردگرد جتنے لوگ تھے خواہ اپنے ہوں یا پرائے ان سے کوئی پوچھے کہ مرحوم کی مفارقت

---

[1] آشفتہ بیانی میری صفحہ ۸۱ [2] آشفتہ بیانی میری صفحہ ۷۶ -

سے ان پر کیا گذر گئی۔ مرحوم تو اٹھ گئے۔ ان کی یادوں کے حزیں اور رہ رہ کر اُمنڈنے والے اندوہ کو کہاں لے جاؤں۔ کیسے بھلاؤں۔ یا ان کو کیا جواب دوں۔[1]

میں علی گڑھ آیا تو میرا سابقہ جہاں اور بہت سی باتوں سے ہوا وہاں ایک ایسے شخص (ذاکر صاحب) سے بھی ہوا جو علی گڑھ کا ساختہ و پرداختہ تھا۔ اور اپنی قابلیت، اپنی خدمات اور اپنی شخصیت کے اعتبار سے بیسویں صدی کے نصف ثانی کے ہندوستانی مسلمانوں کا ویسا ہی نجات دہندہ ثابت ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا جتنا انیسویں صدی کے نصف ثانوی کے سرسید ثابت ہوئے۔

میں فرسٹ ایر میں داخل ہوا تو مولانا اقبال احمد خاں سہیل کے توسط سے ذاکر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ جب سے اب تک زندگی کیسے کیسے نشیب و فراز سے گذری لیکن اخلاص، یگانگت اور بے تکلفی کے تعلقات بڑھتے اور گہرے ہی ہوتے گئے۔ کبھی کبھی زندگی کے اوراق کو جہاں تہاں سے الٹ پلٹ کر دیکھتا ہوں تو ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کا بیچ نہ ہوتا تو کیا ان اوراق کے نقوش ایسے ہی ہوتے جیسے کہ ہیں۔

میرا ان کا جتنا قریب اور جتنا طویل ساتھ رہا ہے بہت کم لوگوں کا رہا ہوگا اور مجھ سے زیادہ ان کے بارے میں رائے قائم کرنے کا موقع بھی شاید ہی کسی اور کو ملا ہو۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ رائے صحیح ہے یا غلط۔ ذاکر صاحب کے بارے میں (وقتاً فوقتاً متفرق و منتشر طور پر) میں نے بہت سی ایسی باتیں اس انداز سے لکھیں کہ بعض بزرگوں نے میری چشم نمائی بھی فرمائی۔ میں متنبہ ہوا۔ لیکن اس پر ہنسی بھی آئی کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف یہ دیکھتے[2]

---

[1] آشفتہ بیانی میری صفحہ ۶۵-۶۶ [2] مضامین رشید صفحہ ۲۳۰

ہیں کہ کیا لکھا گیا۔ یہ نہیں دیکھتے کہ کون کس کے بارے میں لکھ رہا ہے۔ تکلف برطرف مُرشد (ذاکر صاحب) اور سہیل عصرِ حاضر کے ہندوستانی مسلمانوں میں منفرد ہیں۔ میں نے ان سے زیادہ کسی کو طباع، ذہین اور بے پناہ نہیں پایا۔

[1] حکومتِ ہند کی طرف سے کچھ ماہرینِ تعلیم ایک تعلیمی کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن جانے والے تھے۔ ان میں ذاکر صاحب بھی تھے۔ میں نے کہا ذاکر صاحب آپ لندن جا رہے ہیں ایک چیز میرے لئے لیتے آئیے گا۔ بولے ''وہ تو ضرور لاؤں گا۔'' میں نے کہا کیا؟ فرمایا ''گلاب'' میں بھڑک گیا۔ ذاکر صاحب لندن سے واپس آئے اور گلاب بھی لائے۔ جس نے سنا تعجب کیا۔ لیکن طے کوئی نہ کر سکا کہ اس میں بے تکان کون تھا۔ فرمائش کرنے والا یا فرمائش لانے والا۔

''گلاب کا لانا بظاہر ایک معمولی سی بات ہے لیکن اس کی تہہ میں ذاکر صاحب کی بے پناہ مسرت کا موتی تارے کی طرح دمکتا نظر آتا ہے۔ ایک دوست کی معمولی سی فرمائش پوری کر دینے کے لئے بڑی سے بڑی دشواریاں اٹھانے کا ایک مخصوص سرور ہوتا ہے جس سے آشنا ہونا ہر ایک کا مقدر نہیں۔ مجھے گلاب پانے کی بڑی خوشی ہوئی اگر یہ فرمائش کسی اور نے پوری کی ہوتی تو بھی خوشی ہوتی۔ لیکن ذاکر صاحب کا بیچ میں ہونا میری خوشی کا خاص طور پر موجب ہوا۔

ذاکر صاحب سے میرے تعلقات بڑے گہرے اور بڑے پرانے ہیں لیکن قومی زندگی میں میرا ان کا کبھی ساتھ نہ ہوا۔ وہ قلندر، میں دنیادار، انہوں نے زندگی کے جو مصائب اٹھائے ہیں میں ان کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ زندگی کے جن آستانوں پر میں نے سر جھکایا۔ ان آستانوں نے ذاکر صاحب کے سامنے پیہم

---

[1] ذاکر صاحب صفحہ ۳-۵-۶۔

سجدے کئے اور ٹھکرائے گئے۔ ذاکر صاحب مجھ سے تھوڑی سی بھی قربانی کرنے کو کہیں تو شاید میں نہ کر سکوں۔ ممکن ہے یہی سبب ہو کہ انہوں نے مجھ سے اس قسم کی فرمائش نہ کی۔ میں نے ان سے بڑی سے بڑی فرمائش کی اور انہوں نے ذرہ برابر ہچکچائے بغیر اسے پورا کر دیا۔ ۔ ۔ ۔

ذاکر صاحب کی شرافت، وسعت قلب، اور دوست نوازی پر نظر کرتا ہوں[1] تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ذاکر صاحب کو کوئی برا کہتا ہے تو میں بھونچکا رہ جاتا ہوں۔ اس کے فوراً بعد جو بات میرے ذہن میں آتی ہے وہ یہ کہ یا تو یہ شخص شیطان محض ہے یا ناواقف محض۔

۱۹۲۰ء میں ہم سب صاحب باغ میں ایم۔ اے پریویس اور قانون کے طالب علم تھے۔ قانون کے امتحان میں مشکل سے پندرہ دن باقی تھے اور کورس سارے کا سارا دھرا تھا۔ کئی دن سے ہم لوگوں کی توجہ اس مصیبت پر مرکوز تھی۔ ذاکر صاحب کہتے تھے پڑھنا تو ہے ہی چاہے امتحان سے پہلے پڑھا جائے چاہے بعد میں ضرورت صرف اس کی ہے کہ ناشتے اور کھانے کا مکمل پروگرام بنا لیا جائے۔ نصیر مرحوم نے ذرا چیں بجبیں ہو کر کہا۔ ذاکر تم پڑھائی میں کھنڈ ڈالتے آئے ہو اور اب بھی اسی کے درپے ہو۔ بڑی رد و قدح کے بعد پروگرام بنا۔ ۔ ۔ ۔ پڑھائی شروع ہوئی۔ ہم تین آدمی ساتھ پڑھتے تھے۔ ذاکر صاحب، میں، نصیر الدین علوی مرحوم اور خلیل الدین مرحوم۔ بحث اس پر چھڑی کہ باآواز بلند کون پڑھے۔ اس پر کوئی تیار نہیں ہوتا تھا۔ نصیر مرحوم ہکلاتے تھے۔ ان کو پڑھنے سے معاف کر دیا گیا تھا اور بحث کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ خلیل مرحوم پڑھنے سے شرماتے تھے۔ ان کا کالج کا نام بھی

---

[1] ۔ ذاکر صاحب صفحہ ۳۸ ۔ ۴۴ ۔ ۴۸ ۔ ۴۹ ۔

گلفام ہے۔

میں نے کہا۔ میں پڑھنے کے لئے تیار ہوں لیکن پھر ذاکر صاحب نے قائم گنج سے جو گھی منگوایا ہے وہ دوپہر اور شام کو دال میں ڈالنے کے لئے دو چمچے زائد لوں گا۔

نصیر صاحب طیش میں آکر بولے "ہر۔۔۔ ہر۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔ میں پ پ پ۔۔۔ پڑھوں گا۔ میں نے کہا تو پھر تین چمچے لوں گا۔ ذاکر صاحب بولے وہ کیوں؟ میں نے کہا "نصیر صاحب پڑھیں گے تو مجھے ایک چمچہ سر میں بھی ڈالنا پڑے گا۔"

ذاکر صاحب نے کہا۔ میں پڑھنے کے لئے تیار ہوں لیکن صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ سب سے تین منٹ پہلے کھانا شروع کر دوں گا۔ اس کے بعد آپ لوگ شروع کریں گے۔

اس پر ہر شخص بیک وقت چیخ پڑا اور بولا۔ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ ہم پڑھنے کے لئے آئے ہیں بھوکوں مرنا نہیں چاہتے۔ غرض پڑھائی شروع ہوئی۔۔۔ وہ زمانہ اب بھی یاد آتا ہے۔ ہمارے کمرے صاحب باغ کی دوسری منزل پر مشرقی سمت واقع تھے۔ سامنے برآمدہ تھا۔ برآمدے سے اتر کر لمبا پتلا صحن جہاں ہم سب پڑھتے میں مصروف تھے۔ رات زیادہ آچکی تھی۔ ذاکر صاحب کتاب پر جھکے ہوئے تھے۔ دونوں کہنیاں میز پر ٹکیں اور ہاتھوں کی دو انگلیوں سے آنکھوں کے پپوٹے کھولے ہوئے تھے۔ میں نے کہا ذاکر صاحب یہ کیا؟ کہنے لگے۔ نہ نیند مانتی ہے نہ آپ مانتے ہیں میں کروں کیا؟ نیند آتی ہے پر نہیں جاتی۔

لے ذاکر صاحب صفحہ ۵۲-۵۴-۵۶-

دوسرے ہی دن طالب علموں کا ایک ہجوم صاحب باغ پہنچا۔ معلوم ہوا کہ کسی مسئلہ پر طلبہ نے اجتماعی طور پر احتجاج کیا ہے اور ذاکر صاحب سے درخواست کرنے آئے ہیں کہ وہ اس کی سربراہی کریں۔ ذاکر صاحب فی الفور ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ تین چار دن تک ان کا کوئی پتہ نہ چلا۔ ایک دن یونین کے دارالمطالعہ میں مل گئے۔ میں نے پوچھا کیسی رہی؟ بولے "بخیر گذشت" میں نے کہا اور جناب پڑھائی؟ فرمایا اس ہنگامے میں جو دل و جان سے منہمک رہا اس کا کچھ تو اجر ملنا چاہیئے تھا۔ اللہ نے آپ سے نجات دلائی"۔

"اور کھانا پینا؟" میں نے پوچھا۔ بولے "قوم کا کام کرنے والا بھوکا نہیں مرتا"۔ میں نے کہا "ذرا احتیاط رکھیئے گا۔ قومی کام کرنے والے بھوک سے تو نہیں مرتے لیکن ہیضے میں اکثر مرے پائے گئے ہیں"۔ میں بدحظ ہو کر چلنے لگا تو لپک کر سامنے آگئے کہنے لگے۔ "للہ میرا کہا مان لیجئے"۔ میں نے کہا وہ کیا؟ فرمایا چلئے دہلی چلیں"۔ میں اکتا گیا اور بولا۔ ذاکر صاحب ہوش میں آیئے۔ امتحان کے کئے دن رہ گئے ہیں؟ اس بات کو اس طور سے ٹال گئے جیسے اس کی ذرہ برابر بھی اہمیت نہ تھی۔ کہنے لگے پڑھ کے کیا کیجئے گا۔ کھانے کمانے بھر کا پڑھ لیا ہے۔ احمقوں کو مرعوب کرنے کے لئے بی۔ اے کافی ہے۔ بھلے مانسوں میں بیٹھنے کے لئے ہنسنے بولنے کی عادت ڈالنی ہے۔ اس کے لئے دہلی کا سفر ضروری ہے۔

میں نہ مانا۔ ذاکر صاحب بھی دلی نہ گئے۔ صرف کالج میں جہاں تہاں کھاتے یا گپ کرتے پائے گئے۔ امتحان سے تین چار دن پہلے صاحب باغ کے اُفق پر پھر سے نمودار ہوئے۔ ہم نے ان کی پذیرائی اس طور کی جیسے وہ سب کچھ کھو آئے تھے اور ہماری ہمدردی کے مستحق تھے اور وہ اس طور سے

ملے جیسے انہوں نے ہمارے گناہوں کو معاف کر دیا ہو۔ امتحان ہوا۔ نتیجہ نکلا۔ ہم سب فیل صرف ذاکر صاحب پاس!

میں اپنے اچھے اور صاحبِ توفیق طالب علم کو اکثر یہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ کبھی نہ کبھی ذاکر صاحب سے مل ضرور آئے۔ اور یہ اس لئے کہ میں جس متاع کو اپنے لئے گراں مایہ سمجھتا ہوں۔ اس میں اپنے ان عزیز طلباء کو بھی شریک کر لینا چاہتا ہوں جن کو عزیز سمجھتا اور محترم گردانتا ہوں۔ بہ حیثیت ایک مُعلم میرا عقیدہ ہے کہ نوجوانوں کو جتنی صحیح و صالح تربیت بلند و برگزیدہ شخصیتوں سے ملتی ہے اتنی کتابوں اور لکچر سے نہیں ملتی۔ مطالعے سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے جو بے کار بھی ہو سکتی ہے اور خطرناک بھی۔ اگر کوئی بڑی شخصیت ان معلومات کو اس طالب علم کے لئے مفید مطلب نہ بنا دے۔

ایک[1] زمانہ میں راقم الحروف اور یادش بخیر ذاکر صاحب کالج میں ساتھ رہتے تھے اور حُسنِ اتفاق سے جس روز ایسا کھانا مل جاتا جسے کالج ڈائننگ ہال کی ہوا تک نہ لگی ہو۔ ہم دن کا دن اور رات کا بیشتر حصہ ایک بہترین اُردو رسالہ نکالنے کی اسکیم مرتب کرنے میں صرف کر دیتے تھے۔ لیکن یہ منصوبے محض اس چٹان سے ٹکرا کر فنا ہو جاتے کہ رسالے کا نام کیا ہو گا۔ ۲۳-۱۹۲۲ء میں ذاکر صاحب نے ہندوستان کی زمین کو خیر باد کہا۔ اس وقت تک صرف دو نام تجویز کئے جا سکتے تھے۔ ایک شمع اور دوسرا سہیل شمع کو ایک صاحب نے اُڑا لیا۔ اب صرف سہیل باقی رہ گیا تھا۔ پچھلے دنوں سید سجاد حیدر صاحب یلدرم مرحوم سے اس کا تذکرہ آیا تو فرمانے لگے "یہ

---

[1] سہیل کی سرگذشت صفحہ ۳۹۔

نام عرصے سے میرے ذہن میں ہے۔" میں نے خیال کیا۔ کہیں اس سے بھی ہاتھ دھونا پڑے تو پھر ذاکر صاحب بھی نہیں ہیں۔ اس ہفت خوان کو نئے سرے سے کون طے کرے گا۔ جلد سے جلد اس نام کا اعلان کرنا پڑا۔ یہ ایک سہ ماہی ادبی رسالہ تھا جو میں نے انجمن اُردوئے معلیٰ کی طرف سے ۱۹۲۶ء میں نکالا تھا اور ۱۹۲۷ء تک باقاعدہ شائع ہوا۔ علمی طبقے میں اسے بڑی شہرت نصیب ہوئی۔ کئی دفعہ ارادہ کیا کہ اس سلسلے کو پھر شروع کروں اور جہاں تک ارادے کا تعلق ہے اس میں اب تک کوئی فرق نہیں آیا۔ مگر کچھ نہ کر پایا۔

اس داستان کے لکھنے کے بعد مجھے اپنے ایک عزیز و محترم دوست کی تنبیہ یاد آئی۔ ذاکر صاحب پر میں نے وقتاً فوقتاً جو کچھ کہا۔ اس پر میرے ان دوست نے ایک بار مجھ سے کہا: "آپ ذاکر صاحب کے بارے میں یہ کیا اناپ شناپ لکھ ڈالتے ہیں۔ ان کے وقار کا تو لحاظ رکھا کیجیے۔ لوگ ان کے بارے میں کیا خیال کریں گے۔ آپ کو تفریح کی سوجھتی ہے لیکن ذاکر صاحب کی رسوائی ہوتی ہے۔"

میں نے عرض کیا آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر لیکن آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ نے ذاکر صاحب کے وقار کا تو لحاظ رکھا اور میرے وقار کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ آپ کے بارے میں تو مجھے معلوم نہیں کہ آپ ذاکر صاحب کے وقار کو کن باتوں پر مبنی سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک تو ان کا وقار ان ہی باتوں پر مبنی ہے جو میرے ذہن و دماغ میں میرے ارادے سے بے نیاز یا ہزاران شیوۂ دلبری بے محابا، بے حجاب آتی ہیں اور نوکِ قلم سے ٹپک

لہ ذاکر صاحب صفحہ ۶۹۔

پڑتی ہیں۔ یہ باتیں نہ میری ہیں نہ ذاکر صاحب کے لئے ہیں۔ معلوم نہیں کس کی ہیں اور کس سے ہیں۔ لیکن ہیں سب کچھ۔

رشید صاحب ڈاکٹر اصغر اور ڈاکٹر عباد الرحمٰن کے ساتھ

میں[1] ایک عرصہ سے ڈاکٹر اصغر صاحب (شعبہ نباتیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) سے ناخوش تھا اور سبب یہ تھا کہ انہوں نے میرے ساتھ کشمیر چلنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن آخر وقت میں انہوں نے وہاں جانے کا خیال ترک کر دیا۔ مجھے اس سلسلہ میں بہت زیر بار ہونا پڑا تھا اور میں نے عہد کر لیا تھا کہ جہاں تک سفر یا وعدہ وعید کا تعلق ہے مجھ کو ان سے کوئی سروکار نہ ہو گا۔ انہوں نے بہت کچھ عذر و معذرت بھی کی لیکن میں ان سے قطعاً بے زار رہا۔ بااین ہمہ بعض لوگوں کا خیال رہا کہ جو قصور میں اصغر صاحب کے سر ڈال رہا ہوں اسے خود مجھے اوڑھ لینا چاہیئے کیونکہ دراصل میں نے کشمیر چلنے کا وعدہ کیا تھا اور آخر وقت میں نے سفر سے انکار کر دیا اور وہ مجھ سے بیزار تھے اور میں نے بہت کچھ معافی مانگی لیکن انہوں نے اعتنا نہ کی۔ بہرحال اول تو میری عادت ردّو قدح کی نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اب میرے اور ان کے تعلقات نئے سرے سے شگفتہ ہوئے ہیں۔ اس لئے میں اس مسئلہ کو معرضِ بحث میں نہیں لانا چاہتا۔ لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں کہ جب ہم اور وہ نینی تال کو اپنا ممنونِ کرم بنانے کے لئے روانہ ہوئے ہیں تو تعلقات کچھ یوں ہی سے تھے۔

[2] ہم دونوں نینی تال پہنچے۔ ڈاکٹر عباد الرحمٰن خاں صاحب (صدر شعبۂ جغرافیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) پہلے سے موجود تھے۔ ہم لوگ ڈاکٹر صاحب

[1] مضامینِ رشید صفحہ ۲۳۰ [2] مضامینِ رشید صفحہ ۳۳۴، ۳۳۵۔

کے مکان پر پہنچے۔ یہ ایک عام گمراہی خلق اللہ میں چلی آتی ہے کہ جب کہیں کسی کے ہاں مہمان کی حیثیت سے جائے اور یہ یقین ہو کہ اس سلسلے میں ہم کو نہیں بلکہ صرف میزبان کو ہر قسم کے اخراجات کی زیر باری نصیب ہوگی تو پھر اپنے آپ کو مطبوع اور مقبول بنانے کے لئے ہر قسم کی کوشش کرنی لازم ہے۔ مجھ کو اور اصغر صاحب دونوں کو اس گمراہی کا علم تھا لیکن دونوں اس کو ایک دوسرے سے چھپانا چاہتے تھے۔ چنانچہ میں تو اسباب وغیرہ سے اُلجھا ہوا تھا۔ ادھر اصغر صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے چھوٹے شیر خوار بچے کو اس طور پر چمکارنا اور کھلانا شروع کیا کہ میں باوجود ایک پیشہ ور والدین ہونے کے تھوڑی دیر کے لئے دم بخود ہو گیا۔ اور معاً یہ خیال دل میں آیا کہ جھیل میں کود پڑوں لیکن جھیل دور تھی اور بچے کے نانا قریب۔ چنانچہ ایک ہی زقند بھر کر ان کے پاس پہنچا اور ایک ایسا تعظیمی آداب بجا لا کر دست بستہ کھڑا ہو گیا کہ تھوڑی دیر کے لئے دونوں ڈاکٹر مبہوت ہو گئے۔ ادھر بغل گیر ہو رہا تھا۔ ادھر بچے سے مخاطب ہو کر کافی بلند آواز میں گویا ہوا۔ بیٹے، اپنی والدہ سے میرا، میری بیوی کا اور میرے بچوں کا سلام کہنا اور یہ بھی کہنا کہ آپ کو علی گڑھ آنے کی دعوت ہے۔ ہم لوگوں کو اس مقاومت و مسابقت کا کیا انجام ہوا۔ اس کا اندازہ ہم کو سوا اس کے اور کچھ نہیں ہو سکا ہے کہ اصغر صاحب مجھ سے کچھ زیادہ اُلجھنے لگے ہیں۔ اور ڈاکٹر صاحب کا خاندان میرا معترف ہے۔ اس کی تصدیق اصغر صاحب اور عباد الرحمٰن خاں صاحب کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر اصغر، ڈاکٹر خان اور میں ایک ہی کمرے میں مقیم ہوئے۔ شیر و شکر چائے کی مانند، مجھ سے اور ڈاکٹر اصغر سے صلح ہو گئی تھی لیکن اس قسم

کی صلح جو تیاری جنگ کی تمہید ہوتی ہے۔ میں اور ڈاکٹر اصغر اپنی چارپائیوں پر دراز ہو گئے اور جب ڈاکٹر خان کو اطمینان ہو گیا کہ ہم دونوں کچھ عافیت سے رہیں گے یا رہنے دیں گے تو چپکے سے کہیں مخلِ عافیت ہونے کے لئے چل دیئے۔ شام کے وقت اٹھے تو معلوم ہوا کہ بارش اور چائے دونوں موجود ہیں۔ پورا دن اسی طور پر گذرا۔ شب میں بارش تیز ہوئی۔ صبح اصغر صاحب کو زکام اور ڈاکٹر خاں کو حرارت اور مجھ کو فرحت معلوم ہونے لگی۔

اصغر صاحب صبح کو غسل کرنے کے عادی ہیں اور میں سردیوں میں اس چیز کو غیر ضروری ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی سمجھتا ہوں۔ اصغر صاحب ہر صبح کو نہانے کے دلدادہ ہیں۔ میں کم سے کم تیسرے دن اس مسئلہ پر غور کرتا ہوں پہلی ہی صبح کو اصغر صاحب نے فرمایا اور کسی قدر طیش کے لہجہ میں کہ تم کو نہانا بھی ہوگا اور خط بنانا بھی۔ ورنہ یہاں سے چلے جاؤ۔ علی گڑھ نہ باشد۔ نینی تال ہے۔

میں نے کہا جناب، دیکھئے اصول کے تحت بحث ہونا چاہیئے۔ میں بغیر ضرورت کسی کام کا کرنا حماقت سمجھتا ہوں۔ آپ مجھے بتائیے کہ غسل کیوں کروں اور آپ کو کیوں کرنے دوں۔ غسل صرف اس لئے کیا جاتا ہے کہ جسم کی کثافت دور ہو۔ تندرستی میں ترقی ہو۔ یعنی ضرورتاً یا تفریحاً۔ ماشاءاللہ مجھے اپنی طہارت اور پاکیزگی میں کوئی خلل نظر نہیں آتا اور نہ محسوس ہوتا ہے۔ رہا تندرستی کا سوال وہ بھی اس درجہ ہے کہ اس سے ترقی کرنا ممکن ہے۔ نینی تال یا علی گڑھ کی رسوائی کا باعث ہو۔

خط بنانے کا اصول البتہ کچھ سمجھ میں آتا ہے یعنی خط بڑھا ہو یا نمایاں ہو تو عورتیں عاشق ہو نا یا ان کے اعزا و احباب چائے پلانا بند کردیں۔ عورتوں

کی طرف سے مجھے پورا اطمینان ہے جہاں تک میرا سوال ہے ان کو کبھی مجھ سے عشق کرنے کی سعادت نصیب نہ ہوئی۔ خدا ہندوستانی دواخانہ اور ہندوستانی عورتوں کو سلامت رکھے۔ ڈاڑھی جزو مناکحت قرار دی گئی ہے اور نہ جزو طلاق، بلکہ میں نے مرشد سے سنا ہے کہ ڈاڑھی عورتوں کو پسند ہے۔

یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ خط بنوانا ایک معاشرتی فعل ہے اس پر عمل کرنا ضروری ہے لیکن غسل کرنا تو قطعاً ذاتی فعل ہے . . . . اگر آپ کو اس سے اختلاف ہے تو ڈاکٹر خان سے رجوع کیجئے۔ وہ قسمت میں مجھ سے بہتر ہیں اور عقل میں آپ سے اور شکل وصورت میں مجھ سے آپ سے دونوں سے ۔ اور پھر گورنمنٹی آدمی ہیں۔ جب تک خود ان کا معاملہ درمیان میں نہ ہو ہمیشہ انصاف سے کام لیں گے۔ چنانچہ مسئلہ پیش ہوا اور جیسا کہ ایسے معاملات میں گورنمنٹ کا یہ رویہ ہوتا ہے یعنی فریقین موجود ہوں تو کمزور کو گھُڑکی اور قوی کو تھپکی۔ اور ان میں سے ایک موجود ہو تو حاضر کو تھپکی اور غائب کو صلواتیں اور دونوں غائب ہوں تو دونوں کو احمق سمجھتی ہے۔ ڈاکٹر خان نے بھی اس طریق کار کو اپنا رہنما بنایا لیکن ایک خفیف سی ترمیم کے ساتھ یعنی دونوں موجود تھے اور دونوں احمق گردانے گئے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ چونکہ ابھی ابھی وہ حرم سرا سے تشریف لائے تھے۔ اور وہاں کچھ اختلافِ آرا یا اختلافِ مقاصد کی نوبت آچکی تھی اس لئے دماغی توازن قائم نہ رکھ سکتے تھے لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کی اس غلطی یا تیور سے محاربین خاموش بھی ہو گئے۔

جب سے ہم لوگ نینی تال پہنچے تھے۔ بارش کا سلسلہ برابر قائم تھا۔ اکثر یہ ہوا کہ ہم سب کئی کئی دن مکان سے باہر نہ نکل سکے۔ اس لئے کمرہ یا

برآمدہ ہی میں بیٹھے ہوئے ڈاکٹر خان کے ماحضر پر اکتفا کرتے رہے۔ اچھا مکان، اچھا کھانا، اچھا میزبان، اچھا موسم، کوئی کام نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے اور اصغر صاحب کے درمیان کسی قدر کشاکش شروع ہو گئی۔ بات صرف یہ تھی کہ ایک دن موسم کسی قدر اعتدال پر نظر آیا۔ ڈاکٹر صاحب کو نباتات کے بعض نمونے جمع کرنے تھے اور ڈاکٹر خان کو حجری نمونے دستیاب کرنے کا شوق۔ مجھ سے فرمانے لگے کہ تم بھی چلو۔ میں نے کہا کہ مجھ کو جہاں کا تہاں چھوڑ دیجئے۔ مجھے جس نمونے کی تلاش ہے وہ جھیل کے کنارے ہی مل جاتا ہے۔ اس لئے میرا اور آپ کا ساتھ نہیں ہو سکتا۔ دونوں نے کہا کہ ہمارے ساتھ ہی چلے چلو تم بھی اپنی تلاش میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ اور یقیناً نہایت سستے داموں۔ غرض سب لوگ چلنے پر آمادہ ہوئے۔ ابھی کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ موسم کا تیور بدلا۔ اصغر صاحب کو یہ شکایت کہ میں نے چلنے میں دیر کی اور مجھ کو اس پر کوفت کہ اصغر صاحب نے ہمت چھوڑ دی۔ بہرحال ہم سب مکان کی سمت روانہ ہوئے اور راستہ بھر ایک دوسرے کو اس قدر نیک و بد سمجھاتے رہے کہ کوئی دور سے دیکھتا تو خیال کرتا کہ بعض پیشہ ور بد مذاق برج کھیل کر واپس آ رہے ہیں اور اب تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ کھیل ہی رہے ہیں۔

مکان واپس آئے تو دیکھا کہ ہمارے دوست منجھو جلوہ افروز ہیں۔ ڈھلے منجھلے بالکل فرنچ کٹ۔ کرسی پر بیٹھے سگار اس طور پر پی رہے تھے گویا ساری دنیا سے بیزار ہیں۔

میر منجھو ان لوگوں میں تھے جن کی شادی والدین کرتے ہیں اور عقدِ ثانی[1]

---

[1] مضامینِ رشید صفحہ ۲۴۳۔

دوست احباب، میر صاحب بوڑھے ہو گئے تھے لیکن بڑھاپا ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ نماز روزے سے مستغنی، عورتوں سے مایوس، اور شادی سے گریز۔ تہجد کے وقت تک جاگتے اور چاشت تک سوتے ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے اور بڑی سے بڑی مسرت پر کبھی متبسم نہ ہوتے۔

لہ ایک دن میر منجھو اور موسم دونوں متبسم نظر آئے اور تجویز یہ ہوئی کہ آج کہیں نہ کہیں ضرور چلا جائے اور عجیب بات تھی کہ باوجود اس کے کہ ڈاکٹر خاں کے ایماسے میں نے میر صاحب کو خائف یا ناراض کرنے کی کوشش کی لیکن میر صاحب پر کچھ ایسی "کروشن فیلنگ" طاری تھی کہ ایک پیش نہ گئی۔ میر منجھو کی آمادگی نے ڈاکٹر اصغر صاحب کو بھی چلنے پر اکسایا حالانکہ یہ دونوں بزرگوار پیدل چلنے اور بلندی پر چڑھنے سے اتنے ہی بیزار تھے جتنا مجھے کسی "بور" (شخصے کہ بے ارادہ مکلف باشد۔ جس کا اردو مفہوم کسی قدر بلائے جان، عافیت سوز یا مخلِ عافیت ہو سکتا ہے) سے ملنے کے لئے اٹھنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔

ہم سب ایک طرف چل نکلے۔ ڈاکٹر اصغر اور ڈاکٹر خان تو اپنے اپنے فن کی چیزوں کی تلاش اور تعریف میں انسانیت سے گذرنے لگے۔ جہاں سبزہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر اصغر سر دھننے لگتے تھے اور ایک ایک پتے اور اس کے رگ و ریشے پر راگ اور رقص کو دخل دیتے تھے۔ دوسری طرف عریاں چٹانوں کو پاکر ڈاکٹر خان اس کی ہیئت اور ماہیت حجری پر سر دھنتے تھے۔ میں نے کہا میر صاحب یہ دونوں بزرگوار تو ہاتھ سے گئے۔ اب خیریت اسی میں ہے کہ ہم دونوں بھی اپنی اپنی فکر کریں۔ اچھا ایک پان کھلائیے اور

لہ مضامینِ رشید صفحہ ۲۴۲۔

اس پل پر بیٹھ جائیے۔ دیکھئے نیچے کتنا تاریک اور گہرا غار ہے اور غار کی تہہ میں کیا کچھ نہ ہوگا۔ آپ کچھ بتا سکتے ہیں کہ اگر ہم دونوں اس میں کود پڑیں تو پہلے کون شخص زمین پر پہنچے گا۔ میر صاحب نے فرمایا اور کون مسخرا اس میں کودے گا۔ میں نے کہا کودنے میں کیا لگتا ہے۔ فرض کیجئے آپ ہی کو کودنا پڑے۔ میر صاحب نے کچھ غصہ اور کچھ تحیّر میں آکر جواب دیا۔ کودنا پڑے؟ میں کب آمادہ ہوں۔ میں نے کہا آمادہ تو میں بھی نہیں ہوں لیکن یہ میرا ذمہ ہے کہ میں آپ کو کودنے پر مجبور کردوں گا۔ میر صاحب پل پر سے نیچے اُتر آئے اور فرمایا اب کہو۔ میں نے کہا جب میں ایک کہوں تو آپ توبہ استغفار کر لیجئے گا۔ دو کہوں تو آنکھیں بند کر لیجئے گا اور تین کہوں تو کود پڑیئے گا اور پھر جی چاہے تو آنکھیں بھی کھول لیجئے گا۔ فرمایا یہ سب کیوں؟ اور میں کیوں ماننے لگا؟ میں نے کہا اور میں جو مسمریزم جانتا ہوں۔ یہ میرا ہی تصرف تھا کہ آپ پل سے نیچے اتر آئے۔ یہ تو میرا ادنیٰ تصرف تھا اگر پوری توجہ کرتا تو آپ پل کی دوسری طرف اترتے۔ اور یہ تو صاف معلوم ہو رہا ہے کہ آپ توبہ استغفار کی نیت کر رہے ہیں۔ "اچھا ایک"۔ یہ کہنا تھا کہ میر صاحب یک لخت چونک پڑے۔ کیونکہ نیچے سے ڈاکٹر خان نے آکر ان کی آنکھوں پر اپنی انگلیاں جما دی تھیں۔ بالآخر یہ طے پایا کہ اب کوئی شخص ایسی حرکت نہ کرے گا جس سے اس کا ذوقِ علم وغیرہ ظاہر ہوتا ہو۔

چنانچہ ہم سب ایک طرف چل نکلے۔ راستہ تقریباً مسطح، موسم خوشگوار اونچی اونچی سرسبز چوٹیاں، اچھلتے، بل کھاتے، رقص کرتے ہوئے شفاف چشمے، یا فرہاد کا خواب شیر و شیریں۔ ہم لوگ کئی میل تک باتیں کرتے

چلے گئے۔ جن کی شادی ہوگئی تھی وہ بیویوں سے دور رہنے پر مطمئن جن کی نہیں ہوئی تھی وہ نہ کرنے پر پشیمان۔ کہیں بیٹھے، کہیں بھٹکے، نا کہیں بھٹکے، ایک طرف سے بخارات ابھر اٹھے۔ دیکھتے دیکھتے ساری وادی تاریک اور نمناک ہوگئی۔ طے یہ ہوا کہ اب جلد سے جلد واپس ہونا چاہیئے۔ اصغر صاحب کو ایک گھوڑا مل گیا اور ہم لوگوں کا کیونکہ چڑھائی کا راستہ مختصر تھا اس لئے طے یہی پایا کہ زیادہ محنت اور مختصر راستہ قابلِ ترجیح ہے۔ کچھ ہی فاصلہ طے کیا گیا تھا کہ بارش شروع ہوئی۔ اصغر صاحب جا چکے تھے۔ میں میر منجھو اور ڈاکٹر خان رہ گئے تھے۔ کسی کے پاس نہ چھتری تھی اور نہ واٹر پروف۔ سب نے بھیگنا اور میر منجھو نے ہانپنا اور کوسنا شروع کیا۔ طے پایا کہ اگر میر منجھو کے ہم دوش و ہم عناں رہے تو دو قدم بھی چلنا دشوار ہوگا۔ اس لئے میر منجھو چھوڑ دیئے گئے۔ ڈاکٹر خان بڑھتے چلے گئے۔ میں نے سوچا اگر میر منجھو چھوڑ دیئے گئے تو ممکن ہے کہیں کبھی ایسی حرکت پر نہ آمادہ ہو جائیں جو نقصانِ مایہ و شماتتِ ہمسایہ کا موجب ہو۔ اس لئے میں کچھ آگے بڑھ کر ٹھہر گیا۔ تھوڑی دیر میں میر منجھو بھی آکر مل گئے۔

فلیٹ پر آئے تو میر صاحب کو برابر خیال رہا کہ لوگ دیکھ کر کیا کہیں گے۔ میں نے کہا میر صاحب یہ تو نینی تال ہے اور اس قسم کے حادثات آئے دن یہاں لوگوں کو پیش آتے ہوں گے۔ مردوں سے تو کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ آخر ہم آپ یہاں کے کس مرد سے کم خوبصورت، توانا، یا آبرو باختہ ہیں؟ رہیں لیڈیاں تو وہ ایک دفعہ آپ کو دیکھ کر ہنس تو ضرور پڑیں گی لیکن بعد میں ضرور خیال کریں گی کہ ہم کتنے جری

اور جفاکش ہیں کہ اس ابتلا و مصیبت میں بشاش چلے جا رہے ہیں۔
اور ہاں وہ قصہ تو آپ کو معلوم ہو گا۔ شیریں فرہاد۔ ۔ ۔

ڈاکٹر خان نے یہاں پہنچ کر مجھے تیور سے ڈانٹا کہ میں بھی چپ ہو گیا اور میر صاحب سہم گئے۔

گھر پہنچے تو بچوں نے تالیاں بجائیں۔ نوکروں نے انگیٹھیاں سلگائیں۔ کپڑے تبدیل کئے گئے۔ کھانا کھایا گیا۔ چارپائی پر دراز ہوئے۔ میر منجھو کو نیند نے جھیل میں اور اصغر صاحب کو برلن پہنچا دیا۔ بیداری میں ڈاکٹر خان "اندرونِ خانہ" پہنچے۔ میں نے خطوط کی طرف رخ کیا معلوم ہوا کہ بیوی ہسپتال میں اور بچے مکان پر ہیں اور بچوں کے نانا زیرِ اپریشن سب کو جواب لکھے۔ بیوی کو لکھا میں دوسری شادی ہرگز نہ کروں گا اور نہ یہاں اس نیت سے آیا ہوں۔ بچوں کو لکھا تم لوگ اماں بی کو پریشان نہ کرو گے تو پڑھنے لکھنے سے ہمیشہ کے لئے آزاد کر دیئے جاؤ گے۔ ان کے نانا میاں کو لکھا رضیٔ مولا از ہمہ اولیٰ۔ یہاں تبدیلیٔ آب و ہوا کی غرض سے آیا تھا لیکن آب و ہوا کی کچھ ایسی کثرت ہو گئی ہے کہ بیوی بچوں تک پہنچنا دشوار ہو رہا ہے۔

علامہ اقبال سے رشید صاحب کی پہلی ملاقات اور اس کے تاثرات

۱۹۲۵ء میں علامہ اقبال مرحوم سے ملنے لاہور گیا تھا۔ اقبال کے کلام میں جو باتیں بچپن کے تجسس میں دلچسپ معلوم ہوتی تھیں۔ اب تجزیہ و تجربہ کی زد میں ناقابلِ فہم معلوم ہونے

لے گنج ہائے گرانمایہ صفحہ ۱۷۴

لگی تھیں۔ میں صرف پڑھنے اور اپنے طور پر لطف لینے کی منزل سے گذر چکا تھا۔ اب پڑھانے کو پر فکر و پرلطف بنانے کا فرض عائد ہوتا تھا۔ شعر میں شاعر غالب نظر آتا تھا اور ہر دل آویزی تاثرات پر ہی نہیں بلکہ فکر و تجربہ کی صحت و صداقت پر منحصر معلوم ہوتی تھی۔ یہ وہ مرحلہ تھا جہاں میں نے محسوس کیا کہ خود شاعر کو دیکھا جائے۔ اس کی وجہ اشعار بینی سے نہیں بلکہ اس کی شخصیت سے بھی ربط پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ شاعر اپنی ترنگ میں جو چاہتا ہے کر دکھاتا ہے۔ یہ تو نسبتاً آسان ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کے ترنگ یا تذبذب سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہی جذبات کی ترجمانی کر سکتا ہے یا دوسروں کی تشنگی بھی۔ غالباً دن کے نو دس بجے ہوں گے۔ میں مرحوم کی کوٹھی پر پہنچا۔ سیاہ عقدہ (بو)، باندھتے کالر درست کرتے ہوئے برآمد ہوئے۔ گٹھا ہوا جسم، چوڑی چکلی ہڈیاں، مردانہ انداز، آنکھوں کی ساخت اور مونچھوں کی وضع کس قدر تورانیوں جیسی۔ بڑی خوش دلی اور شفقت سے ہاتھ ملایا اور کس قدر دیر تک ہاتھ میں ہاتھ لئے رہے۔ بھاری بھر کم لہجہ میں بولے "آپ ہیں جی صدیقی صاحب"۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ مرحوم کا ڈیل ڈول اور ان کا حلیہ دیکھ کر متحیر اور مرحوم کے انداز تخاطب اور لہجہ سے کسی قدر دل گرفتہ ہوا۔ اتنے میں نوکر کو آواز دی اور پنجابی میں قلم لانے کو کہا۔ قلم کا تلفظ سن کر میں گھبرا اٹھا۔ علی گڑھ میں پنجابی تلفظ سے آشنا ہو چکا تھا۔ لیکن ذہن میں معلوم نہیں کیوں یہ بات جم گئی تھی کہ ڈاکٹر اقبال اس طرح کی معذوریوں سے مستثنیٰ ہوں گے۔

لیکن میں کیا بتاؤں کہ اپنی پہلے سے بنائی ہوئی بہشت کو یوں درہم برہم ہوتے دیکھ کر مجھ پر جو اثر جس درجہ ہونا چاہیئے تھا وہ نہ ہوا۔ مرحوم کچھ اس

انداز سے ملے اور اب میں محسوس کرتا ہوں کہ خود ان کے تلفظ میں کچھ ایسا خلوص اور ان کے ہاتھ ملانے میں وہ شفقت اور ناقابل بیان مروت و مرحمت تھی کہ میں سب کچھ بھول گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ اقبال ایسے نہ ہوتے تو کچھ نہ ہوتا۔ جیسے ایک نیا تجربہ، بڑا اچھا تجربہ حاصل ہوا جس کا میں مستحق ضرور تھا۔ گو اس کا منتظر نہ تھا۔ جیسے مجھے کوئی نئی حس تفویض ہوئی جس کو چھین لیا جاتا تو میں کوئی بڑی کمی محسوس کرنے لگتا۔

رشید صاحب اردو کے بارے میں شروع ہی سے ایک خاص نظریہ رکھتے تھے۔ وہ دہلی اور لکھنؤ کے چکر میں کبھی نہیں پڑے۔ وہ اردو کے لب و لہجہ پر خاص زور دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی شخص کا دلی یا لکھنؤ کا ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ اہل زبان ہے اور تمام اردو بولنے والوں پر افضلیت رکھتا ہے بلکہ اس کے لب و لہجہ پر بھی نظر رکھنی چاہیئے۔ صحت زبان کے لئے لب و لہجہ کا شستہ ہونا بہت ضروری ہے۔ سرسید، حالی مولوی عبدالحق کی اردو کو دلی اور لکھنؤ کے اقدار سے نہیں جانچا جاتا ہے بلکہ ان کی زبان کی اہمیت اس بنا پر ہے کہ اس میں ہر طرح کے خیالات و جذبات سلیس، عام فہم طور پر ادا ہوئے ہیں اور ادا کئے جا سکتے ہیں۔ رشید صاحب اردو کو زبان کے علاوہ ایک قیمتی ورثہ، ایک قابل قدر روایت، ایک نادر آرٹ، ایک مسحور کن نغمہ اور بہت کچھ سمجھتے تھے۔ اپنے ان خیالات کا انہوں نے اپنی تحریروں میں کئی جگہ ذکر کیا ہے۔

اردو کے بارے میں ان کا نظریہ | میرے[1] نزدیک کسی شخص کا دلی

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۷۸۔

یا لکھنؤ کا ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کا اُردو کا لب و لہجہ بھی معیاری ہو گا۔ گفتگو میں صحتِ زبان ہی کافی نہیں ہے۔ لب و لہجہ کا شُستہ ہونا بھی ضروری ہے۔ بحیثیتِ مجموعی اُردو لب و لہجہ کے لوازم ایسے ہیں کہ ان سے عہدہ برآ ہونا یوں بھی آسان نہیں ہے۔ بتوں کی مانند اُردو لب و لہجہ کے بھی ایسے کتنے شیوے ہیں جن کو اب تک نام نہیں دیا جا سکا ہے۔ زبان[1] نہ اپنے حسب نسب کے اعتبار سے ترقی کرتی ہے نہ زبان کے بے وقوف دوستوں کے حسب نسب سے۔ وہ ترقی کرتی ہے بولنے اور لکھنے والوں کی ہر طرح کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت ہے۔

ہم میں سے کسی کو اس بات کا علم نہ ہو گا کہ تقریباً پچھلے سو سال سے اچھے اُردو نگار کی پہچان ہی یہ رکھی گئی ہے کہ وہ ہر طرح کے خیالات و جذبات کو سلیس، عام فہم اُردو میں ادا کر سکتا ہو۔ سب سے پہلے یہ صفت غالبؔ میں۔ اس کے بعد سرسید میں پھر حالیؔ ہیں۔ ان کے بعد مولوی عبدالحق میں پائی اور سراہی گئی۔ اس کے برخلاف خطیبانہ یا شاعرانہ اسلوبِ بیان کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا اور اتنی سی بات بتانے کے لئے غالباً کسی پیغمبر کی ضرورت نہ محسوس کی جائے گی کہ سہل و سلیس اُردو اگر کسی زبان سے سب سے زیادہ قریب ہے تو وہ ہندی ہے اور جن زبانوں سے دور ہے وہ فارسی اور عربی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہندی خود سلیس و سہل اُردو سے نہیں سہل و سلیس ہندی سے بھی دور بہت دور چلی جا رہی ہے۔

صحیح[2] یا غلط اور معلوم نہیں کیوں اور کب سے یہ بات میرے دل میں بیٹھ

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۱۲۴ - ۱۹۳۔

[2] آشفتہ بیانی میری صفحہ ۴۷۔

گئی تھی کہ زبان کے علاوہ اُردو بہت کچھ اور بھی ہے۔ جب ایک قیمتی ورثہ ایک قابلِ قدر روایت، ایک نادر آرٹ، ایک مسحور کن نغمہ، قابلِ فخر کارنامہ، کوئی پیمانِ وفا یا اس طرح کی کتنی اور باتیں جو محسوس ہوتی ہیں لیکن بیان نہیں ہو پاتیں۔ چنانچہ کسی کو غلط اُردو بولتے سنتا تو سمجھتا کہ بولنے والا قابلِ اعتنا نہ تھا یا کسی معذوری میں مبتلا ہے تو ہماری ہمدردی کا مستحق ہے۔ رفتہ رفتہ جب یہ دیکھنے میں آیا کہ اُردو پر طرح طرح کے الزامات لگائے جا رہے ہیں اور اس کو زک پہنچانے اور ختم کر دینے کے اہتمام ہو رہے ہیں تو معلوم نہیں کتنے حجابات آنکھوں کے سامنے سے دور ہو گئے۔

ابتداء میں کالج میں دوسری بات جو عجیب معلوم ہوئی یہ تھی کہ لوگ آپس میں مل بیٹھتے تو اکثر اس پر فخر یا رشک کرتے کہ فلاں صاحب شاعر ہیں یا فلاں شخص بڑی اچھی اُردو بولتا ہے۔ میں نے جون پور میں اس کثرت سے شاعر دیکھے تھے کہ سمجھنے لگا تھا کہ ہر اُردو داں شاعر ہوتا ہے اور جو نہیں ہوتا وہ میرا ہی جیسا گیا گزرا ہوتا ہے ــــــ شاعر ہونا ایسی کوئی بات نہیں ــــــ آخر اس پر تعجب کیوں کیا جاتا ہے کہ فلاں شخص اچھی اُردو بولتا ہے۔

ایک دن مولانا سہیل سے جو ابتدا سے میرے "نگہبان فرشتہ" کی حیثیت اختیار کئے ہوئے تھے۔ اپنے پروسے بیان کئے۔ بولے۔ ارے بھائی، ٹکسالی اُردو ہمارے دیار میں کیا لکھنؤ تک میں نہیں بولی جاتی۔ ہم سب تو کتابی اُردو بولتے ہیں۔ رہا شعر و شاعری کا معاملہ تو یہ کچھ جون پور ہی پر موقوف نہیں۔ ہر جگہ اس کی گرم بازاری ہے۔ لیکن یہ لازم نہیں کہ جو شخص اُردو کا شاعر ہو وہ صحیح اور اچھی اُردو بھی بول سکتا ہو۔

رشید صاحب تعلیمی دور میں طلبا کے عملی سیاست میں ملوث ہونے کو بہت برا سمجھتے تھے۔ درس گاہ کو وہ اس سے پاک صاف دیکھنا چاہیئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ طلبا کو پڑھنے، لکھنے، کھیلنے، کودنے، جسمانی طور پر اور تحریر و تقریر میں اپنی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے علاوہ اور کسی چیز سے سروکار نہ ہونا چاہیئے۔ ۱۹۱۵ء میں جب وہ علی گڑھ میں داخل ہوئے تو اس وقت اور اس کے بعد عرصہ تک مادرِ درس گاہ کا ماحول یہی رہا۔ اس زمانہ کو وہ علی گڑھ اور علیگڑھ والوں کی تمکنت و جلال کا زمانہ لکھتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد غالباً "۳۴-۱۹۳۵ء کے بعد علی گڑھ میں تبدیلی آئی اور وہ سیاست کا اکھاڑا بن گیا۔ اس پر وہ اپنی تحریروں میں افسردہ اور مغموم نظر آتے ہیں۔

علیگڑھ میں طلبا کے اندر سیاست کے داخل ہونے پر حزن و ملال

پھر[1] علی گڑھ پر ایک وقت ایسا آیا جب سیاست نے مذہب سے یا مذہب نے سیاست سے رشتہ جوڑ کر یہاں کی فضا کو اس قابل نہ رکھا کہ علم و ادب کی تحصیل و تحقیق اور سچائی کی جستجو کے ساتھ نوجوانوں کو صالح و صحت مند اقدار کو اپنانے اور پھیلانے کی تلقین کی جاسکتی یا تربیت دی جاسکتی اور اس ادارے کی بیش بہا روایات کو زیر و زبر ہونے سے بچایا جاسکتا۔ یہ حکایت بالکل لطیف نہیں ہے اس لئے اس کو پھیلا کر بیان کرنے کی ایسی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میرے جگر میں سارے جہاں کا درد کبھی نہیں رہا۔ میں[2] بذاتِ خود کچھ "مقامی" آدمی واقع ہوا ہوں۔ "آفاقی" یا "ماورائی"

ا۔ آشفتہ بیانی میری صفحہ ۸۱۔ ۲۔ آشفتہ بیانی میری صفحہ ۱۲-۸۳۔

قسم کا ہونے کی نہ صلاحیت رکھتا ہوں نہ حوصلہ نہ ہوس۔ میرے حوصلہ یا ہوس کی دنیا تو بہت محدود رہی۔ میں تو کھیل کود کر، ہنس بول کر، آس پاس کے اپنے پرائے کے دکھ سکھ میں شریک ہو کر زندگی گذار دینا چاہتا تھا اور یقین سا آ چکا تھا کہ اس طرح کی زندگی علی گڑھ میں رہ کر یا علی گڑھ کے لئے بسر کر سکوں گا۔ لیکن ایک ایسا وقت آیا جب ناعاقبت اندیشی اور بے راہ روی کے ایسے مظاہرے دیکھے کہ غم و غیرت سے بے قرار ہو گیا۔ اس کا ذکر ضروری تھا اس لئے کہ اس حادثے نے میرے ذہن اور اسلوبِ تحریر کو بھی اس طرح متاثر کیا کہ میں اس پر فخر نہیں کر سکتا۔ اقبال کا مشہور مصرعہ مجھے اکثر یاد آتا ہے۔

ع جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

سوچتا ہوں کہ دین اور سیاست کو ایک دوسرے سے جدا رکھنے پر جس چنگیزی کا سامنا ہو گا وہ قابلِ قبول ہے۔ یا دین کو سیاست سے جوڑنے میں جس چنگیزی کا سابقہ ہو گا وہ قابلِ ترجیح ہے۔

رشید صاحب علی گڑھ میں اپنے وقت کے اچھے کھلاڑیوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ بچپن اور اسکول کے زمانے ہی سے ان کو ہاکی، کرکٹ وغیرہ کھیلوں کا شوق رہا اور بقول ان کے کھیلنے کا شوق ہی انہیں علی گڑھ لایا۔ کرکٹ انہیں بہت پسند تھا لیکن جس زمانے میں وہ علی گڑھ آئے وہ زمانہ علی گڑھ کا کھیل کے لحاظ سے بھی تمکنت و جلال کا تھا۔ اس لئے ان کو کرکٹ کے بجائے ٹینس کی طرف توجہ دینی پڑی۔ ان کی تحریروں میں اکثر اس کا ذکر ملتا ہے اور جہاں ملتا ہے وہاں ایک عجیب بے ساختگی اور والہانہ پن پایا جاتا ہے۔

کھیل سے غیر معمولی شغف اور علیگڑھ کے کھیلوں کے معیار پر فخر

اسکول[1] میں کرکٹ، ہاکی، فٹبال کا کیپٹن رہا۔ لکھنے پڑھنے سے کہیں زیادہ میرا دل ان میں لگتا تھا۔ میں دراصل علی گڑھ میں اتنا پڑھنے کے شوق میں نہیں آیا تھا جتنا علی گڑھ کے کھیل، نیز اس کی عام وقعت اور وقار کا چرچا سن کر۔ لیکن میں آیا ایسی ناکسی اور بے بسی کے عالم میں تھا اور وہ زمانہ علی گڑھ اور علی گڑھ والوں کی ایسی تمکنت وجلال کا تھا کہ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال میں میرا کوئی پُرسانِ حال نہ ہوا۔ ناچار میں نے ٹینس سیکھنی شروع کی اور کچی پارک میں چارپائی ٹینس کلب کا ممبر ہو گیا۔ جال کے بجائے چارپائی کھڑی کر لی جاتی تھی اور کچی پارک کے سامنے ریت سے اٹے ہوئے میدان پر لوٹے سے پانی ڈال کر کورٹ بنا لیا جاتا تھا۔ ممبر ہر وہ شخص ہو سکتا تھا جس کے پاس چارپائی اور سیکنڈ ہینڈ گیند ہو۔ آنریری ممبر وہ ہو سکتے تھے جو بیت الخلاء (جس کا نام اس زمانے میں برسر افس بھی تھا) جاتے اور وہاں سے آتے وقت کورٹ کی مٹی اور روندی ہوئی لائن پر پانی ڈال کر اسے پھر سے نمایاں کر دیں

یہ کھیل[2] ہی کا تصرف تھا کہ مجھ میں جو اچھی صلاحیتیں تھیں وہ برگ وبار لائیں اور جو کمزوریاں تھیں وہ ختم نہیں ہو گئیں تو اُبھرنے بھی نہیں پائیں۔

میری[3] طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ میں کرکٹ کے بڑے زبردست میچ ہوئے۔ چار سال تک مسلسل علی گڑھ کی فیلڈ پر علی گڑھ کی جیت ہوئی۔ ۱۹۱۵ء سے پہلے کرکٹ کا ریکارڈ اس سے بھی زیادہ شاندار رہا تھا۔

1۔ سہیل کی سرگذشت صفحہ ۱۳ ۔ 2۔ آشفتہ بیانی میری صفحہ ۳۴

3۔ آشفتہ بیانی میری صفحہ ۸۸ - ۹۱ - ۹۲ -

یہ آرزو بہت دنوں تک رہی اور اب بھی کچھ کم نہیں کہ علی گڑھ کرکٹ کی پوری داستان مرتب کرلی جائے تو بڑا اچھا ہو۔ کرکٹ میچ کا اجتماع کتنا ستھرا اور شاندار ہوتا تھا۔ ہر طالب علم یونیفارم میں ملبوس ہوتا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کلاس میں کسی تقریب میں یا ہوسٹل سے باہر کسی طالب علم کا بغیر یونیفارم کے پایا جانا ناممکن تھا۔ یہ بات علی گڑھ میں اس درجہ عام تھی اور ایسی سختی سے اس کی پابندی کی جاتی کہ اگر کسی موقع پر اپنے ہی کسی ساتھی کو کسی دوسرے لباس میں اچانک دیکھ لیتے تو جھجک جاتے تھے کہ وہی تھا یا کوئی اور کالج کے کرکٹ فیلڈ یا کرکٹ نٹ پر جس طرح کے آداب ملحوظ رکھے جاتے تھے وہ صرف علی گڑھ کا حصہ تھا۔ . . . اور یہ کچھ کھیل کے میدانوں ہی پر موقوف نہ تھا بلکہ یونین ڈائننگ ہال، مشاعرے وغیرہ میں بھی کم وبیش اسی طرح کا نظم ملتا تھا۔

اس سلسلے میں ایک واقعے کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ علی گڑھ کی ٹینس ٹیم میچ کھیلنے باہر گئی۔ میچ ایک مشہور کالج کی ٹیم سے تھا۔ اتفاق یہ کہ جن کھلاڑیوں کے ساتھ میچ ہونے والا تھا وہ ٹینس کے یونیفارم میں نہ تھے۔ جو اس زمانے میں سپید فلالین یا زین کا پتلون اور سفید ہی فلالین یا ٹوئل کی قمیص پر مشتمل تھا۔ علی گڑھ کی ٹیم کے ایک کھلاڑی نے اس بنا پر کھیلنے سے انکار کر دیا کہ مقابل کے کھلاڑی مناسب یونیفارم میں نہ تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ وہ اس کو گوارا نہیں کر سکتے کہ علی گڑھ ایسی کسی جگہ یا ٹیم کے ساتھ ٹینس کھیلے جہاں ٹینس کا احترام ملحوظ نہ رکھا جاتا ہو۔ بڑی مشکلوں سے اس نزاکت پر قابو پایا گیا۔[۱]

۱؎ آشفتہ بیانی میری صفحہ ۸۸-۹۱

علی گڑھ کی امتیازی خصوصیت اس کے طلبا کا درسی تعلیم کے ساتھ تحریر و تقریر میں بھی کمال حاصل کرنا تھا۔ کھیل کے میدانوں میں بھی یہاں کے طلبا ہمیشہ دوسری تعلیم گاہوں اور اداروں سے ممیز رہے۔ رشید صاحب کا ایک بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے علی گڑھ کی تمام خوبیوں کو اپنایا اور اس کی تمام امتیازی خصوصیات سے بہرہ ور ہوئے۔ تحریر میں جہاں صاحب طرز ادیب اور بے مثال طنز نگار تھے۔ وہاں یونین کے اچھے مقررین میں بھی ان کا شمار ہوتا تھا۔ کھیل کے میدان میں بھی اور خاص کر ٹینس میں وہ اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ کالج یونین سے ان کو جو محبت تھی اس کی جھلک ان کی اکثر تحریروں میں ہمیں ملتی ہے۔

کالج یونین کی اہمیت اور اس سے متعلق ان کے تاثرات

[1] کھیل کے بعد کالج کی زندگی میں یونین کو بڑا دخل تھا۔۔۔ جس عہد کا ذکر کر رہا ہوں اس میں، انگریزی کے سب سے اچھے مقرر ذاکر صاحب اور اُردو کے مولانا سہیل تھے اور دونوں زبانوں میں ذاکر صاحب . . تقریر کے کیسے کیسے معرکے ان دونوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں سر کئے۔ جب اچھی تقریر کرنا قطع نظر اور باتوں کے بہت بڑا اور اتنا ہی مشکل فن سمجھا جاتا تھا۔ اور خود کالج میں اچھی تقریر کرنے والے کافی تعداد میں موجود تھے۔ کالج اور یونیورسٹیوں میں طلبا کی یونین کو جو حیثیت آج کل حاصل ہے وہ پہلے نہ تھی۔ نیز طلبا نے جو مسائل اب اپنا لئے ہیں اور کون ایسے مسائل ہیں جو اپنانے

---

[1] آشفتہ بیانی میری ص ۹۸ - ۱۰۲

سے رہ گئے ہیں ان کی طرف پہلے کبھی وہ اس درجہ مائل نہ تھے۔ اس پر نہ ماتم کرنے کی ضرورت ہے نہ فخر اور جس بات پر ماتم کرنا لازم آتا ہو نہ فخر اس پر غور کرنا بھی کچھ اتنا ضروری نہیں رہ جاتا۔ یہ زمانے کے نشیب و فراز ہیں جن سے ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے

سبھی سازِ دستینز کرتے آئے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ کہنا یہ تھا کہ اس زمانے کی یونین سے کس طرح کے کردار نمو پاتے تھے اور زندگی اور شعر و ادب میں ان کا کیا مقام ہوتا تھا اور اب کس طرح کے کردار ابھرتے ہیں اور زندگی میں کیا مرتبہ حاصل کرتے ہیں۔

پہلے زمانہ میں طلبا سیاسی اور مذہبی لیڈروں کے ہاتھ میں اتنے نہ تھے جتنے اب ہیں۔ گو اس بارے میں خود لیڈر کچھ اس طرح فریاد کرتے پائے گئے ہیں کہ ؎

چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

اور اکثر دیکھنے میں بھی یہ آیا ہے کہ جس "بار" نے لیڈر پر بھی گرانی کی اس کو یہ "ناتواں" (طالب علم) اٹھا لیتے ہیں۔ یونین کے وائس پریذیڈنٹ (اب پریذیڈنٹ) کا درجہ کرکٹ کیپٹن اور اچھے مقرر کی حیثیت سے فرسٹ الیون کے اچھے کھلاڑیوں کے برابر ہوتا ہے۔

ایک[1] واقعہ کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علی گڑھ کے طلباء کی سیرت و شخصیت کا اثر یونین اور یونین کا طلبا پر کتنا گہرا تھا۔ یونین کے الکشن میں اس شخص کا ناکام رہنا یقینی تھا جو اپنی ذاتی قابلیت یا

---

[1] آشفتہ بیانی میری صفحہ ۱۰۱۔

اچھی سیرت کے سوا کسی اور سہارے کا متلاشی ہوتا۔ یہ تقریباً ناممکن تھا کہ کوئی شخص محض اس بنا پر منتخب ہو جائے کہ وہ ہندو، مسلمان، شیعہ، سنی، پنجابی یا کسی ذی اقتدار طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ میں کالج میں داخل ہوا تو ایک الکشن کا بڑا چرچا تھا۔ جو کسی رئیس کے روپئے، اثر و اقتدار سے جیتا گیا تھا۔ اس کا ردِ عمل ایسا ہوا کہ پھر امرا کے طبقے سے کوئی امیدوار کابینہ تک کے لئے منتخب نہ ہو سکا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس طبقے کا کوئی فرد یونین کے عہدے کے لئے کھڑا ہوتا تو سب سے پہلے اسے "ترکِ نسب" کا اعلان کرنا پڑتا۔

ان باتوں کے اظہار سے یہ ثابت کرنا مقصود نہیں کہ اس زمانے میں یونین کا الکشن، بے عنوانیوں سے پاک ہوتا تھا۔ زندگی کی کوئی خوبی یا خرابی ایسی نہیں ہے جو تمدنی زندگی کے پہلے دن سے آج تک کسی شکل میں کسی نہ کسی حد تک چھپی یا کھلی ہر جگہ موجود نہ ہو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس زمانے میں ان بے عنوانیوں کی نوعیت ایسے فضیحتے سے پاک ہوتی جن سے ادارہ یا قوم کی نیک نامی پر حرف آتا ہو۔ بحیثیت مجموعی، میں اس درس گاہ کی صحت مند یا غیر صحت مند فضا کی نشانی اس میں تلاش کرتا ہوں کہ یونین کے الکشن میں امیدوار کس چیز کا سہارا پکڑتے اور کامیاب ہوتے ہیں۔ اپنی ذہنی اور اخلاقی برتری اور ادارے کی علمی اور اخلاقی منزلت کا، یا مذہب و مسلک کے اختلافات اور ذاتی یا بیرونی اغراض کی حمایت کا۔ ظاہر ہے ان دونوں میں بہتر صورت کون سی ہے۔

"یونیورسٹی کے بروئے کار آنے کے ساتھ ہی اثر و اقتدار کے لئے اعیان و اکابر میں کچھ اس طرح کی آویزش شروع ہوئی کہ کسی کو یونیورسٹی

کی بہتری و ناموری کا دھیان تک نہ رہا۔ طرح طرح کی خرابیاں پھیلیں ... اس سے یونین بھی متاثر ہوئی۔ اعلیٰ علمی مباحثوں کی جگہ سیاسی اور وقتی مسائل ومناقشے پر ریزولوشن پاس کرنا اس کا کام رہ گیا۔ یونین کے اراکین اچھے مباحثے ترتیب دینے اور یونین کے صحت مند تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے سیاسی لیڈروں کو تشریف آوری کی دعوت دیتے ان کو لائف ممبر بناتے اور ان کی آنکھ کا تارا بننے کے لئے آپس میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں سرگرداں رہنے لگے۔

ضمناً یہاں ایک تبدیلی کا ذکر کروں گا۔ کالج کے زمانے میں اور اس کے کچھ دنوں بعد تک یونین میں کسی مہمان کا خیر مقدم کیا جاتا تو تلطف و تکریم کے اچھے سے اچھے اور زیادہ سے زیادہ کلمات مہمان کے لئے کہے جاتے، ان باتوں کا ذکر لطف و احترام سے کیا جاتا جن سے مہمان کا تعلق خاص ہوتا۔ مہمان کی پذیرائی کا مفہوم یہ ہوتا کہ اس کی عزت اپنی عزت، اس کی خوشی اپنی خوشی اور اس کی خفت اپنی خفت تھی۔ اپنے بارے میں جو کچھ کہتے اس میں انکسار اور وقار ہوتا اور تقریب بہت مختصر ہوتی۔

شریف گھرانوں میں کوئی مہمان آتا ہے تو ہم سب جانتے ہیں کہ مہمان کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے لیکن رفتہ رفتہ یونین کا یہ رنگ نظر آنے لگا کہ مہمان کوئی ہو، موقع کچھ ہو، مہمان کا خیر مقدم "در مدح خود می گوید" کے رزمیہ اور بزمیہ سے کیا جانے لگا۔ وہ بھی اس عزہ اور عزلیہ سے جیسے زمانہ قدیم کے میدانِ جنگ میں ایک طرف کا پہلوان دوسری طرف کے پہلوان کو دعوت ضرب دے رہا ہو۔ دوسرا پہلوان غریب مہمان ہوتا ہے۔ چنانچہ یونین میں مہمان کی پذیرائی، خودستائی اور خودنمائی کا صلہ بن گئی۔

اکثر یہاں تک دیکھنے میں آیا کہ سامعین مہمان سے زیادہ میزبان یا میز بانوں کی گرمئ گفتار سے مستفید ہوتے رہے۔ ظاہر ہے خود ستائی اور خود نمائی اس شخص یا جماعت کا شیوہ ہوتا ہے جسے اس عیب کے سوا کسی دوسرے ہنر کا سہارا نصیب نہیں ہوتا۔ تقسیم ملک کے بعد شکر ہے کہ یونین کا یہ دور جلد ہی ختم ہو گیا اور وہ اپنی دیرینہ قابلِ قدر روایات کی پیروی پر مائل ہو گئی ہے۔

یونین کے بارے میں ابھی جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان پر کُڑھنا بے سود ہے۔ کُڑھنا یوں بھی اچھا نہیں۔ زندگی اور زمانے کے طور طریقے ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بعض امور اور ادارے ایسے ہوتے ہیں جن میں تبدیلی آتی تو ہے لیکن بہت دیر میں اور آہستہ آہستہ۔ ان کی خوبی اور قدر و قیمت کا راز بھی یہ ہے کہ وہ دیر میں تبدیلی قبول کرتے ہیں۔ اسی ذیل میں یونیورسٹی اور یونین آتے ہیں جہاں ان روایات اور اقدار کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے۔ جو ہماری قومی سیرت کا سنگِ بنیاد ہوتے ہیں۔ یہ روایات اور اقدار بہت دنوں میں ظہور پاتی ہیں۔ اس لئے بہت دیر تک قائم رہتی ہیں اور قائم رکھی جاتی ہیں۔ دوسری طرف سیاست کا کاروبار ہے جہاں ہر طرح کی تبدیلی ہر آن رونما ہوتی ہے۔ اس طور پر یونیورسٹی اور سیاست کا اتحاد بے جوڑ اور ناواجب مانا گیا ہے لیکن آج کل کوئی ایسی سرگرمی دیکھنے میں نہیں آئی جس کا دور کا یا نزدیک کا رشتہ سیاست سے نہ ہو۔ بالخصوص ادنیٰ سیاست سے۔

"آج سے پہلے یونین کا اعلیٰ مقصد تعلیمی، تفریحی اور تہذیبی تھا اور وہ ایک طور پر یونیورسٹی یا کالج میں تعلیم پانے والوں کی تربیت گاہ بھی تھی اور

تفریح گاہ بھی۔ ملک کی سیاسی فضا کے ساتھ یونین کی فضا بھی بدلی اور جلد ہی یونیورسٹی اور یونین دونوں سیاسی تہلکوں میں جا پڑے۔ یہاں تک کہ ایک ایسا وقت آیا جب یہ بتانا دشوار ہو گیا کہ تعلیم گاہوں اور بازاروں میں کون کہاں سے شروع ہوتے ہیں اور کہاں ختم ہوتے ہیں۔ یونین میں طلبا یہ سیکھتے ہیں کہ اپنی بات کس صفائی اور صداقت سے کہی جائے اور دوسرے کی بات کس تحمل اور کشادہ جبینی سے سنی جائے۔ نثرِ تقریر کے فنی آداب کیا ہیں اور کس طرح برتے جاتے ہیں۔ اچھی تقریر کو میں فن بھی سمجھتا ہوں اور فضیلت بھی۔ فن کو فضائل سے مستحکم اور مزین رکھنا تعلیم گاہوں کے اعلیٰ مقاصد میں ہونا چاہیئے۔

رشید صاحب نے اپنے مضامین میں ایک دو جگہ اپنے اساتذہ اور پروفیسروں کا ذکر بڑی محبت سے فرمایا ہے اور یہ ان کی تحریر کے بہت اہم حصے ہیں ان ہی اساتذہ نے ان کی صلاحیتوں کو ابھارا اور ان کے جوہر کو چمکایا تھا۔ بلاشبہ ان کے کردار، اسلوبِ تحریر اور تقریر میں پختگی پیدا کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔

رشید صاحب نے اپنے عہد کے ان اساتذہ کا تذکرہ جس عقیدت سے کیا ہے اس سے قطع نظر ان کے مخصوص اسلوب تحریر نے ان خاکوں میں عجیب دل آویزی اور دل کشی پیدا کر دی ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صرف اپنے ایک استاد ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی لکھ کر غیر فانی ہو گئے۔ لیکن رشید صاحب کے بارے میں کیا کہا جائے جنہوں نے اپنے کئی اساتذہ کو اپنے نوکِ قلم سے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

چند علمی سرچشموں کی نشاندہی

کہا جاتا ہے کہ ہر شاگرد رشید اپنے استاد کا پرتو ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی شخصیت کو بنانے سنوارنے اور نکھارنے میں اس کی تعلیم و تربیت کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ رشید صاحب نے اپنے ان مضامین میں ان علمی سرچشموں کی نشان دہی کر دی ہے جہاں سے وہ اور ان کے ساتھی سیراب ہوئے۔

پروفیسر انعام اللہ خاں صاحب

انعام اللہ خاں صاحب بہار کے رہنے والے تھے۔ بڑے شریف النفس، سادہ مزاج لیکن اتنے ہی جذباتی، کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کس بات پر کسی سے کب بے حد خفا یا ناخوش ہو جائیں گے۔ مجھ پر بڑے مہربان تھے۔ کھانا کھانے یا یوں کہیئے کہ انڈے کا خاگینہ کھلانے کا بڑا شوق تھا جو تلا ہوا کم اور جھلسا ہوا زیادہ ہوتا تھا۔ دسترخوان کا کام اسٹیٹسمین کے اوراق سے لیتے جن کو بچھاتے وقت بڑی سنجیدگی سے کہا کرتے تھے کہ صحیح انگریزی لکھنے کی آرزو ہے تو اسٹیٹسمین ضرور پڑھا کرو۔ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کہہ دینے سے معذرت کا حق کس طرف سے ادا ہو جاتا تھا۔ میزبان، دسترخوان، یا اسٹیٹسمین کی طرف سے۔

"انعام اللہ خان صاحب اپنے عہد کے بڑے ممتاز اور مقبول معلموں میں سے تھے۔ انگریزی اور منطق پڑھاتے تھے۔ پرانے انداز کی مرصع و مقفی انگریزی بڑی روانی اور طنطنے سے بولتے تھے۔ منطق کے نوٹ لکھاتے اور زبانی سنتے۔ ایک دفعہ مجھ سے منطق کی کلاس میں برہم ہو گئے۔ بات یہ ہوئی کہ سبق سنانے کی میری باری آئی۔ منطق مجھے پسند نہیں۔ اس لئے کہ میری منطق اکثر دوسروں کی منطق سے جدا ہوتی ہے۔ رٹنے سے یوں

---

[1] آشفتہ بیانی میری صفحہ ۱۱۴

گھبراتا ہوں کہ اس میں تشابہ بہت لگتا ہے یعنی غزل پڑھتے پڑھتے اللہ رسول کا ذکر آجائے تو مناجات شروع کر دیتا ہوں ——— حال ہوا یہ کہ میں نے لکھائے ہوئے نوٹ میں اپنی طرف سے پیوند لگانے شروع کر دیئے۔ وہ بھی اس طرح کہ اکثر پیوند کا سائز اصل سے بڑھ جاتا اور پیوند بھی جگہ جگہ سے خستہ و خوار۔ اس پر یک لخت کتاب بند کر دی اور بڑی سنگلاخ انگریزی اور خشمناک لہجے میں فرمایا "دیکھو جی، یا تو انعام اللہ خاں سے اچھی انگریزی لکھو اور بولو یا پھر انعام اللہ خاں کی انگریزی رٹو۔ بیچ کا کوئی راستہ نہیں۔" یہ تنبیہہ اپنی کلاس کے طالب علموں کو وقتاً فوقتاً دیتے رہتے۔ پروفیسر صاحب کے لئے اُردو ترجمے کا کام میں نے جس قدر کیا اور موصوف سے جتنی تحسین حاصل کی وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ کہا کرتے تھے۔ تمہاری اُردو میں مجھے اپنی انگریزی کا مزا آجاتا ہے۔ میں دم بخود ہو جاتا تو انڈے کھلانے کی دعوت دیتے۔ طالب علمی اور ڈائننگ ہال کے زمانے میں یہ سودا میرے لئے بڑی کشش کا تھا۔

پروفیسر اے ایف رحمٰن

پروفیسر اے ایف، رحمٰن بڑے شرمیلے، شائستہ اور شریف انسان تھے۔ متانت اور تہذیب جیسے ان پر ختم ہو گئی ہو۔ نظر نیچی رکھتے۔ گفتگو کرتے اور کلاس میں لکچر دیتے تو گویا منہ سے پھول جھڑتے . . . . جس طرح اپنے کو لئے دیئے رہتے تھے ویسے ہی دوسروں کے مراتب ملحوظ رکھتے تھے۔ بے تکلف اور بے محابا اپنے ہم چشموں سے بھی نہ ہوتے تھے۔ انگریزی شیریں اور شائستہ لہجے میں بولتے تھے اور کبھی کوئی ایسا لفظ یا فقرہ منہ سے نہ نکالتے جس کے ثقہ یا معیاری ہونے میں شبہ ہوتا ——— ایسا

معلوم ہوتا تھا جیسے انگلستان میں انہوں نے میل جول صرف طبقۂ اشراف ہی سے رکھا تھا۔ رہن سہن، وضع قطع، رکھ رکھاؤ کی جو سطح اپنے لئے پہلے دن مقرر کرلی تھی۔ آخر دن تک قائم رکھی۔ لڑکوں کے اصرار پر یونین کے مباحثوں میں شریک ہونے کے لئے اکثر آجاتے۔

مسٹر رینل
MR REYNELL

مسٹر رینل انگریزی کے بڑے قابل پروفیسر تھے۔ دوسرے انگریز پروفیسر بھی ان کی زباں دانی کے معترف تھے۔ اس زمانے میں انگریزی میں ممتاز ہونے کا شوق اس درجہ عام تھا کہ جو طالب علم رینل صاحب کے کلاس یا ٹیوٹوریل گروپ میں ہوتا اس کے بارے میں یہ حسنِ ظن عام ہوتا کہ اس کی انگریزی اچھی ہے۔ قاعدے قانون کے خود بڑے پابند تھے اور دوسروں سے پابندی کرانے میں کسی طرح کی رورعایت گوارا نہ کرتے۔ اس کے صلے یا پاداش میں دو ایک دفعہ کچھ ناخوشگواریاں بھی پیش آئیں لیکن بحیثیتِ مجموعی رینل صاحب کا وقار طلباء میں جوں کا توں رہا۔ اتفاق سے ایک دن کلاس دیر سے پہنچے۔ لڑکے جا چکے تھے۔ دوسرے دن آئے تو کہا جب تک تم کو یہ نہ معلوم ہو جایا کرے کہ میں رخصت پر ہوں یا مر گیا اس وقت تک میری کلاس نہ چھوڑا کرو۔ اور یہ انہوں نے صحیح کہا۔ کلاس وہ اسی پابندی سے لیا کرتے۔

"یوروپین اسٹاف نے متفق ہوکر استعفٰے دے دیا تھا۔ رینل صاحب شام کی گاڑی سے علی گڑھ چھوڑنے والے تھے۔ اس دن بھی انہوں نے حسبِ معمول اپنی کلاس لی اور پوری توجہ سے آخری منٹ تک پڑھاتے رہے۔ گھنٹہ بجا

لہ آشفتہ بیانی میری صد ۱۴۱۔

اور کلاس سے جانے لگے تو کتاب بند کی اور بولے "خدا حافظ" اور یہ پہلا موقع تھا جب ہم سب نے محسوس کیا کہ رینل صاحب کی آواز کسی قدر گلوگیر تھی۔

مولانا عبدالحق حقی بغدادی

"مولانا عبدالحق حقی بغدادی[۱] عربی کلاس کا درس غالباً برکت علی خاں لیکچر روم میں دیا کرتے۔ وہی وقت اسٹریچی ہال میں ٹول صاحب کے اکنامکس کے لیکچر کا ہوتا۔ مولانا حقی کی کلاس میں چار پانچ ہی طلبا ہوتے جو بہت قریب بیٹھے ہوتے لیکن مولانا پڑھاتے اس بلند آواز سے تھے کہ وکٹوریہ گیٹ تک آواز صاف سنائی دیتی۔ ٹول صاحب پرنسپل تھے۔ مگر انہوں نے کبھی تعرض نہ کیا۔ کلاس میں ہم کو بسا اوقات گھبراتے دیکھ کر کبھی کبھی تھوڑی دیر لکچر دینا بند کردیتے۔ پھر شروع کر دیتے۔ بالآخر موصوف نے اپنے ہی لکچر کا وقت بدل دیا۔ ایک دفعہ البتہ فرمایا "میں مولانا کے طاقتور پھیپھڑوں پر رشک کرتا ہوں۔" ایک طالب علم نے کہا "جناب والا ہم بھی یہی کرتے ہیں لیکن اپنے ان ساتھیوں کے کان کے پردوں پر جو مولانا کے درس میں ہوتے ہیں۔" ٹول صاحب نے زہر خند فرمایا۔ ہم سب دم بخود رہ گئے۔ اس لئے کہ ٹول صاحب کے سامنے لب کشائی ہر شخص کے بس کی بات نہ تھی۔ تاوقتیکہ وہ کوئی مہا مسخرانہ ہو یا غیر معمولی کھلاڑی یا یونین کا مقرر۔

مسٹر اکٹر لونی
AUCHTER LOONI

MR DAVID AUCHTER LOONI مسٹر اکٹر لونی فلسفہ اور انگریزی کے پروفیسر تھے۔ ہمارے گروپ نے شکسپیئر کے ڈرامے بی۔اے میں تین انگریز پروفیسروں سے پڑھے اور ان کی ٹیوٹوریل کلاس میں رہے یعنی پروفیسر رینل، پروفیسر اکٹر لونی اور پروفیسر

---

[۱] آشفتہ بیانی میری صفحہ ۱۱۵ – ۱۱۷۔

پروویس جن کی ہیئت، عمر اور ڈیل ڈول دیکھ کر سارا کالج پروفیسر پرویس کے بجائے بابا پرویز کہتا تھا۔ پروفیسر اکٹر لونی کے بارے میں کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ان کا موڈ انگلستان کے موسم کی مانند کب کیا ہوجائے گا۔ ہماری سائنڈ کے ٹیوٹر تھے۔ ٹیوٹر کو اس زمانے میں کم و بیش وہی اختیارات حاصل تھے جو آج کل پرووسٹوں کو ہیں۔

اکٹر لونی صاحب کی پنسل اکثر لاپتہ ہوجاتی۔ اس کے لئے ترکیب یہ نکالی تھی کہ پنسل کے ایک مختصر ٹکڑے کو بڑے لمبے دھاگے سے باندھ دیا جاتا تھا۔ اس پنسل کو لئے ہوئے ہر کمرے یا برآمدے میں آتے جاتے رہتے اور جو کچھ نوٹ کرنا ہوتا کر لیا کرتے۔ اگر پنسل کہیں چھوٹ جاتی تو اس کی تلاش میں سرگرداں نہ ہوتے بلکہ میز تک جس کے پائے سے دھاگے کا دوسرا حصہ بندھا ہوتا واپس آتے۔ دھاگے کھینچنا شروع کر دیتے اور پنسل آموجود ہوتی۔ یہ کبھی نہ کرتے کہ دھاگے کے سہارے پنسل تک پہنچ جاتے اور اسے اٹھا لیتے۔ کھینچنے میں پنسل کہیں اٹک جاتی تو اسے چھڑا آتے اور واپس آکر پھر دھاگا کھینچنے لگتے۔ یہاں تک کہ پنسل میز تک واپس آجاتی اور اپنی جگہ پر رکھ دی جاتی۔ اپنے کتے سے جو بالکل معمولی دیسی قسم کا تھا بڑی محبت کرتے تھے۔ وہ مرگیا تو باغ کے ایک گوشے میں دفن کروایا۔ قبر پختہ بنوائی۔ اور یہ کتبہ اردو میں لکھوا کر نصب کرا دیا "بھائی تجھ سا کبھو نہ ہوا"۔ غالباً انگریزی فقرہ کا ترجمہ ہے۔ A BROTHER LIKE THEE WAS NEVER BORN باہر گھومتے پھرتے کبھی نظر نہ آئے۔ اپنی ہی کوٹھی

لے آشفتہ بیانی میری صفحہ ۱۱۹

کے اندر رہتے یا کلاس لینے جاتے۔ بڑی محبت اور کھلے دل کے آدمی تھے۔ داؤ پیچ جیسے جانتے ہی نہ ہوں لیکن جہاں ڈسپلن کا معاملہ آجائے اکڑ لونی صاحب کو ان کے راستے سے کوئی بھی ادھر ادھر نہیں کر سکتا تھا۔ گھنٹہ بجتے ہی کلاس میں داخل ہوتے اور ختم ہوتے ہی کتاب بند کر دیتے۔ کمی بیشی کی ان کے ہاں گنجائش نہ تھی۔ پڑھانے کے سوا کلاس میں ایک لمحہ بھی ادھر ادھر کی بات نہ کرتے نہ کسی کو کرنے دیتے۔ یہ وتیرہ اس زمانے کے ہر انگریز پروفیسر کا تھا۔ طالب علموں کی بڑی عزت و محبت کرتے تھے لیکن ان کو اپنا آلۂ کار بناتے نہ ان کے آلۂ کار خود بنتے۔ یہ صفت اب تعلیم گاہوں میں عنقا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس کا کسی کو غم بھی نہیں۔

پاپا پرویز
PROF PERVIS

پاپا پرویز (پروفیسر پرولس) سب سے نرالے تھے۔ چوڑی چکلی ہڈی، لمبا تڑنگا قد، پاٹ دار آواز، تقریباً سن رسیدہ ــــــ ہمہ وقت شراب میں سرشار۔ کلاس میں بغدادی صاحب کے بعد سب سے زیادہ بلند آواز میں اس جوش و خروش سے پڑھاتے جیسے شراب کا نشہ زائل نہ ہوا ہو بلکہ بڑھتا جا رہا ہو۔ لیکن آفرین ہے اس شخص پر کہ معذوری کے باوجود شکسپیئر کے نکات جس خوبی سے واضح کرتے کوئی دوسرا یا تو کر نہیں سکتا تھا یا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سب سے پہلے لفظی ترجمہ کرتے یہاں تک کہ "iF" اور "BUT" تک کا ترجمہ کر ڈالتے۔ پھر ہر فقرے کے محل اور موقع کی توضیح کرتے۔ اس شد و مد سے جیسے شراب میں نہیں کسی آسیب کی زد میں ہوں۔ نظر برابر کتاب پر جمی رہتی۔ کلاس کی طرف کبھی نہ دیکھتے۔ مسلسل بولتے چلے جاتے جیسے کبھی پھر بولنے کا موقع نہ آئے گا۔ شراب اور اوقاتِ درس دونوں کے یکساں سختی سے پابند تھے۔ ساتھی

یورپین اور دوسرے اساتذہ سے ربط ضبط نہ تھا۔ معمولاً کسی سے بات چیت کرتے یا ادھر ادھر دیکھتے بہت کم پایا گیا۔ اپنے لئے شراب ہی کی قربان گاہ کا انتخاب کیا اور بالآخر اس کی نذر ہو گئے۔

قاضی جلال الدین مرادآبادی

انٹرمیجیٹ میں میرے مضامین قدیم روم و یونان کی تاریخ اور وہاں کا جغرافیہ تھے جن کے لکچرر قاضی جلال الدین صاحب مرادآبادی تھے۔ موصوف ایک زمانے تک علی گڑھ منتھلی کے اُردو سیکشن کے ایڈیٹر اور نگران بھی رہے۔ بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے۔ اسٹاف میں آگیا تو مدتوں ساتھ کام کرنے کی بھی عزت و امتیاز حاصل رہا۔ بڑے ذہین، ظریف، زندہ دل اور گُنیہ پرور تھے۔ مایوس و ملول نہ دیکھے گئے۔ نہ کسی اور کو محفل میں مایوس و ملول رہنے دیتے۔ اساتذہ اور طلباء میں یکساں مقبول و محبوب تھے۔ قاضی صاحب کے بغیر ہر تقریب سونی معلوم ہوتی۔ خوب سوجھتی تھی۔ تفریحی اور ہجویہ نظموں میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ . . . دعوت کے موقع پر بہت جلد اور بڑے مزے کی نظم لکھ ڈالتے۔ ان کی ظرافت و طنز کے ہدف میزبان اور اشیائے خورد و نوش خاص طور پر ہوتیں۔

جغرافیہ پڑھانے میں ملکوں، شہروں، دریاؤں، پہاڑوں، جھیلوں کے ٹیڑھے میڑھے طویل الذیل ناموں کو ایسے دل چسپ فقروں، مصرعوں اور مکالموں میں کھپا دیتے کہ ان ناموں کو بھول جانا ناممکن تھا۔ تمام دنیا کے نقشوں کو بھی اسی طرح قابو میں لاتے تھے۔ مقررہ کشش اور نشوشوں کو گھٹا بڑھا کر اس طرح لکھتے کہ مخصوص نام یا فقرے سے مخصوص نقشہ تیار ہو جاتا۔ مثلاً بابر شیر پر لڑکا ہے۔ اس کو اس طرح لکھتے یا اس کا طغریٰ بناتے کہ وہ

ہندوستان کا خاکہ بن جاتا۔ نقشہ کھینچنے میں ایسا باکمال مشکل ہی سے کہیں نظر آئے گا۔ آنکھ پر پٹی کیوں نہ باندھ دی جائے جس ملک دریا، جھیل یا پہاڑ کا نام لے دیجئے اس کا نہایت صحیح خاکہ بے تکلف اور بہت جلد کاغذ یا تختہ سیاہ پر کھینچ دیتے۔ اس زمانے میں ہندوستانی لکچرر کو بڑی معمولی تنخواہ ملا کرتی تھی۔ ایک موقع پر کسی ناواقف نے وطن میں سوال کر دیا۔ قاضی صاحب آپ کو علی گڑھ میں تنخواہ کیا ملتی ہے ؟ بڑے استغنا لیکن تھوڑی سی تمہید کے بعد جواب دیا۔ بھئی اللہ کا شکر ہے ڈاکٹر ضیاء الدین اور میری تنخواہ مل کر ایک ہزار روپئے ماہوار ہو جاتے ہیں ——— البتہ ڈاکٹر ضیاء الدین کا نام آہستہ سے بہت ہی رواداری میں لیا اور اللہ کا شکر اور ہزار روپے بلند آواز سے کہے تھے۔

اس طرح کی طباعی نے ان کی ذہانت کو ایک تفریحی یا فلسفیانہ مشغلے کی طرف پھیر دیا۔ الفاظ کی اُلٹ پھیر اور ان سے معنی اخذ کرنے کے ایسے ایسے نئے اصول گھڑے یا پرانوں کو زیر و زبر کیا کہ بعضوں نے ان کے ہاتھ چومے۔ اور بقیہ نے اپنے سر پکڑ لئے۔ اس مہم میں راقم السطور ان کا دستِ راست تھا اور جہاں کہیں ایسے الفاظ کے لئے اصول وضع کرنے یا معنیٰ پہنانے کی ضرورت ہوتی جو کسی طرح قابو میں نہ آتے تو مجھ سے مشورہ کرتے اور میں توجیہہ و تلبیس کے ایسے نوادر پیش کرتا کہ اپنے وقت کا بڑے سے بڑا عطائی بھی امراض یا مذہب کی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے مشورے سے ایسے الفاظ کے لئے ایک نیا کھاتا کھول دیا گیا تھا جس کا نام "گھپلا کھاتا" تھا۔ میرا کہنا یہ تھا کہ بالآخر اس ڈکشنری کے نام رکھنے کا مرحلہ پیش آئے گا۔ اس وقت تک کوئی موزوں تر نام دستیاب نہ ہو سکا تو لغت کا نام

"گھپلا کوش" یا "کڈھب کوش" رکھ دیا جائے گا۔ ہندی میں شاید فرہنگ یا لغت کو کوش ہی کہتے ہیں۔ فارسی میں بھی آیا ہے "در عمل کوش، ہر چہ خواہی پوش"۔ چنانچہ اس کھاتے میں وہ تمام الفاظ درج کر دیئے جاتے جن کی تعبیر و توجیہہ پر نہ قاضی صاحب کا ضمیر مطمئن ہوتا نہ مجھے اپنی بخشائش کی امید باقی رہ جاتی۔ ایک خیال یہ ضرور تھا کہ ممکن ہے امتدادِ زمانہ سے دونوں ہموار ہو جائیں۔

قاضی صاحب کی ڈکشنری سے مثالیں پیش کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔ یوں بھی اس کے بہت سے الفاظ زبان زد ہیں۔ آپ کے تحمل و درگذر کے لئے بے پایاں ذخیرے پر بھروسہ کرتے ہوئے دو ایک مثالیں لسانیاتی عبرت کے لئے پیش کرتا ہوں۔ مثلاً ٹریزرر (خازن) کی تاویل اس طرح کی تھی کہ عموماً تنخواہوں اور بلوں میں کاٹ چھانٹ کیا کرتے ہیں اس لئے ٹریزرر کا یہ عہدہ "تیرے ضرر" کے لئے۔ پراکٹر۔ چونکہ ڈسپلن کے معاملہ میں کسی کی رُو رعایت نہیں کرتا اس لئے یہ ماخوذ ہے "بر اکٹر" سے۔ ڈپٹی وہ ہے جو ڈپٹتا ہے۔ ان کے زمانے میں زبانی امتحان وایوا ووسی (viva voci) کا مسلم یونیورسٹی ممتحن کو معاوضہ نہیں دیتی تھی اس لئے اس کی تاویل یوں کی گئی تھی۔ "واہ وا ویسے ہی"۔ ڈیکوریشن نکلا تھا "دیکھو رے شان" سے وغیرہ۔

اس تفنن کا المیہ یہ ہوا کہ جب یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر وطن واپس تشریف لے گئے تو اسی لغت کو شائع کرنے کے لئے اپنا ایک پریس کھولا اور جلالی ڈکشنری کے نام سے اُسے چھاپنا شروع کر دیا۔ ہم سب نے اپنے آپ کو نفرین کرنے کے بعد موصوف سے درخواست کی

کہ یہ سب بے فکری اور تفریح و تفنن کا ایک مشغلہ تھا۔ اس کو چھاپنے اور شائع کرنے سے محنت و زیر باری کے علاوہ جگ ہنسائی کا بھی سامنا ہوگا لیکن موصوف نہ مانے۔ کچھ اجزا چھاپ بھی ڈالے۔ بالآخر قضا و قدر کو بیچ میں پڑنا پڑا یعنی قاضی صاحب کو ہم سب سے اور ان کے ورثا سے پریس کو اپنے سے جدا کر دیا۔ ورنہ "زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا" کے کیسے کیسے نمونے ہمارے سامنے آتے۔

رشید صاحب سیروفی الارض کے قائل تھے لیکن سفر کے معاملے میں ان کے کچھ خاص اصول اور ضوابط تھے۔ انہوں نے مختلف ضرورتوں کے تحت اکثر سفر کئے۔ بعض مرتبہ یونیورسٹی کے کام سے۔ کبھی اپنی ضرورت سے اور اکثر تفریح کی غرض سے، اپنے ان سفروں کی کچھ روئدادیں انہوں نے اپنے مضامین میں لکھی ہیں۔ ایک تو سفر کا موضوع اور پھر رشید صاحب کا مخصوص انداز بیان ان دونوں نے مل کر ان تحریروں کو اردو ادب کا شاہکار بنا دیا ہے۔ پھر جیسا کہ رشید صاحب کی طنزیہ تحریروں کا انداز ہے وہ ان میں بہت سی ایسی کام کی باتیں لکھتے چلے جاتے ہیں جو معاشرتی زندگی کے لئے بہت اہم ہیں۔

رشید صاحب کے سفر کے تجربات عجیب اور حد درجہ دلچسپ ہیں مگر یہ تجربات ان کے غالباً تقسیم ہند سے پہلے کے ہیں۔ اس لئے کہ ان میں "کالے صاحبوں" کی اکڑفوں سے بھی ان کو سابقہ پڑتا رہا ہے۔ رشید صاحب کی ان تحریروں کی اس لحاظ سے بڑی اہمیت ہے کہ ان میں بہت سے معاشرتی مسائل پر رائے زنی کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں خود رشید صاحب کے خیالات اور کردار بھی اس میں اکثر جگہ سامنے آگئے ہیں۔

سفر کے تجربات

"میرے سفر[1] کی محرک اکثر دو چیزیں ہوتی ہیں۔ آپریشن کرانا، سفر خرچ وصول کرنا جس کے مجموعے کا نام بڑے لوگوں نے قومی کام رکھا ہے۔ ریل پر سفر کرنے والوں کی ایک عجیب ذہنیت ہوتی ہے۔ ٹکٹ خرید لینے کے بعد وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ ہر ایسے فعل کے لئے آزاد ہیں جس سے ڈبے میں گندگی پھیلتی ہو یا ہو جانے کا امکان ہو۔ ڈبے میں داخل ہوں گے تو اس بدگمانی اور ارادے کے ساتھ گویا تمام دوسرے مسافروں نے ان کے حقوقِ راحت غصب کر لئے ہیں اور یہ نان کو آپریٹر قسم کے مظلوم ہیں۔ یعنی ان کو اختیار ہے یہ جتنا چاہیں ظلم کر لیں۔ دوسروں کو کوئی حق شکایت یا تدارک کا نہیں ہے۔

"میرا اصول سفر یہ ہے کہ میں اور میرا ہم سفر پہلے یہ طے کر لے کہ کون سینیر ہوگا اور کون جونیر۔ سینیر اور جونیر میں فرق یہ ہے کہ میں (جونیر) آپ (سینیر) کی معیت میں ہوں تو پھر میرا خوشگوار فرض ہوگا کہ میں تانگہ پکڑ لاؤں۔ اسباب بار کراؤں، کرایہ چکاؤں، دوکان پر جائیں تو آپ تانگے ہی پر بیٹھے رہیں۔ میں کپڑے، موزے، جوتے، پھل پھلاری لا لا کر آپ کو دکھاؤں۔ کوئی فقیر آجائے تو مار بھگاؤں یا آپ کے پیسے میں سے خیرات میں دے دوں مجھے کوئی چیز پسند آجائے تو آپ خرید دیں۔ کہیں بحث مباحثہ کی نوبت آجائے تو قبل اس کے کہ آپ غلط اردو بولنے پر مجبور ہوں میں غلط انگریزی بولنے لگوں۔ اور[2] جونیئر کے فرائض یہ ہیں کہ صرف ریل کا کرایہ اپنے پاس سے ادا کر دے۔ اس کے بعد موٹر، تانگے کا کرایہ، قلی کی مزدوری، کھانے کی قیمت، قیام و طعام اور راستہ کے تمام اخراجات سینیر کے ذمے۔ ناشتہ لے جانے

---

[1] مضامینِ رشید صفحہ ۵-۱۷ - ۱۸۳ : [2] مضامینِ رشید صفحہ ۲۳۱

کا ذمہ دار بھی سینیر ہے یا جہاں جا رہے ہوں وہاں جونیر کو روپیوں کی ضرورت ہو تو سینیر کا فرض ہے کہ وہ روپے بطور قرض عطا کرے جہاں تک اس قسم کے قرض کا تعلق ہے جونیر کا فرض ہے کہ وہ اپنی سہولت کو مدنظر رکھ کر بالاقساط ادا کرے لیکن ہمیشہ اور ہر مجمع میں اس کا اقرار کرے کہ اس نے قرض لیا ہے۔

اس کے علاوہ جونیئر کا فرض یہ ہے کہ وہ اسباب وغیرہ کا نگران رہے۔ سینیر کے لئے ریل پر ہر قسم کی سہولت فراہم کرے۔ مثلاً نشست پر، یا دوڑ کر پانی اور ضرورت کی چیز اسٹیشن پر سے لایا کرے۔ قلی تانگہ والے سے لڑائی مول لے۔ ٹکٹ کلکٹر سے انگریزی بولے۔ ریل پر سوار ہوتے ہوئے نئے مسافروں کو اندر نہ آنے دے اور سینیر کو باہر نہ جانے دے۔ ناشتہ دسترخوان پر چن دے اور پھر ساری چیزوں اور برتنوں کو سمیٹ لے۔ مختصر یہ کہ ہر قسم کے متوقع یا غیر متوقع اخراجات کا سینیر اور خدمات کا جونیر ذمہ دار ہو۔

سینیر بننا آسان نہیں اس کے لئے صورت شکل وضع قطع، رکھ رکھاؤ ضروری ہے۔ مجھے اکثر میٹنگ وغیرہ میں شریک ہونے کے لئے باہر جانا پڑتا ہے۔ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لیتا ہوں۔ لیکن بعض اوقات ایسی دشواریاں آئی ہیں اور ایسی رسوائی ہوئی کہ اکثر جی میں آیا ہے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر تھرڈ کلاس میں بیٹھ جاؤں۔ اول تو قلی پوچھتا ہے کہ صاحب انٹر کلاس میں اسباب رکھوں۔ اس کے بعد ہر بڑے اسٹیشن پر ٹکٹ کلکٹر آتا ہے۔ خوانچہ والے دہی برے پیش کرتے ہیں اور پانی والا تا ملوٹ اور بالٹی دکھاتا ہے۔

ایک بار ایک صاحب بہادر بھی ہم سفر تھے۔ کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا ہی تھا کہ نہایت دلندیزی لہجہ میں فرمایا یہ تو فرسٹ کلاس ہے۔ میں نے ان کی اطلاع سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا تو بولے یہ سیکنڈ کلاس نہیں ہے۔ میں اب بھی خاموش

رہا۔ ارشاد ہوا انٹر کلاس آ گے ہے۔ میں نے کہا گاڑی چھوٹنے والی ہے۔ فرمایا تو تھرڈ میں بیٹھ جاؤ۔ میں نے عرض کیا سفر لمبا ہے۔ اس میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ فرمایا یہ فرسٹ کلاس ہے مقدمہ چلایا جائے گا۔ میں نے کہا شکریہ لیکن ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ اب تک ہم دونوں صحیح انگریزی بول رہے تھے اس لئے کسی قسم کی ناہمواری نہیں پیدا ہوئی۔ صاحب نے سگریٹ سلگا کر کچھ اور فرمایا جس کو میں نہ سمجھا۔ میں نے ڈبیا میں سے ایک پان نکال کر منہ میں رکھا اور عرض کیا مکرر ارشاد ہو۔ فرمایا۔ ہم بولا تم دوسری گاڑی میں جانا مانگتا۔ ہم سمجھا۔ بٹ یہی جگہ بیٹھنے مانگتا۔ صاحب کا رنگ متغیر ہونے لگا۔ ادھر خاکسار نے بھی خلافِ معمول اپنے چہرے پر آثار تبختر پائے۔ صاحب نے انگریزی میں فرمایا تم کہاں جا رہے ہو۔ میں نے بھی انگریزی میں کہا۔ تم کہاں جا رہے ہو۔ فرمایا جہنم کو۔ میں نے کہا مجھے بھی رفیقِ سفر سمجھئے۔ لیکن میرا ٹکٹ واپسی کا ہے۔ صاحب بہادر ہنس پڑے۔ کہنے لگے جب منزل ایک ہو تو ذریعہ سفر ایک ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بولے کیا کام کرتے ہو۔ میں نے کہا جاہلوں کو مہذب بناتا ہوں۔ صاحب نے کسی قدر چین بہ جبیں ہو کر کہا یعنی؟ میں نے کہا، یونیورسٹی میں معلم ہوں۔ صاحب بہادر نے لپک کر نہایت گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ معذرت چاہی اور اپنی طالب علمی کے قصے سناتے رہے۔ ایک اسٹیشن پر صاحب بہادر اتر پڑے۔ ٹکٹ بابو نے آکر مجھ سے ٹکٹ مانگا۔ میں نے نکال کر دکھایا۔ لیکن اس کو کچھ اطمینان نہیں ہوا۔ اس نے صاحب بہادر کی طرف اس طور پر دیکھا گویا وہ چاہتا تھا کہ موصوف احتیاطاً دیکھ لیں۔ صاحب بہادر نے میری طرف دیکھ کر پوچھا کیا معاملہ ہے؟ میں نے کہا میرے دوست کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں میں نے آپ کا ٹکٹ تو نہیں نکال لیا۔

"ریل کے فرسٹ کلاس میں سفر کرنا خوش نصیبی ہے۔ بشرطیکہ سفر خرچ دوسرے کے ذمہ ہو۔ اس کے علاوہ حلیہ شریفوں جیسا۔ لباس صاف ستھرا جس میں سب نہیں تو ایک آدھ کپڑا مل کا تیار کیا ہوا ضرور ہو۔ یہ اس لئے کہنا پڑتا ہے کہ بعض کپڑے حسب و نسب کے اعتبار سے تو نجیب الطرفین ہوتے ہیں لیکن ان میں خاصیت کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ دھلے ہوئے ہونے پر بھی دھلے نہیں معلوم ہوتے اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے جسم پر صاف کپڑا بھی صاف نہیں معلوم ہوتا۔ خدا کے ایسے بندے بھی پائے جاتے ہیں جن کے جسم پر میلا کپڑا بھی میلا نظر نہیں آتا۔ یہ کرشمے کپڑے کے ہوں یا پہننے والے کے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے اس میں غبار، دھند، جالا۔ وغیرہ کو دخل ہو جو فضا میں اکثر میری آنکھ میں بیشتر اور سرمے کے اشتہارات میں ہمیشہ ملتے ہیں۔

ٹرین میں جیسا کھانا جن برتنوں اور جس شکل میں پیش کیا جاتا ہے اس سے بچنے کے لئے ستھرے ناشتہ دان میں گھر کا کھانا ہو۔ تھرماس یا صراحی میں صاف پانی ہو۔ ہولڈال ایسا ہو جیسے اس سفر کے لئے خریدا گیا ہو، نہ یہ کہ بستر پرانی ادوائن یا میلی گرہ دار نواڑ کے ٹکڑے سے بندھا ہو۔ ساتھی مسافر ایسے نہ ہوں جن کی بیویاں ہر اسٹیشن پر کورے گرد آلود آب خورے میں دودھ اور چائے پیتی ہیں دہی برے خرید کر شوہر کے لئے فراہم کرتی ہوں۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ نوجوان، خوبصورت، خوش لباس اور خوش اطوار بیویاں یہ سارے کام انجام دینے پر مامور رہتی ہیں اتنا نہیں بلکہ گرمی یا برسات کا موسم ہوا تو بار بار ہولڈال سے تولیہ نکال کر شوہرِ نامدار کو مسلسل پسینہ

ا۔ اِدھر اُدھر کی مطبوعہ آجکل دہلی بابت فروری ۱۹۶۴ء

پونچھتے رہنے کے لئے دیتی رہتی ہیں اور شوہر صرف بنیائن میں ملبوس تکیہ لے کر کبھی اوپر کی برتھ پر جا لیٹتا ہے کبھی فوراً نیچے اتر کر غسل خانے میں داخل ہو جائے گا، اور وہاں سے نکل کر نچلی برتھ پر دراز ہو جائے گا۔ اس کی یہ اور دوسری اضطراری حرکتیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ فرسٹ کلاس میں سے وہ چین یا فضا نہیں میسر ہے جس کا دراصل وہ عادی ہے۔ تندرست ہٹے کٹے شوہر کا سفر میں بیوی سے خادمہ کا کام لینا بڑی بدتمیزی ہے۔

"ہم سفر کی سیرت کا اندازہ اس طرح بھی کرتے ہیں کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ کیا اور کیسا سلوک روا رکھتا ہے۔ نیز غسل خانہ استعمال کرنے کے طور طریقوں سے واقف ہے یا نہیں۔ ایسا تو نہیں کہ فرسٹ کلاس کا کرایہ ادا کر کے وہ سمجھنے لگا ہو کہ فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کے آداب سے وہ بری ہو گیا۔ شریفوں کا شیوہ تو یہ ہے کہ وہ اول درجہ ہی میں نہیں تھرڈ کلاس میں بھی فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کے آداب ملحوظ رکھتے ہیں۔ ہر اسٹیشن پر مونگ پھلی، پکوڑے، دہی بڑے، کھیرا، ککڑی یا آم وغیرہ کھانے، پتا چاٹنے، ان کو کمپارٹمنٹ میں ڈال دینے سے مجھے بڑی گھن آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس وحشی اور گنوار نے غسل خانہ اور کمپارٹمنٹ ایک کر دیا ہو۔

یہ ساری باتیں ناخواندہ مہمان کی طرح ذہن میں آگئیں۔ ظاہر ہے ایسے مہمان سے کسی نہ کسی طرح اور جلد سے جلد گلو خلاصی کرنے کی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ اس کا ایک طریقہ ہے کہ اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ناظرین کو بھی اس میں شریک کر لے۔ دراصل جو واقعہ بیان کرنا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ ایک بار یونیورسٹی کے خرچ پر فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ ایک صاحب پہلے سے موجود تھے۔ کالے، کم رو، کم سخن، بشرے سے بڑے ذہین، اپنے

سے مطمئن، دوسرے سے بے نیاز، عمر کے اس حصے میں جب وہ ہوتی تو ہے کسی قدر زیادہ، لیکن کم کر کے بتانے کی خواہش ہوتی ہے۔ اپنے کو نہیں تو دوسروں کو۔

کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے موصوف کو میرا آنا پسند نہ آیا ہو۔ حلیہ شریف کا سوال نہ تھا۔ اس لئے کہ میری صورت دیکھ کر وہ کیا کوئی بھی احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہو سکتا۔ میں نے نہایت شریفانہ لہجے اور آداب کے ساتھ سلام کیا۔ اس کا جواب انہوں نے اس طرح دیا کہ میں ان سے آئندہ کسی قسم کی توقع نہ رکھوں۔ ان کے اس سلوک سے دل ہی دل میں بہت محظوظ ہوا۔ بد دماغ سے بد دماغی کا مظاہرہ ہو تو مجھے بڑا لطف آتا ہے۔ جیسے وہ شخص اپنے ہی جوشاندہ میں جوش کھا رہا ہو۔ اس وقت مجھے وہ مثل یاد آئی جو کہیں پڑھ چکا تھا یعنی اس بدصورت سے زیادہ بد دماغ اور مغرور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا جس کی شادی ہو گئی ہو۔

ان کی طرح میں یا میری طرح وہ ٹرین سے سفر کے تو قائل تھے لیکن ٹرین کے آب و دانہ کے نہ تھے۔ اس لئے دونوں نے خورد و نوش کا انتظام پبلک سیکٹر کے بجائے پرائیویٹ سیکٹر سے کر رکھا تھا۔ ان کا ناشتہ دان نام چینی کا تھا۔ میرا المونیم کا، جہاں تک اندازہ لگانے کا تعلق ہے خوراک فرد کرنے کی جو صلاحیت بظاہر ان میں معلوم ہوتی تھی اس کی رو سے ان کا ناشتہ دان بڑا اور اسی اعتبار سے میرا چھوٹا تھا۔ اس سے ناشتہ دانوں کی مشمولات و مقدار کا بھی حساب لگایا جا سکتا ہے۔ میرے پاس پانی کی صراحی اور گلاس تھا۔ انہوں نے اس کا انتظام بوتلوں میں کر رکھا تھا۔ میں گلاس میں پانی انڈیل کر پیتا تھا۔ وہ براہِ راست بوتل سے پیتے تھے۔ ان کا پینا بالجہر ہوتا۔ میرا بااللہ۔

میں دوپہر کا کھانا گھر سے کھا کر چلا تھا۔ یوں بھی ایک زمانے میں کھانے میں نہ وقت کا پابند تھا نہ بھوک کا۔ جب ملا، جتنا ملا کھا لیا۔ کبھی دو ایک وقت پیشگی کا بھی۔ یوں بھی کھانے کے فن کاروں نے بتایا ہے کہ کھانے کے لئے بھوک کو نہیں مواقع کو اہمیت دینی چاہیئے۔ اسی طرح اگر دو ایک وقت کا کھانا نہ ملے یا طبیعت کے مطابق میسر نہ آئے تو آمادۂ فساد نہ ہونا چاہیئے۔ شریف آدمی کو ٹھکانے کا کھانا بالضرور مل کر رہتا ہے۔

گھر سے کھا کر چلنے میں ایک مصلحت یہ بھی ہوتی ہے۔ روکھا پھیکا روزمرّہ کا کھانا تو حسبِ معمول گھر پر کھا لیا۔ اس طرح اچھے ناشتہ کی مقدار میں جو ہم سفر ہونے والا تھا کمی نہ آئی۔ دوسرے گھر والوں کا کہنا یہ تھا کہ سفر شروع نہ ہو چکا ہو تو سفر کے کھانے میں ہاتھ لگانا کیسا۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ راستے میں دوسروں کو بھی شریکِ دسترخوان کرنا پڑے تو کھانے کی کمی کی وجہ سے اس کی نوبت نہ آئے کہ ایک دوسرے سے تا اختتامِ سفر آنکھ نہ ملا سکیں۔ اس لئے میں سفر میں ناشتہ کی مقدار ذرا زیادہ ہی رکھتا ہوں۔

لنچ کا وقت آیا۔ ہم سفر نے ناشتہ دان کھولا۔ اللہ کا دیا سب کچھ موجود تھا جسے انہوں نے اس رغبت سے، اتنا جلد اور اس مقدار میں کھانا شروع کیا جیسے وہ اپنا نہیں کسی دوسرے کا کھانا کھا رہے ہوں۔ میں اس کا منتظر تھا کہ رسمًا یا اخلاقًا مجھے بھی شرکت کی دعوت دیں گے چونکہ میرے پاس خود کھانے کا سامان موجود تھا۔ اس لئے انہیں میری طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ دعوت دینے کا بدلہ میں بھی کر سکتا تھا لیکن کچھ ایسا معلوم ہوا کہ کھانے کے معاملے میں وہ ہر شبہے کو یقین پر ترجیح دینا پسند کرتے ہیں۔

انہوں نے مطلق التفات نہ کیا تو میں غور میں پڑ گیا کہ یہ کس قبیلہ اور قماش

کے آدمی تھے کہ اتنا معمولی اور بے ضرر آداب ملحوظ رکھنے کی بھی توفیق نہ ہوئی وہ کچھ اس طرح کھانے کے شغل میں منہمک رہے کہ میں ان کی ولدیت، قومیت سکونت وارد حال وغیرہ کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کرسکا۔ وہ کھاتے رہے اور میں پیچ وتاب میں مبتلا رہا۔ یکایک انہوں نے ایک مسلّم پیاز نکالی اور اوپر کا ہلکا پھلکا سرخ چھلکا دور کرکے براہِ راست دانتوں سے کاٹ کر اس طرح اس کو کھانا شروع کیا جیسے وہ پیاز نہ تھی، آڑو یا آلوچہ تھا۔ اس کے بعد کچھ دیر تک طرح طرح کی مٹھائیوں سے شغل فرماتے رہے۔ ایک بوتل کا نصف پانی غٹ غٹ پی گئے اور اطمینان کا ڈکار آہنگ سانس لیا۔ ناشتہ دان بند کردیا اور باوجود اس کے کہ گرمی کا موسم تھا سر سے پاؤں تک کمبل تان کر لیٹ رہے۔ گرمی کا موسم، دوپہر کا وقت، کمبل کا اوڑھنا سمجھ میں نہ آیا۔ ذرا دیر میں خراٹے کی آواز آنے لگی معلوم نہیں کیوں۔ مجھے سونے میں خراٹے کی آواز اور بآوازِ بلند ڈکار لینے سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ وحشت کے بجائے کوئی اور لفظ لکھنا چاہتا تھا لیکن سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا کی بنا پر جہاں کا تہاں رہ گیا۔ گاڑی چلتی رہی وہ خراٹے لیتے رہے اور میں سوچتا رہا۔ کچھ اس طرح سے سوچتا جس پر دیکھنے والوں کو اونگھنے کا گمان ہو۔ ایک بڑے اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ پلیٹ فارم پر ان کی پذیرائی کے لئے اتنے اور ایسے ایسے لوگ نظر آئے کہ مجھے خدشہ ہونے لگا کہ ان کی پذیرائی میری گرفتاری پر نہ ختم ہو۔ کچھ بڑے لوگ پلیٹ فارم پر مؤدبانہ ہاتھ ملانے لگے۔ ان سے چھوٹے اسٹیشن تھے اور جو ان سے بھی کمتر درجہ کے تھے وہ کمپارٹمنٹ سے سامان اتارنے کے لئے اس طرح جھپٹے کہ میں سمٹ کر اپنی سیٹ کے گوشے میں پاؤں اٹھا کر بیٹھ گیا کہ کہیں اسباب کے ساتھ اس خاکسار

"اسباب بغاوت ہند" کو بھی حراست میں نہ لے لیں۔

جس ہنگامے پر کمپارٹمنٹ اور پلیٹ فارم کی رونق تھی وہ کچھ ماند پڑی تو اپنے ہی جیسے حلیئے اور اوقات کے ایک صاحب سے دریافت کیا کہ یہ بزرگ کون تھے۔ انہوں نے نام اور القاب اور منصب بتائے تو اطمینان ہو گیا کہ جو کچھ ان کے بارے میں خیال تھا وہ صحیح تھا اور رسماً بھی کھانے پر مدعو نہ کرنے اور سموچے پیاز علی الاعلان کھانے میں وہ بالکل حق بجانب تھے۔ یا مظہر العجائب[1] یہ میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ ہاں تو بات کچھ کہنے جا رہا تھا سفر ریل اور تعطیل کی۔

ایک[2] سال یونیورسٹی میں غیر معمولی تعطیل ہوئی۔ یعنی غیر معمولی طور پر طویل۔ جس طور پر احمق شادی پر مرتا ہے اور بیوی سے بیزار ہوتا ہے۔ ہم کو بھی تعطیل اور طویل کے سلسلے میں انہیں مراحل سے گذرنا پڑا۔ یونیورسٹی بند ہوئی تو پھر سوچنا پڑا کہ آخر کیا کیا جائے۔ چنانچہ مرشد (ذاکر صاحب) سے رجوع کیا گیا۔ مرشد نے فرمایا۔ تعطیل گذارنے کی دو صورتیں ہیں یا تو ؏ سیر کر دنیا کی غافل نوجوانی پھر کہاں۔ اور یہ صورت اس حالت میں روا ہے جب صحت اچھی ہو اور روپئے نہ ہوں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیے۔ عزیزوں کی مدد کیجئے۔ کسی کی روپے سے، کسی کی کپڑے لتے سے، ایک کی تیمارداری کیجئے اور دو چار کی تجہیز و تکفین اور پھر بیمار، مفلوک، مقروض اور مطعون ہو کر واپس آ جائیے۔ طے یہ پایا کہ اس بارے میں مرشد کی ہدایت کو تسلیم کر لیا جائے۔ اب مسئلہ کی صورت یہ تھی کہ کہاں چلا جائے اور کب چلا جائے؟

---

[1] مضامینِ رشید صفحہ ۲۷۳-۳۰۲ [2] مضامینِ رشید صفحہ ۲۲۰-۲۲۱-۲۲۹-۹۴-

ایک دن ہم سب نے ع نکل گھر سے بس راہ شملہ کی لی ۔ خیال آیا کہ روپے کم اور سفر طویل ۔ سبیل ایسی ہونی چاہیے کہ یا تو سفر مختصر ہو جائے یا روپے فراہم ہو جائیں ۔ مجھ میں ایک کمزوری یہ ہے کہ کام شروع کر دینے کے بعد اس کا پروگرام بناتا ہوں ۔ چنانچہ جب تہائی سفر اور نصف روپیہ ختم ہو گیا تو خیال آیا ——— یہاں پہنچ کر آپ یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ کام شروع کرنے کے بعد پروگرام ہی کیوں بناؤ ——— کہتا ہوں یہ میری کمزوری ہے اور اپنی کمزوری تسلیم کرنے کے بعد آپ جتنی حماقتیں یا مظالم چاہیں کر سکتے ہیں ۔ کسی کو چون و چرا کی مجال نہیں ۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ بڑے آدمی ہوں ۔ میرے لئے یہ اکتفا کرتا ہے کہ میں کہہ دوں کہ جب ذہن میں پروگرام آگیا تو اس پر عمل ضرور کیا جائے گا خواہ وہ کام جس سے پروگرام متعلق ہو ختم ہی ہو چکا ہو ۔ اس بارے میں شعراء کا مقلد ہوں ۔ کوئی خیال آیا تو باندھا ضرور جائے گا خواہ اس حرکت پر لوگوں کو اپنا کرایہ دے کر شاعر صاحب کو پیٹنے ہی کیوں نہ آنا پڑے ۔ بہر حال راستے میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ مرشد دہلی اتر پڑے (میرے ایک دوست) میر منجھو دینگ ٹھہر گئے اور میں مکان واپس آگیا ۔

میر منجھو[1] اور مرشد (ذاکر صاحب) سے نجات پا کر علی گڑھ واپس آیا ۔ اتفاقِ وقت خبر آئی کہ عزیزوں میں ایک صاحب شادی کرنے والے ہیں دوسرے صاحب سفرِ آخرت کر گئے ۔ تیسرے صاحب آمادۂ رحلت ہیں اور چوتھے حضرت ہمارے ہاں تشریف لانے والے ہیں ۔ یہ آخری خبر ایسی بدحواس کن ثابت ہوئی کہ فی الفور بیوی بچوں کو محفوظ مقام پر بھیج دیا گیا

---

[1] ۔ مضامین رشید صفحہ ۲۳۰ ۔

اور میں نینی تال کے لئے روانہ ہو گیا۔

۵

دورِ حاضرہ کے معاشرہ اور نوجوانوں کی بے راہ روی پر تشویش، فکرمندی اور غم و الم

جہاں سنیئے جدھر دیکھئے نوجوانوں کا یکساں حال ہے۔ ایک زمانہ تھا بھلا یا بُرا، جب اخلاق و عادات میں نوجوان اپنے بوڑھوں اور بزرگوں کی تقلید کرتے تھے۔ اب بوڑھے اور بزرگ نوجوانوں کے اخلاق، عادات، لباس اور طور طریقوں کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ بوڑھوں کا یہ طریقہ جتنا مضحکہ خیز ہے اتنا ہی عبرت انگیز بھی ہے۔ یوں تو زمانے کا دستور ہمیشہ سے یکساں چلا آتا ہے لیکن ایک نئی بات ضرور محسوس ہوتی ہے کہ پہلے زمانے میں بوڑھا ہونے سے قبل ہی لوگ اپنے کو بوڑھوں کے زمرے میں شمار کرنے لگتے تھے اور اسے شرافت اور وضع داری کا تقاضا اور امتیاز سمجھتے تھے۔ اب بوڑھا ہونے پر بھی اپنے کو بوڑھا سمجھنا عار سمجھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اکثر ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو اپنے کو نوجوانوں سے بھی زیادہ نوجوان قرار دیئے جانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ کہتے ہیں اس طرح کی خود فریبی سے عمر بڑھتی ہے عقل گھٹتی ہے تو گھٹتی رہے۔

اب صورتِ حال کچھ اس طرح کی ہے کہ فرد ہو یا جماعت اپنے کو ہر طرح کے احتساب سے آزاد سمجھتی ہے جس کے جی میں جو آتا ہے کہہ ڈالتا ہے۔ چاہے اس کا نتیجہ کچھ ہی ہو۔ اب گناہ گناہ نہیں رہا۔ مان یہ لیا گیا ہے کہ جرائم کے ارتکاب برا نہیں صرف اتنی احتیاط ضرور کرلینی چاہیئے کہ ملک کا قانون گرفت میں لے کر سزا نہ دے دے۔ رہے اخلاقی گناہ ان کو ہر شخص

کا ذاتی معاملہ قرار دے کر نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ ایسے معاملات میں دخل دینا فرد کی آزادیٔ فکر و عمل میں مخل ہوتا ہے جو سب سے بڑا گناہ یعنی رکاکت ہے مثلاً ناداری اور بھوک سے مجبور ہو کر کوئی بدنصیب دو مٹھی اناج یا ایک آدھ روٹی چرا لے تو اسے جیل خانے بھیج دیا جائے لیکن اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو زدو کوب کرتا رہے اور دوسرے کی بیوی سے التفات کرے تو یہ اس کا ذاتی فعل ہے۔ اس میں حائل ہونا بد مذاقی ہے حالانکہ یہ ایک امر مسلّمہ ہے کہ اچھے یا بُرے شخصی اعمال ہی سوسائٹی کے قوام کو بناتے یا بگاڑتے ہیں۔ بالفاظ دیگر شخصی یا نجی بداعمالی جس کو ہماری تہذیب نظر انداز کرتی ہے۔ وہی قومی و اجتماعی بداعمالی کی محرک اعظم ہوتی ہے۔

اسے ایک تسلیم شدہ اصول مان لیا گیا ہے کہ جو خرابیاں ہم اپنے ارد گرد پاتے ہیں ان کے اسباب جہالت، افلاس، بیماری اور ناموافق ماحول ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری کوششوں سے ان مصائب میں بہت کچھ کمی آ گئی ہے اور بتدریج آتی جا رہی ہے جسے بحیثیتِ مجموعی ہم نے معیارِ زندگی کی بلندی کا نام دے رکھا ہے پھر کیوں

ع "ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر می بینم"

معیارِ زندگی کے اونچا ہونے سے معیارِ اخلاق کیوں اونچا نہیں ہوتا۔ ایسا تو نہیں کہ اس نظریئے میں کوئی مغالطہ راہ پا گیا ہو۔ حالات کو دیکھتے ہوئے گمان یہ ہوتا ہے کہ یا تو معیارِ زندگی کے نشیب و فراز کا کوئی علاقہ معیارِ اخلاق کے نشیب و فراز سے نہیں یا پھر معیارِ زندگی کو ہر حال میں بڑھانا چاہیئے۔ معیارِ اخلاق اپنی صحت و سلامتی کے لئے کوئی دوسرا دروازہ دیکھے۔

زندگی کے معیار کو بلند کرنے کے لئے جو ذرائع اور وسائل اختیار کئے جا رہے ہیں وہ ٹھیک ہیں لیکن ان کی مضرتوں سے بچنے اور بچانے کے لئے اخلاقی اقدار کو مؤثر و مستحکم کرنے کی بھی اتنی ہی کوشش کرنی چاہئے۔ ایک ترقی یافتہ قوم اور ملک کے جرائم و ذمائم غیر ترقی یافتہ قوم اور ملک کے جرائم و ذمائم سے کہیں زیادہ سنگین اور دور رس ہوتے ہیں۔ معیارِ زندگی کو یکطرفہ ترقی دینے کے خطرات کی طرف توجہ کم مائل ہوتی ہے شاید اس لئے کہ ثواب کمانے سے کہیں آسان گناہ سے فائدہ اٹھانا ہوتا ہے۔

اس طرح کے دور راز کا خیالات میں دیر تک اونگھتا رہا۔ اس کے بعد زندگی کے معمولات شروع ہو گئے اور "چنیں پندارد کہ ایں کشائش با اوست" کا طلسم ٹوٹ گیا۔

"واقعہ یہ ہے کہ از کار رفتہ اور تقریباً "مابعد الطبیعات" ہو جانے کے باوجود یہ خیال برابر آتا رہتا ہے کہ تیمور کے گھر کی حمیت کہاں گئی اور کیوں گئی؟ کیوں گئی۔ اس کا جواب تو واضح ہے کہ شامتِ اعمال کی زد میں آ گئی رہا یہ کہ کہاں گئی۔ اس کے بارے میں گمان ہوتا ہے وہ کہیں گئی نہیں ہے صرف متاعِ کاسہ ہو کر رہ گئی ہے اس لئے کوئی اس کا خواہاں نہ رہا۔

"طلباء کی تقریباً تین نسلوں کو دیکھتا چلا آ رہا ہوں کہ کہاں سے کہاں چلے جا رہے ہیں۔ تکلیف ضرور ہوتی ہے لیکن تعجب نہیں ہوتا اس لئے کہ آج کل کافی تعداد ایسے اساتذہ کی دیکھنے میں آتی ہے جو بالعموم غیر ذمہ دار ہیں اور قابلِ اعتراض غیر منصبی سرگرمیوں کو ذمہ داری اور منصبی فرائض پر ترجیح دیتی ہے۔ اس پر ستم یہ کہ یہ اپنے آپ کو ہر جواب دہی سے بری بھی سمجھتے ہیں اس لئے کہ اخلاقی تقاضوں کو پہلے سے نظر انداز کر چکے ہوتے ہیں۔

آج[1] کل کے اکثر معلم دھوبی سے کم نہیں ہوتے۔ وہ شاگرد کو اس طرح دھوتے پچھاڑتے، اینٹھتے اور اس پر استری کرتے ہیں جیسے دھوبی کرتا ہے آپ نے بعض دھوبیوں کو دیکھا ہوگا اچھی طرح دھونے کی مشقت سے بچنے کے لئے اور مالک کو دھوکا دینے کے لئے اکثر سفید کپڑے میں نیل کا ہلکا سا رنگ دے دیتے ہیں۔ دھوبی کو اس کی مطلق پروا نہیں ہوتی۔ سر پر سے گھما گھما کر کپڑے کو پتھر پر ٹپکتا یا موگری سے اس کی خبر لیتا اور خوب اینٹھ اینٹھ کر نچوڑتا اور اس کا لحاظ نہ کرتا کہ کپڑا نازک ہے یا مضبوط۔ رنگ گہرا ہے یا ہلکا، پائیدار ہے یا ناپائیدار، اس کا کیا حشر ہوگا۔ بٹن کہاں جائیں گے "دامن کے چاک اور گریباں کے چاک ہیں۔" فرق باقی رہے گا یا نہیں لباس کی وضع قطع کیا ہو جائے گی۔ استری ٹھیک گرم ہے یا نہیں۔ ٹھنڈی استری کرنا چاہیئے یا گرم بالکل اسی طرح معلم کو اس کی پروا نہیں کہ طالب علم کس قماش کا ہے۔ اس پر کیا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اس کے دل و دماغ کا کیا عالم ہے۔ کس فضا میں اس نے آنکھ کھولی ہے معلم تو اسے دے دے مارتا ہے اور بھُرکس نکال دیتا ہے۔ وہ طالب علم کی استعداد اس کے میلانات، ولولوں اور اس کی الجھنوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ ان سے اپنی نااہلی کا انتقام لیتا ہے۔ اپنے تراشیدہ بتوں کا پجاری بنانا یا اپنے ناکام خداؤں کی بندگی کرانا چاہتا ہے۔ چنانچہ یہ سارے مرحلے طے کر کے طالب علم دنیا کے بازار یا گاہک کے ہاتھ میں آتا ہے تو اس کے ذہن و دماغ سب جواب دے چکے ہوتے ہیں۔ اس پر جو رنگ چڑھا دیا گیا ہوتا ہے اور کلف دے کر اس پر جو بے تکی اور بے تکان استری کی ہوتی ہے وہ حوادث کے ایک ہی چھینٹے

---

[1] نقوش لاہور۔ مارچ ۱۹۶۳ء جنوری ۱۹۶۳ء ۔

یا روزگار کی پہلی ہی گردش میں کچھ کا کچھ ہو جاتی ہے۔

"علم کا مفہوم میرے نزدیک جاننا پہچاننا ہی نہیں۔ جاننے پہچاننے کی ذمہ داری بھی ہے۔ جب تک کوئی معلم علم کی برگزیدگی کو ماننے اور منوانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو۔ اس کو علم کا کاروبار نہ کرنا چاہیئے۔ آج کل دنیا میں جو ہل چل افراتفری یا بے دلی اور بے زاری پھیلی ہوئی ہے اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ علوم کو پھیلانے کے وسائل تو بہت بڑھ گئے ہیں لیکن اچھے معلم تقریباً ناپید ہیں جس کی وجہ سے علم اور زیادہ خطرناک بن گیا ہے۔ دنیا میں ہر مرض کی تیر بہ ہدف دوائیں کیوں نہ ایجاد کر دی جائیں اگر اچھے اطبا میسر نہ ہوں تو یہ دوائیں خطرے کا موجب بن سکتی ہیں۔ یہی حال علوم کا ہے۔ ایک طرف یہ حال ہے۔ دوسری طرف[1] طلبا میں جو اساتذہ کی "روشن خیالی" "وسیع النظری" یا کردار کی خامی سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ "آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا" کے انداز سے امتحان کے کمرے میں پرچہ کرنے بیٹھتے ہیں اور ہر مواخذے سے بے خبر کتابوں یا پرزے پرچیوں سے جوابات نقل کر کے آس پاس والوں کی مدد یا دوسرے طرح طرح کے ناجائز ذرائع و وسائل سے اول درجے میں پاس ہوتے ہیں اور وہ تمام فوائد حاصل کرتے ہیں جن کا مدار اول درجے میں کامیابی حاصل کرنے پر ہوتا ہے۔ اس ناگفتہ صورتحال سے کون نہیں واقف ہے۔ شاید اسی سبب سے اس کا تدارک ضروری نہیں سمجھا جاتا۔

گزشتہ[2] زمانے میں نوجوانوں کو ریاضت کرنے اور نتیجہ کا انتظار کرنے کی

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۳۲۲ — [2] آشفتہ بیانی میری صفحہ ۱۰۴

تلقین کی جاتی تھی اور اس پر عمل کیا جاتا تھا۔ اس سے ان میں بے صبری، بے اعتمادی یا غیر ذمہ داری کے جذبات پیدا نہیں ہونے پاتے تھے۔ نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچنے کا سب سے آسان اور زود اثر نسخہ یہ ہے کہ ان کو جارحانہ بلکہ مجرمانہ اقدام کی دعوت دی جائے۔ گزشتہ بیس پچیس سال سے ان کو یہی راستہ دکھایا گیا ہے۔ اس میں اشتراکیت، مذہبیت، قومیت سب نے حسبِ توفیق حصہ لیا ہے۔ ظاہر ہے جہاں انقلاب کو دعوت دینے اور بغاوت کرنے کا اذن عام ہو وہاں ریاضت اور انتظار کو کون قابلِ التفات سمجھے گا۔ جہاں محاسبہ ختم ہوا مجادلہ شروع ہو جائے گا۔

"دراصل انسان کی صالح و صحت مند زندگی کا دارومدار اس پر ہے کہ اس کے ہاں اقدار کی اہمیت کیا ہے اور اقدار کے لئے ضروری ہے کہ ان میں استقلال ہو اور وہ ہوا کے ہر جھونکے سے زیر و زبر نہ ہوں۔ اقدار نتیجہ ہوتے ہیں۔ مدتوں کے تجربے اور ریاضت کا زندگی کی کشتی کو طرح طرح کے طوفانوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اقدار وہی کام کرتے ہیں جو لنگر اور ناخدا کرتے ہیں۔ آج سے پہلے زندگی میں وہ "مرکز گریز" سرعت اور شدت نہیں تھی جو اب ہے اور یہ آئی ہے عقل چکرا دینے والی اس صدی کی ان ایجادات سے جنہوں نے زندگی کی آنے والی صدیوں کو مہینوں اور ہفتوں میں سمیٹنا شروع کر دیا ہے۔ مستقبل کو حال میں کھینچ لانے کی مدت جتنی مختصر کرتے جائیں گے اتنی ہی جلد حال، ماضی میں منتقل ہوتا رہے گا اور ماضی کی قدر و قیمت کم ہوتی جائے گی۔ کسی[1] ماضی کی اہمیت کا مدار محض اس کے ماضی ہونے پر نہیں ہے بلکہ اس پر ہے کہ کس حد تک وہ حال اور مستقبل کی صحیح اور صحت مند

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۷۹۔

رہبری کر سکتا ہے۔ حال و مستقبل کی اہمیت اسی بنا پر ہے کہ دونوں ماضی کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے اصولاً یا کلیتاً ماضی سے روگردانی نہیں کر سکتے جہاں اور جب یہ صورتِ حال ہو گی وہاں زندگی میں اختلال راہ پائے گا اور غیر یقینی بڑھے گی۔ آج کل ہم اسی دور سے گذر رہے ہیں۔

[1] میں نے یونیورسٹی میں چوتھائی صدی کے لگ بھگ معلمی کی ہے۔ اکابر کی تصانیف پڑھی ہیں۔ ان کی صحبتیں اٹھائی ہیں۔ نوجوانوں کو سچ کی تلاش اور سچ کے اعلان پر آمادہ کیا ہے۔ غالباً[2] ۱۹۲۲ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا پہلا کنووکیشن منعقد ہوا جب سے آج تک اس قسم کی جتنی تقریبیں منعقد ہوئیں اسٹاف کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے تقریباً سب میں شرکت کا اتفاق ہوا ــــــ حسب معمول ڈگریاں دیں اور در پردہ اخلاقی ضمانتیں لی جاتی رہیں کہ سند پانے والے سند کی حرمت ملحوظ رکھیں گے۔ وقت کی جید شخصیتیں اخلاق حسنہ اور مسائل مہمہ پر خطبات دیتی رہیں اور امید کی جاتی رہی کہ یونیورسٹی کے یہ نوجوان ملک و قوم کی بہترین متاع ثابت ہوں گے لیکن زیادہ تر دیکھنے میں یہ آیا کہ سند یافتوں میں بحیثیت مجموعی سیرت کے اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ جیسے طالب علمی یا نوجوانی کسی زہریلے مادے (VIRUS) کا شکار ہو جس کے ازالے کی یا تو ضرورت نہ سمجھی جاتی ہو یا یہ وائرس ہی کچھ ایسا ہو جو میڈیکل سائنس کے قابو میں نہ آتا ہو۔

"میں نہ حکیم، نہ عطائی، نہ لیڈر ــــــ ممکن ہے ان کا خلاصہ ہوں ــــــ اکثر یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہر بستی کا صرف ایک سینما نوجوان لڑکے، لڑکیوں کے اخلاق و عادات کو ایک دن میں جتنا بگاڑ دیتا ہے

---

[1] خطبۂ صدارت کل بہار اردو کانفرنس مطبوعہ مسلم یونیورسٹی میگزین ۱۹۵۲ء صفحہ

[2] فکر و نظر علی گڑھ مطبوعہ اکتوبر ۱۹۶۳ء صفحہ ۵۸

اُس پاس کی تمام تعلیم گاہیں مل کر ان کو ایک سال میں راہِ راست پر نہیں لاسکتیں. ایسا کیوں نہ ہو. جب کسی نہ کسی خوبصورت علمی یا تہذیبی نام سے سینما اور تھیٹر کے متنیٰ خود ان درسگاہوں میں موجود ہوں. اس طرح کی سرگرمیوں کو سراہا نہ جاتا ہو اور ان کو فروغ دینے میں ہمارے بڑے سے بڑے لیڈروں کا ہاتھ نہ ہو.

"انسان کے حیوانی خصائل کو قابو میں رکھنا تعلیم و تربیت و تہذیب کا اولین مقصد ہے. انسانی خصائل کو ڈھیل دینا، بزدلی، حماقت اور شرارتِ نفس. اس سارے فتنہ و فساد کا سبب جن میں ہم مبتلا ہیں نہ اتنا سینما ہے نہ تعلیم گاہیں جتنی یہ کہ ہم پر معاشرے کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے یا ہم اس کے احتساب سے آزاد ہو گئے ہیں. کبھی کبھی تو اس طرح کا خیال دل میں گذرتا ہے کہ جس طرح اگلے زمانے میں جہاں تہاں آج بھی ملک کے اندر بے اطمینانی یا بدامنی کے آثار پیدا ہونے لگتے تو لوگوں کا ذہن دوسری طرف منتقل کر دینے کے لئے حکومتیں کوئی نئی مہم تصنیف کر دیا کرتی تھیں. اسی طرح آج کل تعلیم یافتہ بیروزگاروں یا نوجوان طلباء و طالبات کو اپنے مستقبل پر غور کرنے اور صورتحال کو بدل دینے کے ارادے سے باز رکھنے کے لئے طرح طرح کی تفریحی مسکرات اور تخریبی نعرے فراہم کر دیا کرتی تھیں . . . . بہر حال ہم ان دنوں ایک عام ذہنی انتشار میں بتلا ہیں جس نے ہماری صحیح قوت فیصلہ کو معطل و متزلزل کر رکھا ہے اور اس کا مداوا نہ شراب ہے.

نہ افیوں نہ کشت و خوں.[1]

"ایک کنووکیشن میں شریک ہو کر گھر واپس آرہا تھا. تھوڑی ہی دیر

---

[1] فکر و نظر علی گڑھ اکتوبر ۱۹۷۳ء صفحہ ۶۴ .

پہلے جلسہ ختم ہوا تھا اس لئے سڑک پر بڑا ہجوم تھا۔ چار چار طالب علم سائیکلوں پر سوار دوش بدوش شور مچاتے خوش فعلیاں کرتے پوری سڑک پر قابض اس طرح رواں دواں تھے جیسے سڑک اور سائیکل دونوں انہیں کے لئے اور اسی موقع کے لئے بنائی گئی تھیں اور کنووکیشن سے کسی سرکس یا نوٹنکی سے لطف اندوز ہو کر اسی موڈ میں واپس جا رہے تھے۔

"کچھ دیر تک ایک طرف کھڑا رہا کہ سائیکل سواروں اور قوم کے نونہالوں کا یہ سیلاب گذر جائے تو دوسری سمت پہنچ کر گھر کا راستہ لوں۔ اسی اثنا میں ایک اور اسکواڈ گذرا۔ پہلے سائیکل سوار نے صف کے آخری سوار کو بڑی بے تکلفی سے بہ آواز بلند ایک نجس فقرے سے مخاطب کیا اور اس طرح کی بات کہی جس کو دہرایا نہیں جا سکتا۔ مخاطب نے اپنے ساتھی سے بھی زیادہ بلند قہقہہ لگا کر ایک نجس تر کلمے سے جواب دیا۔ آس پاس کے سائیکل سواروں نے اس خوش کلامی اور برجستہ گوئی پر اظہار تحسین کیا جیسے مشاعرہ میں کسی اچھے شعر یا شاعر کو داد دی جاتی ہے۔

"نوجوانوں کی یہ حرکت دیکھ کر شرمندگی اور غم سے بے قرار ہو گیا۔ یہ نوجوان ایسے تھے کہ کسی تعلیم گاہ تو در کنار کوئی صحت مند معاشرہ ان کو بازاروں اور گلی کوچوں میں بھی گھومنے پھرنے کی آزادی نہ دے گا۔ گذشتہ تقریباً پچاس سال میں شارع عام پر کہیں بھی طالب علموں کو اس طرح بے باک اور بے جھپک ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ بالخصوص جب یہی نوجوان ذرا دیر پہلے علم و فضیلت کی سندیں لے کر اور اس طرح کی باتیں سن کر پنڈال سے باہر آئے تھے اور ان کے گرد و پیش اساتذہ، لڑکیوں، خواتین، سن رسیدہ اشخاص اور کچھ تعجب نہیں خود ان نوجوانوں کے ماں باپ

بھائی بہن، سب کے سب ملے جلے رہ نورد ہوں۔ تعلیم گاہوں میں ایسے ہی عناصر کے کرشمے طرح طرح کی شکلوں میں ہماری قومی زندگی کو زیرو زبر کرتے ہیں۔

"آج کے طلبا نظر کے سامنے آتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دفعتاً ہم سب چھوٹے بڑے، امیر و غریب یکسر نالائق اور ننگے ہو گئے ہوں۔ لباس اور اخلاق دونوں اعتبار سے اپنی جہالت خود فریبی اور تنگ نظری کا بھی احساس ہوا کہ جس کو آزادئ افکار و اعمال کہتے ہیں معیارِ زندگی کی ترقی اور بلندی جس کا نام ہے جس کو فطرت سے قریب ہونا اور تربیت و تہذیب سے بہرہ مند ہونا بتایا جاتا ہے۔ ان سب سے کس درجہ نابلد اور محروم ہوں مگر کیا کروں۔ بدتمیزی و بداعمالی پر ایمان لانے کی مشق میں قبر سے قریب ہو گیا لیکن ترقی کے یہ تصورات حلق سے نیچے نہیں اترے۔

"لیکن[1] یہ واویلا بے محل اور بے معنیٰ ہے۔ زمانہ بدلتا رہا ہے اور بدلتا رہے گا۔ اس کے ساتھ خوش و ناخوش ہمارا آپ کا بھی بدلتے رہنا لازمی ہے ہر نسل کے طور طریق جداگانہ ہوتے ہیں۔ زندگی کو اس مفروضے سے نہیں پرکھنا چاہیئے کہ پہلے مسعود تھی اب نامسعود، زندگی اور زمانے کا جائزہ زندگی کے نت نئے بدلتے ہوئے تقاضوں کے پیش نظر لینا چاہیئے۔ بہت سے اُمور میں آج کی زندگی پہلے کی زندگی سے بدرجہا بہتر ہے اور بعض اعتبار سے نہیں بھی ہے۔ یہ دستور ہمیشہ سے چلا آرہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

"بے شک ہم نے پہلے سے کہیں زیادہ فطرت کے بھیدوں اور اس کی درازدستیوں پر قابو پالیا ہے اور "بر عناصر حکمراں بودن خوش است"

---

[1] فکر و نظر علی گڑھ بابت اکتوبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۶۲

کا امتیاز حاصل کر چکے ہیں لیکن آبادی کی بے پناہ افراط، قطع مسافت کی روز افزوں سرعت و سہولت، جس نے دوریٔ منزل کے تصور کو ناقابلِ التفات اور ایک دوسرے سے ملنے ان کے عادات، اطوار و رسم و روایات سے متاثر ہونے کی خوبی و خرابی کے امکانات کو بہت بڑھا دیا ہے۔ حوصلے اور ہوس کا طوفان بے اماں، جینے اور جینے دینے کے پیچیدہ و صبر آزما مسائل کی گتھیاں ایسے ایسے مراحل سامنے آرہے ہیں کہ ان سے عافیت و آبرو کے ساتھ گذر جانا محال ہوتا جا رہا ہے۔

"بر عناصر حکمراں بودن خوش است" کا فارمولا ان دشواریوں کا حل نہیں پیش کرتا بلکہ ان میں اضافہ کرتا جا رہا ہے۔ عناصر پر قابو کے ساتھ ساتھ نفس و جبلت پر قابو پانا پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔ ان میں توازن پیدا کئے بغیر ہم عافیت و عزت کی زندگی نہیں بسر کر سکتے اس توازن کے قائم ہونے کا امکان قریب ہونے کے بجائے روز بروز دور ہوتا جا رہا ہے۔ با ایں ہمہ زندہ اور خوش رہنے کی فطری خواہش اور انسانیت کے تقاضے اتنے قوی ہیں اور اجتماعی زندگی کو وسیع تر پیمانے پر بسر کرنے کی ضرورت اتنی بڑھ گئی ہے کہ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ انسان بالآخر فلاح کا راستہ دریافت کر کے رہے گا۔"

علیگڑھ کے موسم اور وہاں کی موت پر مخصوص انداز میں اظہارِ خیال

علی گڑھ کا گرمی کا زمانہ بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اکثر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے اس موسم میں قضا و قدر ہم سے آدمیت کا شرف چھین لیتے ہیں۔ گرد، گرمی، تیز لو، تمام موجودات پر کرب و کراہت کا عالم، موت سے ڈرنا تقضائے فطرت ہے لیکن ہر قیمت

پر زندہ رہنے کی خواہش بھی کسی لعنت سے کم نہیں۔ ساری زندگی نیک نامی میں بسر کرنے کے بعد علیگڑھ میں گرمی کے زمانے میں مرنا بڑی ہی بدنصیبی ہے دوڑ دھوپ، تجہیز و تکفین کا انتظام، عزیزوں اور شریفوں کا میت کو دفنانے قبرستان لے جانا اور وہاں دیر تک انتظار کی زحمت اٹھانا بڑا تکلیف دہ خیال ہے جو آدمی جتنا بڑا ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ اس کی تجہیز و تکفین میں شریفوں کو اذیت اٹھانی پڑتی ہے۔ یہ صورتِ حال مرنے والے کے لئے کسی طرح موجبِ فخر نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح کے خیالات غالبؔ کے رہے ہوں گے جب انہوں نے یہ لافانی شعر کہا تھا:-

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

ویسے غالباً ۱۹۱۶ء کا زمانہ تھا، ایک دوست کو خط لکھا تھا کہ علی گڑھ کی دو باتوں سے میں بہت متاثر ہوا۔ ایک یہاں کا کرکٹ میچ، دوسرا جنازے کا قبرستان لے جانا۔ ایک کا ہمہمہ دوسرے کا حزن۔ ام۔ اے۔ او کالج کی بہت سی رسم و روایات میں تبدیلی راہ پا چکی ہے لیکن میت کو گورستان تک پہنچانے اور سپردِ خاک کرنے میں جو رکھ رکھاؤ پہلے دیکھنے میں آتا تھا آج بھی وہ قائم ہے۔[۱]

ہم عصر مشاہیر اور رفقائے کار

رشید صاحب اپنے عصر کے بعض علما، صلحا، ادبا، شعراء اور لیڈروں سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ان میں سے کچھ تو علی گڑھ میں ان کے رفقائے کار

۱۔ آشفتہ بیانی میری صفحہ ۸۲۔

بھی رہے تھے۔ چند برصغیر کی ایسی نامور ہستیاں تھیں جن کا جواب پیدا کرنے کے لئے ہزاروں سال نرگس کو اپنی بے نوری پر رونا پڑتا ہے اور کچھ رشید صاحب کے مخلص احباب اور شاگرد بھی تھے۔ ان کی مفارقت کے صدمے ان کو سہنے پڑے اور پھر اس جوشِ غم اور حزن میں انہوں نے ان پر وقتاً فوقتاً اپنے مخصوص انداز میں جو تاثرات پیش کئے ہیں وہ اُردو ادب کے شاہکار ہونے کے علاوہ بہترین خاکے شمار کیئے جا سکتے ہیں۔ ان مضامین کو پڑھ کر رشید صاحب کی ان اشخاص سے غیر معمولی محبت اور عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان مضامین کا کمال یہ ہے کہ ان میں لکھے جانے والوں کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچ دی گئی ہیں اور ان کی زندگی کے بیشتر گوشے ہمارے سامنے بے نقاب ہو گئے ہیں۔ اپنے رفقائے کار پر لکھنے میں انہوں نے علی گڑھ کو عقبی زمین کے طور پر پیش کیا ہے اور اس نے علی گڑھ والوں کے لئے عجیب سماں پیدا کر دیا ہے۔ ان کی زندگی کی سوئی پیچھے کی طرف تیزی سے چلنے لگتی ہے اور وہ اپنے کو ایک مرتبہ پھر اپنی جنتِ گم گشتہ میں موجود پاتے ہیں۔ ان اشخاص میں سید سلیمان اشرف مرحوم، علامہ اقبال مرحوم، سید سلیمان ندوی مرحوم، افضل العلماء ڈاکٹر عبدالغنی مرحوم، مولانا ابوبکر شیث مرحوم، پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس مرحوم، بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم، مختار احمد انصاری مرحوم، مولانا ابوالکلام آزادؔ مرحوم، اصغرؔ گونڈوی مرحوم، جگرؔ مرحوم، سجاد حیدر ریلدرم مرحوم شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم، نواب محمد اسمٰعیل خاں مرحوم، حسن عبداللہ مرحوم، محمد ایوب عباسی مرحوم جیسے اکابر شامل ہیں۔

ان میں اکثر اکابرین سے رشید صاحب نے بہت کچھ سیکھا ہے اور ان کی سیرت، شخصیت اور علمیت کی تشکیل میں بحیثیت مجموعی ان کا بڑا ہاتھ

رہا ہے۔ اس لئے ان میں سے ہر ایک کے بارے میں لکھتے وقت ان کے دل سے یہی آواز آتی ہوگی ؎

اے ہم نفسانِ محفلِ ما رفتید ولے نہ از دلِ ما

مولانا سید سلیمان اشرف مرحوم

"زندگی[1] میں ہر طرح کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا لیکن اکثر محسوس یہی ہوا کہ مخاطب میں کہیں نہ کہیں کوئی خامی ہے۔ کوئی بڑا مخلص ملا تو اتنا ہی ثقہ اور روکھا پھیکا، کوئی ہنسنے ہنسانے والا ہوا تو یہ محسوس ہوا کہ اس میں تھوڑا بہت گنوار پن بھی ہے۔ کوئی بڑا عالم فاضل ہوا تو اس میں نخوت تنگ نظری اور کم ظرفی بھی کسی نہ کسی حد تک پائی گئی۔ اللہ والے ملے تو انہیں دنیا کے کام کا نہ پایا۔ کسی منکرِ خدا کو ایسا نہ پایا جو کچھ اور نہیں رسول کی شرافت اور عظمت کا تو قائل ہوتا۔ لیکن مولانا سلیمان اشرف مرحوم کی شخصیت اتنی جامع اور متنوع تھی کہ وہ ہر موضوع اور ہر موقع سے اس خوبی سے عہدہ برآ ہوتے کہ ان کی صحبت میں جی لگتا اور کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ فلاں جگہ کمی ہے جسے پورا کرنے کے لئے اور کو ڈھونڈنا چاہیئے۔

میرا ان کا بیس بائیس سال سے ساتھ تھا۔ پہلے پہل ملا تو علی گڑھ میں نو وارد کسمپرس طالب علم تھا۔ جب ان کا ساتھ چھوٹا ہے تو سب کچھ تھا۔ دوسروں کے نزدیک نہ سہی۔ اپنے نزدیک سہی۔ میں نے بھی اس مدت میں بہت کچھ دیکھا، سنا اور برتا ہے اور اپنے نزدیک اپنی ہر استعداد پر کچھ نہ کچھ اعتماد بھی رکھتا ہوں لیکن اب غور کرتا ہوں تو حلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ صفحہ ۳۵۲ - ۳۸ ۔

مرحوم نے جو سلوک مجھ سے ابتدا میں رکھا وہی آخر دم تک قائم رہا۔ انہوں نے اپنی خداداد ذہانت واخلاص سے ہمیشہ وہ سطح قائم رکھی جس کو میں نے اپنے نزدیک اپنی استعداد اور اپنی آرزو کے عین مطابق پایا۔ مولانا کی صحبت سے جب کبھی اٹھا تو معلوم ہوتا کہ میں نے کوئی نئی اور اچھی بات سیکھی یا کوئی نیا اور اچھوتا جذبہ پیدا ہو گیا۔ پریشان و مایوس ہوا تو ان کی صحبت سے ہشاش بشاش اٹھا۔ رنج یا غصہ ہوا تو مرحوم کی باتوں سے غم غلط ہو گیا۔ خالی الذہن گیا تھا تو معلومات کے ایسے نادر و لطیف نکتوں سے بہرہ مند اٹھا جو شاید مدتوں کے مطالعے یا مشاہدے سے حاصل نہ ہو سکے۔

میرا پہلا مکان ان کی اقامت گاہ دو منزلہ سے بہت قریب تھا۔ گھر میں کوئی زیادہ بیمار ہوتا اور طبیعت پریشان رہتی تو نہ کہیں جانا اچھا معلوم ہوتا اور نہ گھر کے اندر رہنے کی ہمت پڑتی۔ کبھی کبھی دروازے سے باہر نکلتا تو مرحوم اپنے چبوترے پر لمبی کشادہ آستینوں کا ململ کا سفید کرتا پہنے چہل قدمی کرتے نظر آتے۔ دیکھ کر دل کو ڈھارس ہو جاتی۔ سوچتا کہ مرحوم اس وقت کوئی نہایت ہی اچھا شعر گنگنا رہے ہوں گے۔ اگر چلا جاؤں گا تو وہ اس طور سے خیر مقدم کریں گے کہ طبیعت بحال ہو جائے گی۔ بس اتنا ہی احساس میری تسکین قلب کے لئے کافی ہوتا۔ میں مکان کے اندر جاتا اور دعا کرتا کہ خدا اطمینان دے تو مولانا کے ہاں جاؤں اور جی بھر کر ان کی شفقت مرحمت اور لطافت سے جی سیر کروں۔

مرحوم جو چیز رکھتے تھے اس میں کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور ہوتی اور بہت دلکش ہوتی بڑی قیمتی ہوتی یا اس کے ساتھ کوئی خاص روایت وابستہ ہوتی۔ ایک دفعہ افغانستان سے ایک گرم عبا منگائی تھی۔ ایک دن میں پہنچا

تو بولے، خوب آئے۔ گجن وہ عبا تو لانا۔ یہ بھی کیا کہیں گے کہ مولوی صاحب کے پاس کیسے کیسے مال غنیمت ہیں۔ عبا لائی گئی۔ بڑے شوق سے پہنا بولے کیا رائے ہے۔ میں بہت قریب پہنچ کر دیکھنے لگا۔ بولے خیریت تو ہے۔ اس قدر انہماک کا اظہار کیوں کیا جا رہا ہے۔ میں نے عرض کیا۔ کیا کہوں اس طرح کی چیز اس دن جلسہ میں نواب مزمل اللہ خاں کو پہنے دیکھا تھا ان کے قریب تو جانے کی ہمت نہ ہوئی آج آپ کے پاس ویسی ہی چیز دیکھی تو کہا موقع اچھا ہے۔ اس تختِ طاؤس کو ذرا چھو چھا بھی لوں۔ بڑے زور سے ہنسے۔ کہنے لگے باز نہ آؤ گے۔ اچھا ایک پان بناؤ۔ اور یہ تو بتاؤ تمہارا ایاز ذاکر کہاں ہے۔ بڑا مرد آدمی ہے۔ ذرا صحبت اچھی نہیں ہے۔ میں نے کہا جی ہاں۔ ان دنوں صحت اچھی نہیں ہے۔ بولے یہ کیا۔ میں کہتا ہوں اس کا ساتھ نامعقولوں سے پڑا ہے، تم کہتے ہو صحت اچھی نہیں ؟۔ پھر آواز دی۔ جُمّا ذرا ایک طشتری میں رشید کے لئے پنڈی تو لانا۔

بہت دنوں کی بات ہے میں کلاس میں لوائح جامی اور گلشنِ راز پڑھایا کرتا۔ ان میں بعض مقامات میری سمجھ میں نہ آتے تھے۔ کبھی کبھی اپنی دقتیں لے کر مرحوم کے پاس پہنچ جاتا۔ بہت خوش ہوتے۔ کہتے بیٹھو۔ میں کہتا مولانا کلاس شروع ہونے والی ہے۔ صرف چند مقامات ہیں جہاں اٹکتا ہوں۔ فرمایا یہی تو مصیبت ہے۔ تفصیل سے باتیں نہیں سنتے۔ تھوڑا سا پا لیا اور بھاگ نکلے۔ طالب علم یہ نہیں کرتے۔ یہ کام اٹھائی گیروں کا ہے۔ پگڑیاں ہوں یا ڈگریاں سب اٹھائی گیرے ہیں —— علم کی عظمت

لے گنج ہائے گراں مایہ صفحہ ۱۳۴۔

باقی نہیں رہی تو طالب علم میں سعادت کہاں سے آئے۔ میں نے کہا گھنٹہ ہونے والا ہے۔ آخر اٹھائی گیروں پر بھی تو برا وقت آتا ہے۔ کہتے اچھا اچھا بولو پڑھو۔ میں پڑھنا شروع کرتا۔ بیچ ہی میں روک دیتے۔ کہتے معلوم ہے۔ پھر اس کی وضاحت کر دیتے اور چلنے لگتا تو کہتے دیکھو پھر کہتا ہوں قرآن پڑھ ڈالو۔ لوائح جامی اور گلشن راز کلاس میں پڑھا دو گے لیکن قرآن پڑھے بغیر لکھے پڑھے لوگوں کے مجمع میں ان مباحث کو مت چھیڑنا۔ آگے تم جانو اور تمہارا کام اور ہاں ایک پان کھاتے جاؤ۔ میں نے کہا جی نہیں، کلاس بھاگ جائے گی۔ کہتے ٹھہرو ٹھہرو۔ پڑھانا آتا ہے تو کلاس بھاگ جائے تو بھاگ جائے پڑھنے والے انتظار کرتے رہیں گے پان تو کھاتے ہی جاؤ۔

مرحوم[۲] علیل ہوئے تو روز بروز حالت گرتی ہی گئی ——— اس دوران عرصہ تک میں حاضر نہ ہو سکا۔ جس شخص کو تندرستی، زندہ دلی، استقلال، واستقامت کا جیتا جاگتا نمونہ دیکھ چکا تھا اسے بے بس و ناتوان دیکھنا میرے بس کا نہ تھا۔ ایک روز دل کڑا کر کے میں بھی حاضر ہوا۔ کچھ دیر تک میں کمرہ میں مرحوم کی چارپائی سے لگا بیٹھا رہا۔ حالت دیکھ کر طبیعت بے اختیار ہونے لگی۔ میری وہ حالت تھی جب آدمی دعا نہیں مانگتا۔ شاید مانگ بھی نہیں سکتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ دعا مانگنا عبث ہے۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ ہر چیز دگرگوں ہو جائے۔ ناممکن ممکن ہو جائے۔ میں چلا آیا اور پھر نہ گیا۔ دو دن بعد مولانا سلیمان اشرف صاحب کا انتقال ہو گیا۔

۲؎ گنج ہائے گراں مایہ صفحہ ۷۰-۷۱-۷۲۔

میرا ان کا خون کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ صرف علی گڑھ کا رشتہ تھا۔ لیکن کس سے کہوں اور کون سمجھے گا کہ اس رشتے میں کیا تھا اور کیا نہ تھا۔ وہ میرے لئے عزیزوں سے زیادہ عزیز تھے بزرگوں سے زیادہ بزرگ اور دوستوں سے زیادہ دوست۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم

بڑی گرمی پڑ رہی تھی۔ دور دراز کے سفر سے واپس آرہا تھا۔ علی گڑھ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اترا ہی تھا کہ ایک عزیز نے کہا ڈاکٹر سر محمد اقبال کا انتقال ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے لئے بہت تھوڑی دیر کے لئے کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے پلیٹ فارم کی ہر چیز موجود تو ہے لیکن اس کی نہ کوئی آواز ہے اور نہ اس میں کوئی حرکت۔ یہ بات صرف ایک آن کے لئے تھی۔ آسیائے گردشِ ایام ایک آن کے لئے رک سی گئی لیکن فوراً ہی رواں ہو گئی۔ زندگی اپنے تمام ہنگاموں کے ساتھ رواں دواں نظر آنے لگی۔ مکان واپس آیا۔ نہ نہانا اچھا معلوم ہوا، نہ کھانے کا جی ہوا۔ جیسے نفس اپنے مطالبات چھوڑ بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے کمرہ بند کر کے لیٹ گیا۔

ذہن نے ماضی کے اوراق ایک ایک کر کے پلٹنے شروع کر دیئے۔ طفلی کا زمانہ یاد آیا۔ جب اقبال کے اشعار چھٹپنے کی دوستی کی طرح مزیدار اور جاں نثار معلوم ہوتے تھے اور خود اقبال کا یہ تصور تھا کہ وہ جو اشعار کہتے ہیں ان ہی میں رہتے بستے ہیں۔ اقبال کی صورت وہی ہوگی جو میرے اپنے تصورات کے عمل سے پیدا ہوئی تھی۔ بہت اچھی سی بہت چاہی

---

[۱] گنج ہائے گراں مایہ صفحہ ۲۳۔

جانے والی نہ جادوگر جیسی، کچھ عجیب سی۔

ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں حاضری کا ذکر کہیں کہیں پہلے کر چکا ہوں۔[1] ۱۹۳۰ء میں میں بہت بیمار تھا۔ ڈاکٹر صاحب انہی دنوں، یاد نہیں آتا کس سلسلے میں علی گڑھ تشریف لائے۔ اس روز مجھے خاص طور پر بڑی تکلیف تھی۔ مشکل سے باہر آیا۔ میں نے بڑی مایوسی کے ساتھ رک رک کر کہا ڈاکٹر صاحب! کاش میں اتنا بیمار نہ ہوتا کہ آپ کے دوسری جگہ قیام کرنے کی مایوسی اور شرمندگی اٹھانی پڑتی ——— ہائے ان کا وہ چونک کر لیکن فوراً ہی مسکرا کر بڑے وقار اور شفقت سے اپنے مخصوص لہجے میں فرمانا "نہیں جی صدیقی صاحب، کوئی بات نہیں، اللہ اپنا فضل کرے گا۔ اچھے ہو جاؤ گے پھر لاہور آنا۔ مایوس کیوں ہوتے ہو۔ مایوس ہونے سے جانتے ہو ایمان میں خلل پڑتا ہے اور اس سے اللہ کریم کی توہین ہوتی ہے۔ اچھے مسلمان کو اس کی احتیاط رکھنی چاہیئے۔

اس کے بعد دیر تک اسی انداز سے گفتگو کرتے رہے کہ میں ان کی موجودگی میں یہ بھول گیا کہ بیمار بھی تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ میں تو اچھا ہو جاؤں گا اور ڈاکٹر صاحب اس جہان سے اٹھ جائیں گے۔ اکثر یہ خیال آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب جس تکلیف میں مبتلا رہ کر عالم بقا کو سدھارے کاش کسی وقت میں حاضر خدمت ہو کر ان کے لئے وہ کر سکتا جو انہوں نے میرے لئے کیا تھا۔ پھر سوچتا ہوں ڈاکٹر صاحب بہت بڑے شخص تھے۔ ان کو مجھ جیسا معمولی شخص کیا تسکین دے سکتا تھا۔ وہ خاصانِ بارگاہ سے تھے۔ ان کا خدا سے خاص تعلق

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ صفحہ ۱۸۲

تھا لیکن اس بات سے طبیعت مطمئن نہیں ہوتی۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ گو معجزہ کا زمانہ نہیں رہا لیکن محبت و خلوص میں اب بھی بڑی کرامتیں پوشیدہ ہیں۔ دوسروں کی وہ کون سی تکلیف ہے جس کو میں یا آپ محبت سے کچھ اور نہیں تو تھوڑی دیر کے لئے زائل نہیں کر سکتے۔

مرحوم کے انتقال کے کچھ ہی دن بعد میں لاہور گیا۔ دوسرے دن ایک عزیز کے ساتھ مرحوم کے مزار پر حاضر ہوا۔ شاہی مسجد کے بائیں سمت اس مرد قلندر کو آسودۂ خاک پایا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ یہ اس اقبال کی آرام گاہ ہے ؎

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ جس نے

اور آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی

میں نے محسوس کیا کہ بادشاہی مسجد کی پُراسرار پُر وقار ضخامت و قدامت اور اس کی مخصوص فضا اور روایات ذہن و دماغ پر اس درجہ اور اس قدر مستولی ہو جاتی ہیں کہ ذہن کسی دوسری طرف منتقل ہونے کے قابل ہی نہیں رہ جاتا۔ چنانچہ میرے دل میں بے اختیار اور بار بار یہی آیا کہ اقبال کا مزار مستقل حیثیت سے کہیں اور ہونا چاہئے تھا جہاں اقبال کے تصور میں مزاحم ہونے والی کوئی چیز نہ ہوتی۔

اقبال زندہ تھے تو اطمینان رہتا تھا کہ کوئی نہ کوئی موقع نکال کر ان سے مل آؤں گا اور اس کا یقین تھا کہ ان سے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور معلوم ہو گی جو میرے ذہن کی استعداد کو شگفتہ کرے گی اور دل کے ولولوں

لہ گنج ہائے گراں مایہ صفحہ ۱۴۵ ۔

کو بڑھائے گی۔ ذہن کی الجھنیں تھیں جن کے بارے میں یقین تھا کہ ڈاکٹر صاحب انہیں سلجھا دیں گے۔ کبھی محنت اور مطالعے سے بچنے کے لئے دل کو بہلا لیا کرتا کہ دماغ پاشی کیوں کی جائے۔ کسی دن ڈاکٹر اقبال سے جا کر اپنا اطمینان کر لوں گا۔ جس وقت وفات کی خبر ملی تو معلوم ہوا کہ وہ تمام ذہنی تصورات جس میں بعض دھندلے تھے اور بعض گریز پا اور جن پر تعمیر کھڑی کر لینا میری زندگی کی کرامات سے ہوتا۔ اقبال کے اٹھ جانے سے سب کے سب درہم برہم ہو گئے۔ اب نہ وہ ولولہ رہا کہ ان کا پھر سے تعین کیا جائے اور نہ یہ امید کہ اقبال جیسا رفیق و رہبر ملے گا جو ان کی تشکیل و تزئین میں مدد دے گا۔"[1]

سید سلیمان ندوی مرحوم

میں ذرا کند ذہن اور صلح پسند واقع ہوا ہوں۔ معقول پسندی سے بڑی ذمہ داریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان سے کون نبٹے ——— مذہبی نقطۂ نظر میں یہ آسانی ہے کہ جب جی میں آیا خود جامے سے باہر ہو گئے اور جب جی چاہے کسی بھلے مانس کی پگڑی اچھال دی۔

مذہبی[2] لوگوں کے بارے میں میرا تجربہ کچھ اچھا نہیں ہے۔ میں نے اکثر ایسے لوگوں کو مذہب میں مبتلا پایا جن میں خاصی اخلاقی کمزوریاں ملتی تھیں یہ لوگ خدا کو اس منطق سے قائل کرتے رہتے ہیں کہ " میں جتنی شادیاں کرتا اور طلاق دیتا ہوں اتنی ہی زائد رکعتیں نماز کی بھی تو پڑھ لیتا ہوں۔" وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح امریکہ ہر چیز کی قیمت ڈالر میں وصول کرتا ہے،

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ صفحہ ۹۱۔ [2] نقوش لاہور شخصیات نمبر جلد اول صفحہ ۳۱۸

اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کا کفارہ نفلوں میں قبول کر لیتا ہے۔

مذہب بڑی سخت اور بڑی قابلِ قدر آزمائش ہے، بالخصوص مسلمانوں کا مذہب جس طرح کے مذہبی لوگ میرے پیشِ نظر ہیں اور وہ اس درجہ بے وقوف ہوتے ہیں کہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جب وہ اپنے اردگرد کے معمولی سوجھ بوجھ کے لوگوں کو دھوکا نہیں دے سکتے تو وہ خدا کو کیوں کر دھوکہ دیں گے جس کی صفات کا ان کو علم ہے یقین ہو یا نہ ہو ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ خدا نے اپنے سارے اختیارات ان بندوں کو ہمیشہ کے لئے منتقل کر دیئے ہیں جن کا وہ حق مارتے رہتے ہیں۔ ایسے معاملات میں وہ خدا کے ہاں جتنی عرضیاں بھیجتے ہیں اللہ تعالےٰ ان سب کو پڑھے بغیر عدالت مجاز کو واپس کر دیتا ہے۔ ان میں بعض معصوم بھی ملیں گے جو اس کوشش میں رہتے ہیں کہ خدا کو نہ سہی ان فرشتوں کو ہی دھوکہ دے کر کار برآری کر لیں جو ان کا اعمالنامہ مرتب کرنے کے لئے کاندھوں پر بٹھا دیئے گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آخرت میں پٹواری کے اندراجات کی بنا پر مقدمہ جیت لیں گے۔

مذہب[1] کا بیوپار کرنے والوں سے میں ذرا کم ہی یاد اللہ رکھتا ہوں ایسے لوگوں کو میں نے بالعموم احساسِ کمتری کا شکار پایا اور یہ احساس انسان کے خصائل کو ایسا مسخ کر دیتا ہے کہ شرافت و شجاعت، درگذر دردمندی اور اس طرح کی دوسری انسانی صفات جو مذہب و اخلاق کی روح ہیں اکثر ان لوگوں میں نہیں پائی جاتی ہیں جو اپنے آپ کو

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۱۶۴۔

مذہب کا اجارہ دار بناتے ہیں اور ان خرابیوں میں ان کو مبتلا پایا جن سے مذہب نے روکا ہے۔

ہر مذہبی آدمی اخلاقی آدمی نہیں ہوتا۔ خود غرض یا ناواقف۔ مذہب کو بالعموم اصطلاحی حدود میں مقید رکھتے ہیں۔ اسی طرح بعض دوسرے اخلاق کو مذہب سے آزاد اور علیحدہ سمجھتے ہیں۔ مذہب اور اخلاق کو علیحدہ خانوں میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اس لئے کہ حقیقتاً اخلاق مذہب سے برآمد ہوا ہے اور اس کا آوردہ اور پروردہ ہے۔ اخلاق مذہب کی عملی شکل ہے مذہب سے علیحدہ ہو کر اخلاق پر زور دینا ان لوگوں کا شیوہ ہے جن کی نیت بالعموم بخیر نہیں ہوتی۔ مذہب اخلاق کا محافظ و محتسب ہے اور اخلاق بغیر مذہب عورت بغیر شوہر ہے۔

اس بحث کو پھیلانا نہیں چاہتا۔ کہنا صرف یہ تھا کہ ادھر کچھ عرصہ سے ہمارے طبقے میں جس نااہل کو نفع یا نمود کی کہیں گنجائش نہیں نکلتی وہ اس مقصد کے لئے مذہب کو آلۂ کار بنا کر ملک و ملت کا محسن بن جاتا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کس درجہ مذہبی آدمی تھے لیکن کس طرح ان باتوں سے دور تھے۔ خیال کرتا ہوں تو اس کی یاد سے دل تر و تازہ اور روح بالیدہ ہوتی ہے۔

مذہب[1] کے معاملہ میں سید سلیمان ندوی صاحب کا رویہ نہایت شریفانہ، دانشمندانہ اور عالمانہ تھا۔ انہوں نے اسلام اور اسلامی زندگی کی حفاظت و حرمت میں اپنی بہترین صلاحیتیں بے دریغ صرف کیں، اور جہاں تک بن پڑا مذہب کو خود غرض لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا

---

[1] ہم نفساں رفتہ صفحہ ۱۴۷

بننے نہیں دیا اور اکثر مواقع پر یونیورسٹی اور اس کے خدمت گذاروں کی آبرو بڑی دلیری اور قابلیت سے بچائی۔

مجھے سیٹھ صاحب سے ملنے اور ان کی محبت و مروت سے بہرہ مند ہونے کے بے شمار مواقع ملے۔ علی گڑھ آنا ہوتا تو ہمیشہ میرے ہاں قیام کرتے۔ میرا میرے بچوں کا، میرے عزیزوں، دوستوں کا بڑا خیال کرتے تھے۔ اتنا خیال کہ کبھی کبھی میں اپنے آپ سے شرمندہ ہونے لگتا۔

" سید صاحب کی جس بات کا میں گرویدہ تھا وہ ان کا علمی تجربہ ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ علمی ذہانت بھی تھی۔ وہ علم کو کسی ادنیٰ مقصد کے حصول کے لئے کام میں نہیں لاتے تھے۔ وہ علم ہی سے واقف نہ تھے، علم کی برگذیدگی کا بھی احساس رکھتے تھے اور اس کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتے۔ سید صاحب جن علوم سے بہرہ مند تھے ان پر ان کی نظر پیشہ ورانہ نہ تھی، محرمانہ تھی۔ انہوں نے ہمیشہ بات متانت اور دیانت سے کہی۔ تلی تلی کہی اور اس طرح کہی کہ ان کو ایک بیش بہا بات معلوم ہوئی تھی جس پر انہوں نے بڑی محنت، قابلیت اور وقت صرف کیا تھا۔ اور چاہتے تھے کہ اسے ان لوگوں تک پہنچائیں جو اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ علم کا معلم سے یہی تقاضا ہے۔

"سید صاحب کو اپنے استاد علامہ شبلی نعمانی مرحوم سے بڑی عقیدت تھی۔ سیرتِ شبلی لکھ کر سید صاحب نے اس کا حق بھی ادا کر دیا ہے۔ اس کتاب میں جہاں کوئی کمی ملتی ہے وہ سید صاحب کے فنی شعور کی کوتاہی

ؔ ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۲۹ - ۳۲ -

کے سبب سے اتنی نہیں ہے جتنی اس شغف کی بنا پر ہے جو ایک نہایت درجہ شریف اور سعید شاگرد کو اپنے شفیق اور محترم استاد سے ہو سکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مصنف اپنے ہیرو میں کوئی خامی دیکھنا نہیں چاہتا۔ یہ بات ٹھیک ہو یا نہیں۔ سمجھ میں آسانی سے آجاتی ہے باوصف اس کے عقیدت کے سید صاحب کی شخصیت اور ان کا اسلوبِ تحریر شبلی سے مختلف ہے۔

شبلی کے قلم میں بڑی رعنائی اور برنائی ہے۔ تخیل میں رنگینی اور جذبہ میں حرارت اور تلملاہٹ ملتی ہے۔ سید صاحب تاریخی دیانت و امانت کا اس درجہ لحاظ کرتے تھے کہ ان کو اپنی تصانیف میں شاعری کرنے کی بہت کم فرصت اور مواقع ملتے تھے۔ وہ تحقیق اور تنقید میں جتنی احتیاط برتتے تھے اور محنت کرتے تھے اتنا ہی مطالعہ کرنے والے کے جذبات یا تخیل کو بے ضرورت مہمیز کرنے سے پرہیز کرتے تھے۔

"سید صاحب خود علامہ شبلیؒ سے طبعاً بھی مختلف تھے۔ میں نے علامہ شبلی مرحوم کو نہیں دیکھا لیکن ان کی تصانیف پڑھی ہیں۔ جن لوگوں نے ان کو قریب سے دیکھا تھا ان سے ملا ہوں۔ خود شبلی پر جو کچھ لکھا گیا اس سے بھی تھوڑا بہت آشنا ہوں۔ علامہ شبلی جتنے ذہین اور جذباتی تھے (ذہین اکثر جذباتی ہوتے ہیں) شعر کہنے اور پرکھنے کا جیسا ملکہ ان میں تھا ان کی شاعری، ان کی نثر، ان کے خطوط سب میں حُسنِ طبیعت اور سوزِ دُروں کی جیسی دل آویز مثالیں ملتی ہیں اور دینوی معاملات میں جس سوجھ بوجھ سے وہ کام لیتے یا لے سکتے تھے سید صاحب ان سے عاری تھے۔ تصانیف میں شبلی کا انداز مشرقی ہے۔ سید صاحب

کا مغربی دونوں کی ادبی شخصیت میں بھی یہ امتیاز نمایاں ہے۔ بحیثیت طالب علم میں شبلی سے متاثر ہوا اور بحیثیت معلم سید صاحب سے۔

"مجھے تقریر سننے کا بالکل شوق نہیں لیکن بعض لوگوں کی تقریر ضرور سنتا ہوں اس لئے کہ اس کا یقین ہوتا ہے کہ یہ کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کہیں گے جس سے میں فائدہ اٹھاسکوں گا۔ ان میں سید صاحب ایک تھے۔ سید صاحب تقریر کرنے میں چہرہ باندھتے یعنی تمہید اٹھانے یا کسی نہ کسی معذوری کے بیان کرنے میں مطلق وقت نہ صرف کرتے تھے۔ جیسا کہ عام طور پر پیشہ ور مقرر کا دستور ہے۔ کچھ گلے اور سینے کی تکالیف کچھ سفر کی صعوبت، کچھ ملک و ملت کی ابتری یا اپنی نااہلی کا تذکرہ کیا۔ اس کے بعد تقریر شروع کی۔ سید صاحب اس طرح کی باتیں نہ کرتے۔ آواز میں آتار چڑھاؤ نہ ہوتا۔ چہرے پر جذبات کی دھوپ چھاؤں نہ طاری ہونے دیتے۔ ہاتھ پاؤں نہ ٹپکتے نہ پھینکتے۔ کوئی بلند یا بلیغ فقرہ کہہ کر اس کے متوقع نہ رہتے کہ حاضرین سے شورِ تحسین اٹھے۔ جیسا کہ اکثر لوگ کرتے ہیں۔ باتیں بڑی واضح کہتے۔ الفاظ کی دھوم دھام نہ ہوتی۔ تقریر کرنے میں کہیں اٹکتے نہ تھے۔ اچھے سے اچھے مقرر بھی کبھی کبھی جملہ میں مبتدا اور خبر کو مربوط نہیں کر پاتے تو ذرا دیر اٹکتے اور الجھتے ہیں۔ سید صاحب کی تقریروں میں شاید کبھی ایسا موقع آیا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے پوری تقریر قلم بند ہو جسے وہ اطمینان و اعتماد سے دہراتے جا رہے ہوں۔ تقریر کے کچھ ایسے ماہر بھی نہ تھے لیکن تعجب یہ ہے کہ ان کی تقریر سے دل اکتاتا نہ تھا۔ سید صاحب یقیناً مقرروں کے اس زمرے میں نہیں آتے تھے جن

کو جادو بیان تو کیا غیر معمولی بھی کہا جا سکے۔ وہ تقریر کے فن و فسوں سے بے نیاز تھے لیکن ان کی باتوں میں اثر ہوتا تھا (بڑا وزن، بڑا خلوص اور بڑی سادگی ہوتی تھی) اور یہ ذہن کے کسی نہ کسی حصے میں اتر جاتی تھی۔

"رات میں میرے ہاں جب کھانا ختم ہولیتا اور سید صاحب کے معتقدین اپنے گھروں کو چلے جاتے تو بعض مسائل پر اطمینان سے دیر تک گفتگو ہوتی۔ کوئی اور نہ ہوتا اس لئے سید صاحب سے بات کرنے میں ذرا بے تکلفی اور بے باکی کو بھی دخل دے جاتا۔ سید صاحب بڑی توجہ سے تمام باتیں سنتے۔ کبھی کبھی کوئی فقرہ بڑے لطف کا اور کبھی ایک آدھ بڑی حسرت سے کہہ جاتے۔

ایک رات زیادہ دیر تک اسی طرح کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ یہ رات مجھے خاص طور پر یاد رہ گئی ہے۔ وقت زیادہ گذر گیا تھا، اور سید صاحب تہجد کی تیاری کرنا چاہتے تھے۔ میں اٹھ کر کھڑا ہوا تو فرمانے لگے۔ "رشید صاحب، شب آخر گشت و افسانہ از افسانہ می خیزد۔" زندگی کا بھی عجب ڈھنگ ہے۔ جب کچھ باتیں قابو میں آنے لگتی ہیں اور حوصلہ ہوتا ہے کہ اب انہیں پیش کریں گے تو رخصت ہونے کا پیغام آجاتا ہے۔ جس شوق اور محنت سے جو کچھ دیکھا، سیکھا، پڑھا اب وہ برگ و بار لانے والا تھا کہ عمر کا آفتاب غروب ہونے لگا۔ اس برگ و بار کا کیا ہوگا۔ جب سے تمدن کا آغاز ہوا اور جب تک دنیا کا یہ کارخانہ قائم رہے گا اس طرح کے کتنے حسرت ناک سانحے پیش آتے رہے ہیں اور رہیں گے۔" میں گھبرا سا گیا۔ سید صاحب کے اس موڈ

لے ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۵۷ - ۵۸ -

(ذہنی کیفیت) سے میں خود بچنا چاہتا تھا اور سید صاحب کو بھی بچانا چاہتا تھا. میں نے کہا سید صاحب! آپ کے دل میں جو بات آئی ہے کون ایسا شریف اور صاحب علم و فن ہے جس کے دل میں نہ آئی ہو. عظیم شخصیت اور عظیم فن کار اس کیفیت میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن آپ تو اللہ کی مشیت اور مصلحت کے مجھ سے زیادہ قائل ہیں. یہی نہیں بلکہ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ آپ بہتوں سے زیادہ اس کے مقرب بندوں میں ہیں. آپ اس کا غم کیوں کریں. آپ جتنا دے سکتے تھے وہ نہ دے سکے. غم اسے ہو جس نے ایسا ہونے نہ دیا. جب تک ارادہ اور عمل آپ کے بس میں رہا آپ نے فرائض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی بلکہ فرض سے زیادہ کر دکھانے کے آرزومند رہے. جب آپ کو یا مجھے کارآمد و کارآفریں رکھنے کے بجائے معطل و معزول کر دیا گیا (موت واقع ہوئی) تو ہمارا کیا قصور اور جب ہمارا قصور نہیں تو انجام کچھ ہی ہو، زندگی کی مہم میں فتح ہماری ہی رہی۔

" سید صاحب مسکرائے لیکن یہ مسکرانا کسی اور سبب سے اتنا نہ تھا. جتنا شاید میرے اظہارِ قابلیت، طلاقت لسانی پر لیکن میں بھی نہ جھجکا. میں نے کہا سید صاحب، آپ نے جو بات کہی وہ مجھ سے اٹھائے نہ اٹھتی لیکن مجھے تو اس مسلمان جنرل کی ادا پسند آئی جس نے یہ عہد کر لیا تھا کہ جہاں تک خشکی ملے گی وہ خدا کے نام پر فتح کرتا چلا جائے گا. فتح کرتے کرتے خشکی کا حصہ ختم ہو کر سمندر آ گیا تو اس نے گھوڑے کو پانی میں ڈال دیا اور کہا بار خدایا! خشکی ختم ہو گئی. میرا عہد بھی ختم ہوتا ہے. سید صاحب اللہ کے ساتھ اس کے سپاہیوں کا یہی معاہدہ ہوتا ہے. اس کے بعد تمام

اللہ کا۔

"سید صاحب پھر مسکرائے اور فرمایا اب جاکر آرام کیجئے آج بڑی دیر ہو گئی۔ شکل و صورت وضع قطع، چال ڈھال، بات چیت ہر اعتبار سے سید صاحب کی شخصیت بڑی دل آویز اور قابلِ احترام تھی۔ ان کو دیکھ اور پاکر ایک طرح کی تقویت محسوس ہوتی تھی کہ وہ شفقت کریں گے، رسوا نہ کریں گے اور جب تک رہیں گے زندگی میں بڑائی اور حلاوت محسوس ہوگی۔ جیسے وہ اپنی طرح طرح کی ذمہ داریوں کا احساس رکھتے ہیں، اپنی ہی نہیں ہماری ذمہ داریوں کا احساس بھی۔

"سید صاحب پاکستان گئے تو مدتوں خبر نہ آئی۔ ایک دن اخبار میں پڑھا کہ اردو کے مسئلے پر تقریر کرنے کے دوران میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا نے سید صاحب کو تکلیف پہنچائی۔ بڑا قلق ہوا۔ سید صاحب کے لئے یوں کہ کس منزلت کا آدمی کہاں جاکر کس بنا پر رسوا ہوا۔ اور طلبا کے لئے یوں کہ طالب علم بالخصوص یونیورسٹی کے طالب علم سے بڑھ کر قیمتی متاع کسی قوم اور ملک کی کیا ہوگی۔ اس نے یہ سلوک سید صاحب سے کیا جن کی علمی مذہبی، قومی، تہذیبی خدمات اس صدی میں اتنی زیادہ اور اتنی گراں مایہ تھیں کہ کسی ایک شخص کی نہ تھیں۔ پھر علماء کی رسوائی، سلاطین کے ہاتھوں تو سنی تھی، طلبا کے ہاتھوں کبھی سننے میں نہیں آئی تھی۔ اب تک طالب علم کو عالم کی ناموس کا سب سے بڑا محافظ خیال کرتا تھا۔ اگر ایک عالم کی موت عالم کی موت ہے تو ایک عالم کی بے حرمتی کو کیا کہیں گے؟۔[1]

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۵۲ - ۶۱ -

افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق مرحوم

"بعض دوستوں عزیزوں کی وفات ایسی ہوتی ہے کہ خود اپنا جیتا رہنا بے غیرتی معلوم ہوتا ہے۔ افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی رحلت کی خبر سن کر اسی طرح کی بے غیرتی کا احساس ہوا۔ اس موقع پر جزع و فزع، صبر و شکر، ایمان و یقین کے کتنے فقرے بے ارادہ یاد آتے ہیں۔ کسی ایک کو لکھنے کا جی نہیں چاہتا۔ خاکم بدہن۔ حادثہ اتنا بڑا اور میں اتنا چھوٹا۔ توازن کیسے قائم رہے۔ خوشی میں کبھی توازن نہیں کھوتا۔ غم میں قائم نہیں رکھ سکتا۔ اللہ تعالےٰ معاف فرمائے وہ تو جانتا ہے اس طرح کا غم مجھ ناتوان کے لئے کیسی بے پناہ آزمائش ہے۔

"سوچتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے علی گڑھ میں کم و بیش چھ ماہ قیام کر کے ہمارے دلوں میں جب اپنے لئے اتنے پاکیزہ اور قابلِ احترام خیالات و جذبات پیدا کر لئے جو اتنی کم مدت میں علی گڑھ میں آج تک کوئی اور نہ پیدا کر سکا تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جن میں رہ کر اور جن کے لئے انہوں نے تمام عمر کام کیا۔ تعلیمی اور علمی ہی نہیں۔ معلوم نہیں کتنے اور کام۔ یہ بات اور زیادہ احترام اور اچنبھے کی اس وقت معلوم ہونے لگتی ہے جب ہم جانتے ہوں کہ علی گڑھ کے لوگ کسی سے "راضی و خوشنود" ہونے میں ذرا دیر کرتے ہیں۔ بہ نسبت مدراس اور نواحِ مدراس کے مسلمانوں کے جو بہت زیادہ سیدھے سادھے اور بہت جلد عقیدت اور احسان مندی کے جذبات سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے یوں دفعتاً وفات پا جانے سے ان پر کیا عالم گذرا ہوگا۔ وہ ہم میں کسی

لے ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۸۳ - ۸۵

سے علم میں کم نہ تھے۔ عمل میں سب سے ممتاز تھے۔ وہ عالم باعمل تھے۔ جن سے ہم میں بہت کم لوگ آشنا ہیں اور جن پر عمل کرنے والا کوئی نہیں۔ یعنی دین اور اخلاق کا علم۔

"علم اور دین کے مطالبات ڈاکٹر صاحب نے تمام عمر جس پابندی اور خوبصورتی سے ادا کئے وہ بات مجھے کہیں اور کم نظر آئی۔ میری تقدیر کو بنانے میں اسلام کا بڑا دخل ہے۔ اسلام کا جو تصور پیش کیا گیا ہے یا جو میری سمجھ میں آسکا ہے اس سے بڑا تصور انسان کے ذہن و تخیل میں نہیں آسکتا۔ انسان اور اپنے شایانِ شان اس پیمانے پر صرف خدا سوچ سکتا تھا۔ بااین ہمہ مجھے کوئی ایسا مسلمان نہ ملا جس کو میں اس اسلام کا نمونہ پاتا جو میرے ذہن میں تھا۔ اسلام ہی نہیں میں ہر مذہب کا بڑا احترام کرتا ہوں اور اپنے اس عقیدے کو اپنی بڑی جیت سمجھتا ہوں لیکن مجھے اچھے مذہبی آدمی نہ ملے۔ بیشتر یہی محسوس ہوا جیسے مذہبی آدمی اپنے کو دوسرے سے علیحدہ اور ممتاز سمجھتا ہو۔ جیسے اس میں برہمنیت راہ پا گئی ہو اور وہ اپنے کو مامور من اللہ سمجھتا ہو لیکن وہ اتنی معمولی سی بات سے بے خبر ہوتا ہے کہ اگر وہ خدا کی طرف سے مامور کیا گیا ہے تو اس کا مامور ہونا اس کی آزمائش پہلے ہے فضیلت بعد میں۔ فضیلت برہمن کے حصے میں۔ آزمائش شودر کے نصیبے میں آئے۔ یہ کہیں اور ہوتا ہو تو ہو اسلام میں نہیں ہوتا۔ مامور من اللہ ہونے کی ذمہ داری لینا یوں بھی کوئی دانش مندی نہیں ہے۔

"اس گفتگو کا مقصد یہ بتانا تھا کہ ڈاکٹر عبدالحق کیسے انسان اور کیسے مسلمان تھے۔ ان کو دیکھ کر میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوتی تھی کہ کاش

میں بھی ایسا مسلمان ہوتا اور یہ میں نے اس لئے کہا کہ تمام عمر بے شمار مسلمانوں سے ملنے اور ان کو دور اور قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کوئی مسلمان ایسا نہ ملا جس کو دیکھ کر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ ایسا مسلمان میں بھی ہوتا۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ بھی ہو کہ ڈاکٹر عبدالحق نے بہ حیثیت انسان اور مسلمان مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہو دوسرے اس حد تک متاثر نہ ہوئے ہوں۔ یہ سب صحیح ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ میں ذاتی پسند اور ناپسند کو بہت بڑی حقیقت سمجھتا ہوں۔ انقلابی حقیقت! مجھے تو یہاں تک محسوس ہوا ہے کہ جو لوگ مسلمان نہیں شاید وہ بھی ڈاکٹر عبدالحق جیسا انسان بننا پسند کرتے ہوں۔ اچھے مسلمان اور اچھے انسان کو میں نے ہمیشہ ایک دوسرے سے اتنا قریب پایا کہ کم سے کم میرے لئے اکثر ان میں امتیاز کرنا دشوار ہو گیا ہے۔

"ڈاکٹر صاحب نے دین کے معاملے میں کوئی سمجھوتہ نہ اپنے آپ سے کیا تھا نہ کسی دوسرے سے جیسا کہ ہم آپ اکثر کر لیا کرتے ہیں یعنی عقائد اور اعمال کی ذمہ داریوں سے بقدر ستر فی صدی اپنے آپ کو مستثنیٰ قرار دیے جانے کا ریزولیوشن بہ اختیار خود پاس کر دیتے ہیں ستر فی صدی غالباً یوں کہ مسلمانوں کو ہر نیکی کا اجر عموماً ستر گنا ہی ملتا ہے۔

"وہ اسلام کے بنائے ہوئے عقائد پر کامل یقین رکھتے تھے اور ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے ان پر عامل تھے۔ بایں ہمہ وہ اتنے خوش مزاج، زود آمیز، مخلص، ہوشمند اور ہمدرد تھے جیسا ہمارا آپ کا کوئی عزیز، بے تکلف دوست۔ وہ کسی حال میں محتسب نہیں معلوم ہوتے تھے بلکہ سر سے پاؤں تک محب و مشفق تھے۔ جیسے ان

سے دور یا علیحدہ رہنا بدنصیبی اور ان کا اعتبار حاصل نہ کرنا محرومی ہے
"کہا کرتے[1] تھے کہ مجھے نہ کام کھلتا ہے نہ صاحب غرض۔ کام کا نہ کھلنا
تو سمجھ میں آتا ہے۔ اس لئے کہ صحت و سکون میسر ہو تو کام کرنا اور
کرتے رہنا زندگی کے نعائم میں سے ہے لیکن بہ ثباتِ ہوش و حواس
جس پر صاحب غرض نہ کھلتا ہو اس کو میں اولیاء اللہ کے طبقہ میں جگہ
دیتا ہوں۔ صاحب غرض سے یہاں میری مراد خود غرض سے ہے۔
اہلِ حاجت سے نہیں۔

مولانا ابوبکر محمد شیث مرحوم

ایسے[2] لوگ ہم میں آپ بہ اکثر ملیں گے جو فریضۂ مذہبی ادا کرنے
کے لئے اس طور پر تیار ہوتے ہیں۔ گویا ان کا عبادتِ الٰہی کے لئے
آمادہ ہونا ہی دوسروں پر عذاب الٰہی نازل ہونے کا موجب ہو گا۔
عبادتِ الٰہی یہ ضرور کرتے ہیں لیکن ان کی دلی آرزو یہ ہوتی ہے کہ
خدا ان کی عبادت کو اپنی تحمید و تسبیح نہ سمجھے بلکہ غافلوں کے خلاف
مقدس چغلی سمجھ لے اور اسی اعتبار سے ان کو جزا اور دوسروں
کو سزا دے۔ یہ جنت میں "سرکاری گواہ" بن کر جانا زیادہ پسند کرتے
ہیں۔ مولانا ابوبکر شیث مرحوم ایسے نہ تھے۔ انہوں نے مذہب
کو ڈرانے دھمکانے یا فخر و پندار کا ذریعہ کبھی نہ بنایا۔

مرحوم[3] (مولانا ابوبکر شیث) کی سیرت و شخصیت کا کمال یہ تھا کہ
کبھی کسی حالت میں نہ اپنے حدود سے خود متجاوز ہوتے اور نہ دوسرا

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۱۷ [2] گنج ہائے گراں مایہ صفحہ ۱۰۸

[3] گنج ہائے گراں مایہ صفحہ ۹۴-۹۷۔

متجاوز ہو سکتا تھا۔ مرحوم کو خدا نے ایسا متوازن دل و دماغ دیا تھا اور ان کی شخصیت اتنی دل آویز تھی کہ ان کو اپنے منصب کی آڑ پکڑنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اور نہ انہوں نے اپنے طور طریقوں سے کبھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ ناظم دینیات یا عالمِ دین تھے۔

مرحوم کو عام طور پر گفتگو کرتے یا رہتے سہتے دیکھ کر کسی کو بہ مشکل یہ گماں ہوتا کہ مرحوم کا علم کتنا وسیع اور کتنا گہرا ہے۔ ہم سب بھی آخر لکھنے پڑھنے کا ہی شغل رکھتے ہیں۔ ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو علومِ جدیدہ سے پورے طور پر آشنا ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو دونوں علوم پر اچھی نظر رکھتے ہیں چنانچہ علوم دینیہ سے پورے طور پر آگاہ نہ ہونے کے باوجود ہم اس امر کا پتہ تو لگا ہی سکتے ہیں کہ کسی مبحث میں کس کا کون سا پہلو کمزور ہے۔

"میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ مولانا مذہبی نقطۂ نظر اس انداز سے پیش کر رہے ہیں گویا وہ خالص مذہبی نقطۂ نظر نہ تھا بلکہ ان کے مدنظر ہمارا ہی اصول بحث تھا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مولانا ہمیں لوگوں میں سے ایک تھے اور ہمارے ہی علوم سے بحث کر رہے ہیں۔ وہ بحث میں ایسی مثالیں پیش کرتے جو موجودہ دور میں مثال مبہم نہیں بلکہ مسلمۂ فیصلے تھے جن پر تجربات جدیدہ کی مہرِ استناد لگی ہوئی تھی۔"[۱]

مولانا ابوبکر میرے ہم وطن تھے۔ کیا بتاؤں کہ میں ان کو کب سے جانتا ہوں۔ ان کی شخصی خوبیوں کو بہ چشم خود دیکھا۔ ان کے بزرگوں کی برگزیدگی اپنے بزرگوں سے سنی۔ کتابوں میں پڑھی اور دلوں میں پائی۔

---

[۱] گنج ہائے گراں مایہ صفحہ ۹۲- ۹۴- ۱۰۱

ایک دن بھی ملاقات نہ ہوتی تو پوچھتے کہاں تھے؟ کیسے ہو؟ مسکرا کر محبت اور دوستی کے لہجے میں. شفقت کے انداز سے دوستوں کے بارے میں لطف و مرحمت کا کوئی جملہ کہتے. کوئی ایسی بات ضرور کہتے جس سے مجھے اپنی فرزانگی یا شرافت کا احساس ہوتا۔ زمانہ زندگی کی عارضی یا مسلسل مکروہات یا سیرت کے بعض داغ دھبے دھل جاتے یا مدھم پڑ جاتے اور محسوس ہونے لگتا کہ شرافت و اولوالعزمی، خُلق، و حمیت دنیا کی بڑی چیزیں اور زندگی کی بڑی آسودگیاں ہیں۔

مرحوم کا بڑا وصف یہ تھا کہ وہ ہر کام خواہ اپنا ہو یا پرایا بڑی خوشدلی اور مستعدی سے انجام دیتے تھے اور کسی کو یہ محسوس بھی نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ اپنے یا کسی کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ بعضوں کا خاصہ یہ ہے کہ وہ اپنا یا دوسرے کا کام کریں گے تو اس کا موقع بے موقع اعلان بھی کرتے رہیں گے۔ کبھی مصروفیت سے کبھی ناسازی طبع سے، کبھی اپنے نقصان سے، کبھی کوئی اور کام نہ کرنے کے بہانے سے۔ پھر کر چکیں گے تو احسان منوانے یا اپنی اہمیت و عظمت جتانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔ اکثر ایسے بھی ملیں گے جو ادنیٰ سا کام کریں گے جس کے کرنے کا ان کو کافی معاوضہ بھی ملتا ہے لیکن اس کا اعلان و اظہار اسی طور پر کریں گے گویا بہت بڑی قربانی کر رہے ہیں۔ یا ان پر بہت بڑا ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔ مرحوم اس کے برعکس تھے۔ معمولی سے معمولی کام ہو یا بڑے سے بڑا وہ اس کو اس طور پر کرنا شروع کر دیتے جیسے ہم آپ غیر شعوری طور پر سانس لیتے ہیں. بغیر کسی قسم کا اعلان کئے اور بغیر کسی معاوضہ کی توقع کے۔ اور ختم کرتے تو بس ختم کر دیتے بعد میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔

"گلے کا سرطان موت کا بہانہ بنا۔ ڈیڑھ دو سال سب کچھ کیا گیا لیکن ہوا وہی جس کا یقین تھا۔ ایسا یقین جو ٹالنے، بہلانے کی حدود سے باہر ہو چکا تھا۔ سورج ڈوبنے والا ہو اور موت کے پرندے دم بہ دم بڑھنے والی نو بہ نو اور تہہ بہ تہہ تاریکی میں چیخ چیخ اور جھپٹ جھپٹ کر ایک دوسرے کا راستہ کاٹ رہے ہوں۔ دل میں خدا جانے جذبات کے کیسے کیسے مد و جزر ابھرتے مٹتے رہتے ہوں گے۔ لیکن لبوں پر شگفتگی، آواز میں امید و استقامت اور آنکھوں میں روشنی جھلکتی رہتی، ہراس، یاس و نا امیدی کا کوئی اثر نہیں۔ تیمارداروں کو تھپکتے، ملنے والوں کو تسکین دیتے۔ نہ کراہے نہ بیزار ہوئے۔ نہ اپنی تکلیف کا خود اظہار کیا۔ نہ دوسروں سے اس کا تذکرہ کیا۔ پگھل گئے لیکن ہنستے ہنستے۔

میں عرصے سے دیکھنے نہیں گیا تھا۔ یہ میری نامعقول کمزوری ہے۔ میں ایسی حالت میں کسی کو نہیں دیکھ سکتا۔ آدمی بھیج کر بلوایا۔ اب گفتگو کرنے میں بھی بڑی دقت ہونے لگی تھی۔ اس لئے خود میں نے کچھ نہ کہا۔ ہاتھ اور آنکھ کے اشارے سے پوچھا کہاں تھے؟ میں نے عرض کیا۔ مولانا بس یوں ہی نہیں آنا ہوا۔ خیریت دریافت کر لیا کرتا تھا ——— حالانکہ خیریت دریافت کرنے کی جرأت بھی نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے کہ کوئی اطمینان بخش خبر کبھی نہ ملی اور نہ اس کی توقع ہوتی۔ لوگ جو کچھ آپس میں تذکرہ کرتے اس پر اکتفا کر لیتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ یہ تذکرہ ختم ہو اور کوئی دوسری بات شروع ہو جائے۔ مرحوم تھوڑی دیر تک خاموش میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر بڑی کوشش سے اٹک اٹک کر نا صاف لفظوں میں

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ صفحہ ۱۱۰ - ۱۱۱ - ۱۱۷

فرمایا۔ "اللہ نے چاہا تو اچھا ہو جاؤں گا۔" اب مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے بے اختیار کہنا شروع کیا۔ مولانا کیا کروں جو کچھ بس میں تھا سب کر دیکھا اب کچھ بن نہیں پڑتی۔ اپنے بس کی چیز تو روپیہ، پیسہ دوڑ دھوپ، محبت اور ماتم ہی ہے۔ یہ سب بے کار ثابت ہوئے۔ اب تو صرف دیکھتے رہنا رہ گیا ہے۔ اس کی بھی ہمت نہیں رہی۔ مولانا بڑے غور سے سنتے رہے۔ پھر ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دیر تک پکڑے رہے۔ داہنا ہاتھ خالی تھا۔ اسے اٹھایا اور انگشتِ شہادت سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ معلوم ہوا جیسے کوئی چیز گلو گیر ہے۔ ہلکے سے کھانس کر گلا صاف کیا اور بولے، "وہ دیکھتا ہے"۔

میں چلا آیا۔ یہ آخری ملاقات تھی۔ تعطیلوں میں پہاڑ پر چلا گیا جب رات روانہ ہونے والا تھا۔ طبیعت کا عجیب حال تھا۔ جی چاہتا تھا کہ مولانا کو آخری بار دیکھ آؤں اس لئے کہ سمجھتا تھا کہ اب دائمی مفارقت کی ساعت دور نہیں ہے۔ دوسری طرف اپنے میں اس کی سکت نہ پاتا تھا کہ یادداشت کے اس آخری نقش کی کسک کبھی دل سے محو کی جا سکے گی۔ دیر تک اس حیص بیص میں رہا۔ بالآخر اس فیصلہ پر پہنچا کہ سلام کر ہی آؤں۔ وہاں پہنچا تو در و دیوار اور وہ تمام چیزیں، اشخاص اور یادگاریں ایک غم ناک ہجوم میں بڑھتی پھیلتی دل و ذہن پر چھا گئیں۔ جن سے سالہا سال سے سابقہ تھا۔ ہمت چھوٹ گئی اور سلام کئے بغیر لوٹ آیا۔

تعطیلوں کے بعد واپس آیا تو مرحوم اپنے وطن جا چکے تھے اور وہیں سے مقررہ وقت پر نہ ایک ساعت اِدھر نہ ایک ساعت اُدھر جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔

اصغر گونڈوی مرحوم

اصغر گونڈوی مرحوم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۵ء کے جاڑوں میں مولانا اقبال احمد سہیل کے توسل سے ہوئی جنہوں نے ذاکر صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۱۵ء میں کرائی تھی۔ اس وقت تک میں اصغر صاحب کی ذات یا کلام دونوں سے ناآشنا تھا۔ مولانا سہیل سے البتہ پرانی یاد اللہ تھی۔ مولانا سہیل سے میں بے تکلف ہی نہیں گستاخ بھی تھا۔ مولانا بولے، ایک انسان لایا ہوں۔ میں نے کہا شکر ہے آپ نے محسوس تو کیا کہ آپ کے ساتھ کسی انسان کا وقتاً فوقتاً رہنا بہت ضروری ہے۔ بولے ملو ملو۔ اصغر صاحب مسکرا کر آگے بڑھے اور بغل گیر ہو گئے اور میں نے کچھ ایسا محسوس کیا جیسے محبت اور مرحمت کے لمس نے مجھے کششِ ثقل سے آزاد کر دیا ہو۔

دس بارہ سال تک اصغر صاحب کا ساتھ رہا۔ انہیں میں نے ہر حال میں دیکھا اور ہمیشہ اصغر صاحب ہی پایا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وہ شاعر بھی تھے۔ شاعر نہ ہوتے جب بھی ان کے شرف یا شہرت میں فرق نہ آتا۔ وہ جس موقع یا ماحول میں ہوتے ممتاز و محبوب رہتے۔ ایک دفعہ مراد آباد سے نہایت باریک اور حسین نقشے کی سینی لائے۔ راستے میں میرے ہاں ٹھہر گئے۔ سینی دکھائی پوچھا کیسے کیسی ہے؟ میں نے کہا عشوہ ہے عشوہ۔ فتوحات میں سے ہے یا خریدی ہے؟ بولے جی نہیں، فتوحات کا یہاں کہاں گذر۔ میں نہ مُلّا نہ انگریز۔ خوشی تو خریدنے کی ہوتی ہے۔ میں نے پوچھا کیا قیمت دی۔ کہنے لگے۔ واہ پسند کی بھی کوئی قیمت ہوتی ہے۔ سنا نہیں ع "جو کچھ کہا ترا حسن ہو گیا محدود"

ﻟﮯ گنج ہائے گراں مایہ صفحہ ۱۲۰-۱۲۱-۱۲۲- ۱۲۹ -

بس یہ آپ کی نذر ہے۔ وہ سینی اب تک میرے پاس ہے۔ بچوں کے گھر میں اس کی صورت مسخ ہوگئی ہے۔ اب مجھے جب کبھی نظر آجاتی ہے تو اسے منگواتا ہوں۔ اسی میں کھانا منگوا کر کھاتا ہوں۔ رنگ آمیزیاں غائب ہو چکی ہیں۔ نقوش دھندلے ہو گئے ہیں۔ میں حافظے کا کچا ہوں لیکن تاثرات دیر تک قائم رہتے ہیں۔ ان مٹتے ہوئے نقوش میں اصغر صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور جاننے والے جانتے ہیں۔ بچھڑے ہوئے دوست کی یاد تازہ ہوتی ہے تو اگلے پچھلے زمانے کے سیمائی پردوں پر رنگ و آہنگ، خد و خال، رعنائی و زیبائی کے کیسے کیسے مزین و حسین نقشے بن بن کر مٹتے ہیں اور مٹ مٹ کر بنتے ہیں۔

مجھے اچھے گلابوں کا بڑا شوق ہے مرحوم اسے جانتے تھے۔ جب کبھی الہ آباد جاتا تو وہ پتا لگائے ہوتے کہ کہاں کہاں اچھے گلاب ہیں۔ اجنبی ہوتا تو اس سے رسم و راہ پیدا کرتے۔ مجھے لے جاتے اور گلاب پسند کراتے۔ ایک بار ایسی ہی جگہ مجھے لے گئے۔ مالک سے زیادہ خود ہر گلاب کی تعریف کرتے۔ گلاب یوں ہی سے تھے۔ میں نے اخلاقاً ایک آدھ کی ٹوٹی پھوٹی تعریف بھی کر دی۔ معاً اصغر صاحب نے اسے حاصل کرنے کے لئے ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ میں نے موقع نکال کر چپکے سے کہہ دیا "اصغر صاحب فکر نہ کیجئے۔ سب کے سب معمولی درجے کے ہیں"۔ مرحوم کو غیر معمولی مایوسی ہوئی۔ واپسی میں میں نے پوچھا کہ یہ آپ چپ کیسے ہو گئے۔ کہنے لگے کیا کہوں۔ ان گلابوں کے نادر ہونے اور اس شخص کے نامعقول ہونے کا بڑا شہرہ سنا تھا۔ گلابوں کے بارے میں تو آپ نے فیصلہ کر دیا۔ نامعقول ہوتے کا حال مجھ سے پوچھئے۔

کمبخت کسی طرح رام ہی نہ ہوتا . . . صاحب (الہ آباد کے سب سے مقتدر آدمی) کی معرفت اسے قابو کیا گیا۔ اس کے ساتھ وقتاً فوقتاً جتنا اخلاق ہوتا ہے الہ آباد کا کوئی معقول و شریف آدمی برتنا گوارا نہ کرے گا۔ ٹھیک ہے ایسے مہمل آدمی کے گلاب کیوں کر عمدہ ہو سکتے ہیں۔ پھر خود ہی ہنس پڑے۔

مجھ میں ایک بدعادت یہ ہے کہ کہیں جاؤں علی گڑھ سے آخری گاڑی سے روانہ ہوں گا اور کام ختم ہو جانے پر پہلی گاڑی سے واپس آجاؤں گا۔ مرحوم کی آخری علالت کے زمانے میں میرا جانا الہ آباد ہوا۔ صبح پہنچا۔ شام کی گاڑی سے واپس ہونا چاہا۔ مرحوم چاہتے تھے کہ میں رات میں وہیں قیام کروں۔ ہزار ہزار طریقے سے وقت ٹال دینے کی کوشش کرتے رہے۔ جب دیکھا کہ کام نہیں چلتا تو اصرار کرنے لگے کہ تعطیل کا زمانہ ہے کوئی ہرج نہ ہوگا۔ صبح چلے جائیے گا۔ میں ایسا بدبخت کہ نہ مانا اور شام ہی کی گاڑی سے واپس چلا آیا۔

مجھے کیا خبر تھی کہ یہ آخری ملاقات اور پہلا اور آخری ہی اصرار تھا۔ میرے انکار پر ایسا معلوم ہوا جیسے مرحوم کے چہرے پر یخ پڑ گئی۔ لیکن میں کیا بتاؤں کس ضبط و پامردی اور کس مرحمت سے فرمایا تو پھر آپ کی خوشی۔ وہ حال اب بھی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے تو مجھے اپنی اوقات سے نفرت ہو جاتی ہے اور اپنے اوپر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں اس واقعہ کا تذکرہ نہ کرتا لیکن مرحوم کو میں نے کس طور پر اور جس حالت میں شکستہ خاطر کیا تھا اس کی پاداش میں اپنی اس شقاوت کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں اور اس اعلان و اعتراف سے کبھی کبھی امید بندھتی ہے کہ شاید

اپنے نفس کی ملامت اور دوسروں کی لعنت کا ہدف بن کر کبھی اور کہیں اصغر صاحب مرحوم کی روح کا سامنا کرنے کی ہمت ہو سکے۔ دو ہی روز کے اندر تار آیا کہ اصغر صاحب نے رحلت فرمائی۔

دوسرے دن میں الہ باد پہنچا۔ طبیعت بے اختیار ہو گئی۔ خلوص و محبت و مرحمت کا وہ پیکر مجسم ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے زندگی کی بڑی مضبوط طناب ٹوٹ گئی۔ زندگی جو عبارت تھی دوست کی محبت و شگفتگی سے اس میں ایک خلا پیدا ہو گیا۔ ایسا خلا جس میں بیابانی برفستانی ہواؤں، گورستانی سناٹوں کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

اب ہمہ تن شوق ہو کر میرا کون انتظار کرے گا۔ میری تحریروں پر کس کو وجد آوے گا اور کون اسے مسرت و فخر سے لوگوں کو دکھاتا سناتا پھرے گا۔ میرا کوئی مضمون ہوتا سب سے پہلے اصغر صاحب کا ستائشی خط آتا۔ اصغر صاحب کی رحلت نے مضمون لکھنے کا ولولہ بڑی حد تک سرد کر دیا۔ میرے اچھے یا برے خیالات کا بیشتر حصہ مضمون لکھنے کے دوران میں بے شان و گمان معلوم نہیں کیوں اور کس طرح آتا ہے۔ جب کوئی اچھا فقرہ یا خیال ذہن میں آتا تو اس کی خوشی ہوتی کہ اصغر صاحب اس کی داد دیں گے اور لکھو، بہتر لکھو اور جلد لکھو کی امنگ پیدا ہوتی۔ اب وہ بات نہیں۔ بعض باتیں کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طور پر قلم سے ایسی بھی نکل جاتی ہیں جن کے بارے میں مجھے خود اندیشہ رہتا ہے کہ شاید اس کی تہہ تک لوگ نہ پہنچیں یا پہنچنا گوارا نہ کریں۔ اصغر صاحب ہمیشہ اسے پا جاتے، داد دیتے، ملاقات ہوتی تو سب سے پہلے اسی پر گفتگو کرتے۔

اپنے[1] رفقاء اور طلباء سے مجھے اکثر اس مسئلے پر بحثنے کا اتفاق ہوا ہے کہ کوئی نا معقول شخص معقول شاعر نہیں ہو سکتا، جس شخص میں شریفوں کے اطوار نہ ہوں اس میں فنونِ شریفہ کے آثار کیسے مل سکتے ہیں۔ مرحوم اصغر گونڈوی اور سید سجاد حیدر یلدرم میرے پیشِ نظر ہیں۔ ان کی دل افروز شاعری اور انشا پردازی تمام تر ان کی دل آویز شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ میرے سامنے ایسے اشخاص بھی ہیں جو شاعر اور انشا پرداز کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن ان کی شاعری اور انشا پردازی میں خامی بھی اس حد تک ملتی ہے جس حد تک بہ حیثیت انسان یہ گھٹیا واقع ہوئے ہیں۔

میرے نزدیک فن کی قدریں اور انسان کی قدریں یکساں ہیں اور اعلیٰ انسانی قدریں وہ ہیں جو زندگی اور کائنات کے بامراد اور برگزیدہ ہونے پر دلالت کرتی ہوں۔ ایسا کوئی فن نہیں ہے جو انسان سے اونچا یا اس سے علیحدہ ہو۔

جگر مراد آبادی مرحوم

جگر صاحب[2] وہاں پہنچ گئے جہاں ایک نہ ایک دن ہر اس متنفس کو پہنچنا ہے۔ جو زندگی کے مرض الموت میں گرفتار ہے۔ اس دنیا میں موت بھی کتنی سستی، یقینی ہر جگہ ہر وقت آسانی سے مل جانے والی چیز ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہوا، پانی، آگ اور مٹی کی طرح یہ بھی ہر جاندار کے لئے کتنی ضروری ہے۔

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ صفحہ ۲۴۱۔

[2] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۳۱۳ - ۳۶۷۔

مرحوم (جگرؔ مرادآبادی) کی رحلت سے آج بڑا پرانا، گہرا اور مخلصانہ رشتہ ٹوٹ گیا۔ عمر کی جس منزل میں ہوں وہاں اس طرح کے رشتے ٹوٹتے ہی رہتے ہیں۔ فطرت کا یہی تقاضا ہے۔ لیکن کیا کروں۔ فطرت کے اس طرح کے تقاضوں کو محبت اور رفاقت کے تقاضے تسلیم کرنے سے عاجز و قاصر رہتے ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ میرے اس قصور میں کتنے اور بدنصیب شریک ہوں گے۔

فطرت بہت سے معاملات میں کسی نہ کسی شرط پر انسان سے خوش و ناخوش مفاہمت کر لیتی ہے۔ صرف موت کے مسئلے پر آج تک کسی طرح کی مصالحت پر تیار نہیں ہوئی۔ انسان اور موت کے دیرینہ رشتے و روایات کو دیکھتے ہوئے یہ امر بھی یقینی ہے کہ ارضی سطح پر آئندہ کبھی کوئی مفاہمت نہ ہو سکے گی۔ لیکن اگر انسان موت کو تسخیر نہیں کر سکا ہے تو موت کبھی انسان کے ان کارناموں کو نابود یا بے نور نہیں کر سکتی ہے۔ جو موت سے زیادہ عجیب و عظیم پائے گئے ہیں وہ انسان کو تسخیر بھی کس طرح کر سکتی ہے جب انسان سوائے ازلی و ابدی ہونے کے ان صفات سے بھی کسی نہ کسی درجے میں متصف ہے جو خدا کے ہیں جن کے طفیل وہ اس زمین پر خدا کا نمائندہ اور نائب ہے۔

اس وقت مرحوم کی وفات سے (کسی عزیز کو پہلی بار مرحوم کہہ کر یاد کرنا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے) ان ساتھیوں اور صحبتوں کی کیسی کیسی یاد تازہ ہو رہی ہے جن سے کبھی اپنی کبھی ان کی کبھی دوستوں کی زندگیاں خوشی سے معمور اور امنگوں سے لبریز رہا کرتی تھیں۔ کہیں گہری

کہیں ہلکی یہ یادیں ماضی کے ۲۰-۲۵ سال کے وسیع دھوپ چھاؤں پر محیط ہیں۔

مجھے جگر صاحب کے خانداں کا حال نہیں معلوم، کتنی تعلیم تھی، کس بزرگ کے مرید یا کس سلسلۂ طریقت یا مسلک سیاست سے تعلق رکھتے تھے۔ اس طرح کی باتوں میں سے کسی کا علم نہیں جس سے جتنا قریب ہوتا ہوں اتنا ہی اس کے بارے میں ان باتوں کی کھوج لگانے سے پرہیز کرتا ہوں۔ جگر صاحب میرا بہت لحاظ کرتے تھے۔ اصغر گونڈوی مغفور کے علاوہ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جن کے لئے وہ اتنا اخلاص و احترام ملحوظ رکھتے ہوں جتنا میرے لئے۔ یہ میں اس لئے نہیں بیان کر رہا ہوں کہ اس میں میری بڑائی نکلتی ہے۔ میری یہ نیت ہوتی تو میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ اس بھونڈے طریقے سے اس کی نمائش کرتا۔ بہر حال جگر صاحب سے مجھے یہی شکایت رہی کہ وہ میرے سامنے مؤدب کیوں ہو جاتے تھے۔ مجھے ایسے آدمی سے ملنے میں بڑی الجھن ہوتی ہے جو مجھے ہر وقت گارڈ آف آنر دیتا رہے اور اس سے بھی کچھ کم کوفت اس وقت نہیں ہوتی جب کوئی شخص میرے سامنے مجھ سے زیادہ مسخرا بننے کی کوشش کرتا ہے۔

جگر صاحب کے اس خلوص و محبت کو میں نے نباہنے کی برابر کوشش کی لیکن مرحوم ان غیر معمولی شریف اور فیاض انسانوں میں تھے جن کی مسلسل "نوازشہائے بے داد پنہاں" کا ساتھ دینے سے ہمیشہ قاصر رہا۔ روپے پیسے مال و متاع سے کوئی سلوک کرے تو اس کا بدلہ کر

۱؎ ہم نفسان رفتہ صفحہ ۲۱۷ - ۲۱۸ - ۲۱۹ - ۲۲۱ -

دینا آسان ہے لیکن جو شخص (وہ بھی جگرؔ صاحب جیسا شخص) محبت و احترام کی بے کراں نعمتوں سے کسی کو بہرہ مند کرے اور رکھے اور کسی وقت غافل نہ رہے اسُ سے کون عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ جگرؔ صاحب کے پاس جو دولت تھی اور جسے وہ مجھ پر بے دریغ صرف کرتے تھے اس سے مبادلہ کے لئے میری ہر دولت ناقابلِ التفات تھی۔

جگرؔ صاحب کی محبت بھی عجیب محبت تھی۔ ہمیشہ اس فکر میں رہتے کہ میں ان کی مدارات میں کوئی حصہ نہ لوں۔ اس خیال سے کہ مجھے زحمت نہ ہو۔ اس سبب سے ایک طور پر میں جگرؔ صاحب سے اتنا اور اس طرح قریب نہ ہو سکا کہ ان کی ذہنی واردات اور رنج و راحت کے محرکات سے براہِ راست اور پورے طور پر واقف ہو سکتا۔ اس سے شرمندہ ہوں۔ عقیدت و محبت کا پورے طور پر مستحق نہ ہونا لیکن اس کا مورد رہنا شریف آدمی کے لئے اتنا ہی باعثِ خلش رہتا ہے۔ جتنا ایک گناہ گار کے لئے جو اس اندیشے میں مبتلا رہتا ہے کہ کہیں بے نقاب نہ ہو جائے۔

جگرؔ صاحب بہ حیثیت مہمان تشریف لاتے تو بیک وقت کتنی خوشگوار باتوں کا احساس ہونے لگتا۔ کوئی بھولی ہوئی لطیف خوشبو آگئی ہو۔ زندگی کی نعمتیں اچھی، اس کے مصائب گوارا اور آلودگیاں قابلِ احتراز معلوم ہونے لگتیں۔

جگرؔ صاحب کے چاہنے والے دو ایک دن پہلے سے گھر کا چکر لگانے لگتے تھے۔ وہ آجاتے تو دن رات ان کو گھیرے رہتے۔ جگرؔ صاحب کے اس "حلقے" یا "دربار" میں میں کبھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ اسے جانتے تھے

اس لئے جب، ہجوم ختم ہو جاتا تو صرف یہ اطلاع بھجوا دیتے کہ ملاقاتی رخصت ہو گئے۔ میں پہنچتا تو جیسے سر سے پاؤں تک فرطِ تکریم و تشکر سے جگمگانے لگے ہوں بے اختیار کھڑے ہو جاتے۔ اسی بے اختیاری میں فوراً بیٹھ جاتے جیسے کچھ یاد آ گیا ہو پھر اٹھ کھڑے ہوتے اور آس پاس کی چیزیں بے ضرورت اِدھر اُدھر رکھنے لگتے، بیٹھ جاتا تو وہ بھی بیٹھ جاتے اور مسکرانے لگتے۔ جیسے اپنے اس مسکرانے کی شمیم و شبنم کے تخت پر مجھے بٹھا دینا چاہتے ہوں۔ اس وقت ان کا مسکرانا اور کبھی رہ رہ کر ہنس پڑنا اور جلد ہی کچھ کہنے لگنا تاکہ میں ان کے اس اضطراب و انبساط کو جان نہ سکوں۔ ایسا دل نشیں اور قابلِ فخر و احترام محسوس ہوتا کہ میں اس وقت اس کو کسی تشبیہ و اشعار سے بھی واضح نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ اس کو کسی حسین دوشیزہ یا معصوم سے معصوم تندرست بچے کے مسکرانے اور ہنسنے سے بھی تشبیہہ دینا کافی سمجھتا ہوں۔

"جگر صاحب[1] پر بعض زمانہ بڑی سختی کا گذرا ہے۔ مالی دشواریوں کے سبب سے پریشان رہتے تھے۔ اس کا اظہار انہوں نے کسی اور سے کیا ہو یا نہیں مجھ سے کبھی نہیں کیا۔ یہ بڑی آزمائش کا مرحلہ ہوتا ہے۔ سیرت میں کہیں کوئی خامی رہ جاتی ہے تو تنگ دستی میں بالضرور اور بڑی شدت سے اُبھر آتی ہے۔ معمولی اشخاص کا کیا ذکر وہ تو ذرا سے فشار سے بکھرنے لگتے ہیں۔ اچھے اچھوں کو اس منزل میں ڈگمگاتے دیکھا ہے۔ اس زمانے میں بھی جگر صاحب اچھا کھاتے تھے، اچھا پہنتے تھے۔ اچھی طرح خود رہتے تھے۔ اپنے مہمانوں کو رکھتے تھے۔ کسی پر بُرا وقت آ پڑتا تو اپنے اوپر سختی جھیل کر اس کی مدد کرتے۔

[1] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۲۲۴ - ۲۳۹

بعض شعرا ایک ایسے مشاعرے یا مواقع کے لئے جہاں نوجوان لڑکیاں اور خواتین موجود ہوتی ہیں ایسی ناپسندیدہ اور بے باک نظمیں لکھ لاتے ہیں جو نوجوانوں کے حیوانی و شہوانی جذبات کو برانگیختہ و بے قابو کرنے میں معاون ہوتی ہیں اسے شعراء اپنا بڑا کارنامہ اور انعام سمجھتے ہیں۔ دیکھا تو یہاں تک گیا ہے کہ مشاعروں میں اس نظم کو سنانے کی فرمائش کوئی نہیں کرتا تو یہ شعرا خود نہایت بے غیرتی کے ساتھ اور اتنے ہی بھونڈے پن سے اشارتاً اس کی یاددہانی کراتے ہیں۔

جگر صاحب میں بڑی حیا اور غیرت تھی۔ کہیں کسی محفل میں بیٹھے ہوں ہمیشہ نظر نیچی رکھتے جیسے اس محفل میں نوجوان خواتین اور لڑکیوں کو اپنی ذمہ داری اور امانت سمجھتے ہوں۔ بے تکلف احباب میں بیٹھ کر وہ اس طرح کے فقرے زبان پر نہیں لاتے تھے جن میں عورتوں سے بے راہ روی کے روابط کا اشارہ ملتا ہو۔ خواہ وہ فقرے کتنے ہی دلپذیر کہے جا سکتے ہوں۔

ان باتوں کا خیال کرتا ہوں تو جگر صاحب اور ان کے پرانے ساتھی شعراء آج کس حسرت و الم سے یاد آتے ہیں جن کو دیکھ کر اس وقت تو اتنا نہیں جتنا اب محسوس کرتا ہوں کہ تہذیب و شرافت بھی دنیا میں کتنی بڑی نعمت ہے۔

سجاد حیدر یلدرم مرحوم

یلدرم مرحوم علی گڑھ کے ساختہ پرداختہ تھے اور علی گڑھ کے اس زمانے کے طالب علم تھے۔ جب زندگی خوش باشی نہ تھی تو کچھ نہ تھی۔ نہ اب جب زندگی سوائے خوش باشی کے سب کچھ ہے۔ میں نے ان کی طالب علمی

نہ دیکھی لیکن علی گڑھ کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب ؏

بزم کو برہم ہوئے مدت نہ گذری تھی بہت

جب سے اب تک زمانے کے رویئے اور روانی میں بہت کچھ فرق آ گیا ہے۔ کیسا کچھ فرق۔ جن قدروں پر، جب مرنے والے لاکھوں تھے اب ان پر رونے والا کوئی نہیں۔ لیکن سجاد حیدر کی حیثیت جداگانہ تھی۔ ان میں شروع سے آخر تک بہت کم تبدیلی ہوئی اور یہ ان کی سیرت و شخصیت کا بہت اہم اور مہتم بالشان پہلو ہے۔

سجاد صاحب[۱] کے جذبات کچھ زیادہ تیز اور تند نہ تھے۔ جس کے ہاں حالات کی رعنائی ہو اس کے ہاں جذبات کا ہیجان و طغیان یوں بھی کم ہوتا ہے۔ پھر بھی جہاں کہیں ایسے مواقع آ گئے ہیں سجاد صاحب نے ایک ہلکی جنبشِ قلم سے ان کو معتدل کر دیا ہے اور اس طور پہ معتدل کیا ہے کہ اظہارِ مطلب میں کوئی فرق نہ آیا اور شرم و شرافت کا دامن بھی داغ دار نہیں ہوا۔ میرے نزدیک انشائے لطیف میں خیال کی رنگینی اور نزاکت کے ساتھ جذبہ کی متانت و خفت کو جس طرح یلدرم نے متوازی رکھا ہے کسی اور نے نہیں رکھا ہے۔

سجاد حیدر بڑے پاکیزہ اور معصوم سرشت انسان تھے۔ ان کو جوڑ توڑ بالکل نہ آتا تھا۔ وہ اپنے آپ پر کبھی فخر کرتے نہیں سنے گئے۔ دوسروں پر بڑی فیاضی سے اکثر فخر کرتے پائے گئے۔ ایک سچے آرٹسٹ اور ادیب کی طرح وہ اہلِ مناصب سے بھی مرعوب نہیں ہوئے۔

---

[۱] گنج ہائے گراں مایہ صفحہ ۲۴۷ - ۲۵۲

لیکن فن کے کمال کی داد دینے میں بڑے سخی تھے۔ یلدرم جیسے کڑھے ہوئے آدمی بہت کم دیکھے گئے ہیں۔ وہ تمام آداب ان میں رچے ہوئے تھے جو ثقافت کی جان و جواز ہیں۔ ان آداب کو وہ اس لطف اور آسانی سے برتتے تھے جیسے ایک تندرست سانس لیتا ہے یا ایک حسین اپنے حسن کا حامل ہوتا ہے بغیر کسی ارادے یا تکلف کے۔ یلدرم میں رسمی تکلف بالکل نہ تھا۔ وہ اسی حد تک تکلف کرتے تھے جس حد تک شرافت اور سلیقے کا اقتضا ہوتا تھا اور بے تکلف بھی اسی حد تک ہوتے تھے جس حد تک بے تکلفی حسنِ معاشرت کا جزو اعظم سمجھی جاتی ہے۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو اونچی سے اونچی اور بڑی سے بڑی صحبتوں میں ہماری اور خود اپنی نمائندگی کر سکتے تھے۔ ان کی قدر کرنے والوں کا حلقہ بڑا وسیع اور متنوع تھا۔ شعر و شرافت کے جو لوگ حامل یا قدردان تھے۔ وہ تمام کے تمام خواہ ہندوستان کے کسی گوشے میں ہوں یلدرم سے واقف اور ان کی خوبیوں کے معترف تھے۔

سید سجاد حیدر ان لکھنے والوں میں تھے جن کا قائل نہ ہونا کم معاد ہونے کی دلیل ہے۔ کم لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں جن کی تحریر اور شخصیت میں اس درجہ یک رنگی اور توازن ہو۔ وہ ہم سے جدا ہو گئے لیکن ہم اور ہمارے بعد آنے والے ان سے کبھی جدا نہ ہوں گے۔ مجھے یقین ہے فردوس میں ان کو وہ رنگینیاں اور نزہتیں بھرپور نصیب ہوں گی جن کی صرف جھلکیاں ان کی تحریروں میں ہم کو نصیب ہیں۔

شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم

جامعہ کے جن عزیزوں، دوستوں سے میرا پرانا اور گہرا تعلق رہا ہے ان میں شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۹

بھی تھے۔ ان سے ملاقات کم ہی ہوتی تھی۔ بس یوں ہی سال دو سال میں ایک آدھ بار وہ بھی چلتے پھرتے۔ آخر میں جب ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور شفیق صاحب دہلی اسٹیٹ کے وزیرِ تعلیمات ہوئے تو ملنے کے مواقع بڑھ گئے۔ پھر تو تعلقات کچھ ایسے ہو گئے کہ کوئی تردد ہوتا یا خوشی میسر آئی تو شفیق صاحب ضرور یاد آتے اور کچھ ایسا لگتا جیسے وہ شریک ہو جاتے تو تردد کم اور خوشی زیادہ ہو جاتی۔

"کبھی ملاقات ہو جاتی تو بڑی خوشی ہوتی۔ اس طرح کی خوشی جو خلوص اور ریاضیت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اتفاقات کی نہیں۔ میں شفیق صاحب کو اپنا کارنامہ سمجھتا جس کی زندگی کے نقشے میں کارنامے کا خانہ خالی ہو، اس کے نزدیک معمولی سے معمولی کارنامے کا احساس بھی بڑے فخر و مسرت کا باعث ہوتا ہے۔ چہ جائے کہ وہ کارنامہ اتنا بڑا ہو جتنا کہ شفیق صاحب۔ لکھنے کو تو میں یہ لکھ گیا لیکن یہ بات بھی فوراً ہی ذہن میں آئی کہ شفیق صاحب کسی کا کارنامہ نہ تھے۔

میں زندگی کی مادی راحتوں اور جسمانی لذتوں کا خاصا دلدادہ رہا۔ اب بھی ان سے تائب نہیں ہوا ہوں۔ کبھی کبھی یہ بھی محسوس کیا ہے کہ زندگی کے مصائب و مکروہات جن کا ماتم اکثر کیا جاتا ہے ان راحتوں اور لذتوں کے ہوتے ہوئے آسانی سے سہے جا سکتے ہیں۔ ذہنی آسودگی کا مدار اچھی خاصی حد تک مجھ دنیا دار کے نزدیک مادی راحتوں اور جسمانی لذتوں پر ہے لیکن میں خاصا شرمندہ ہوا ہوں۔ اپنے آپ سے جب سامنا ایسے لوگوں کا ہوا جنہوں نے اپنی زندگی پر ان مصائب و مکروہات کو حلال اور راحتوں اور لذتوں کو حرام کر رکھا تھا۔ ان میں جان

پہچان کے لوگوں میں بار بار ذاکر صاحب اور شفیق صاحب آئے ہیں۔ انہوں نے معلوم نہیں کس دھن میں شاید کبھی سوچا تک نہیں کہ جوانی، دولت، اور شان و شوکت کے کیا مزے تھے جس مزے میں وہ گم تھے وہ میرے اور میرے جیسے راحت پسندوں کے لئے کس قدر کڑوا ہوگا۔ اس کا اندازہ کچھ اس شرمندگی سے کیا جا سکتا ہے جو ان دونوں کے سامنے میں نے ہمیشہ محسوس کی۔ اور تن آسانی کا میرا جیسا خوگر ایسا کون ہے جو نہ محسوس کرے گا۔

"شفیق[1] صاحب نے بڑی سخت بیماری اٹھائی۔ کتنی دوڑ دھوپ کی گئی۔ کیسی کیسی دعائیں مانگی گئیں۔ کیا کچھ زیر باری نہ ہوئی لیکن ہوا وہی جیسے نہ ہونے دینے کے سئے یہ سارے جتن کئے گئے۔ انسان کی سیرت و شخصیت کا بھید جتنا مصیبت اور بیماری میں کھلتا ہے کہیں اور نہیں کھلتا۔ مصیبت اور بیماری کی بھٹی میں کسی طرح کا ملمع قائم نہیں رہ جاتا۔ جب سارے دوسرے سہارے ٹوٹ چکے ہوں اس وقت بھی اپنا سہارا پکڑے رہنا بڑا کٹھن کام ہے شفیق صاحب نے اپنا سہارا مرتے دم تک نہ چھوڑا۔ ان کے اچھے اور بڑے ہونے کی یہ دلیل سب پر بھاری ہے۔ اپنی مسرت و محبت کے اظہار سے وہ ہمیشہ تیمار دار کی ڈھارس بندھاتے یہ کام آسان نہیں۔ تندرستی اور فراغت میں جو لوگ بڑے ہنس مکھ، یار باش اور دلیر پائے گئے اکثر بیماری اور تنگ دستی میں ان کو چڑچڑا بودا، اور دوستوں، تیمارداروں کے لئے خاصا تکلیف دہ پایا گیا ہے۔

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۱۵-۱۶-۲۲

شفیق صاحب نے محبت کی تازگی و توانائی مصیبت جھیلنے اور دوسروں کی خدمت کرتے رہنے میں ڈھونڈی اور پائی تھی۔ اس لئے مصیبت میں ان کی خوبیاں اور زیادہ جگمگانے لگتیں۔ بعض پھول ایسے ہوتے ہیں جو سائے سے زیادہ دھوپ میں اپنی پوری بہار دکھاتے ہیں۔

"شفیق صاحب کے جنازے پر جیسے دہلی کی ساری خلقت ٹوٹ پڑی تھی۔ مرحوم کیسی محبت اور عزت لوگوں کے دلوں میں چھوڑ گئے تھے اس کا اندازہ کرتا ہوں تو زمانہ اور زندگی کی ساری ناہمواریوں کی طرف سے منہ موڑ کر فرد کی عظمت اور انسانیت کے شرف پر بے اختیار ایمان لانا پڑتا ہے۔"

نواب محمد اسمٰعیل خاں مرحوم

"ہماری[ا] عزت کو اپنی عزت سمجھنے والے تو بہت سے مل جاتے ہیں۔ گو میرا ساتھ ایسوں سے بھی پڑا ہے جو ہماری عزت کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب ہماری ذلت کو بھی اپنی ذلت سمجھتے تھے۔ قبیلہ کا سردار ہونے کی ان میں بڑی نشانیاں ملتی تھیں۔

"نواب[۲] محمد اسمٰعیل خاں، نواب محمد اسحاق خاں کے بیٹے اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے پوتے تھے۔ نواب صاحب مدتوں علی گڑھ سے وابستہ رہے اور بڑے ذمہ دار عہدوں پر فائز۔ وہ سب سے عزت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ کسی کے پاس حاجت لے کر جانے سے نفس کو بالعموم غیرت کا احساس ہوتا ہے لیکن نواب صاحب ایسے وقار سے ملتے تھے

ا۔ ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۱۰۹

۲۔ ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۸۷ - ۹۷ - ۹۸ - ۱۰۰ - ۱۰۱ - ۱۰۲

اور دل سوزی سے پرسشِ احوال کرتے اور مدد دینے پر آمادہ ہو جاتے تھے کہ ذلت کے بجائے آدمی اپنے آپ کو گرامی محسوس کرنے لگتا تھا۔ نواب صاحب اتنے اچھے تھے کہ کوئی برا شخص بھی اپنے آپ کو آسانی سے اس پر راضی نہیں کر سکتا تھا کہ ان کی برائی پر آمادہ ہو جائے۔

نواب صاحب بڑے سیر چشم تھے۔ ان کا دسترخوان بڑا وسیع تھا۔ یہ وصف ان کا خاندانی تھا اور جاگیرداری یا سرمایہ داری سے وابستہ نہ تھا جس نے وفا نہ کی۔ مہمان نوازی اور وضع داری کے اوصاف نے نواب صاحب کا ساتھ مرتے دم تک دیا۔ ان اوصاف کا نباہنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ نواب صاحب شروع سے آخر تک مالی دشواریوں میں مبتلا رہے جوں جوں دن گذرتے گئے یہ دشواریاں بڑھتی گئیں۔ آخر میں تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ کسی وقت بھی پانی سر سے اونچا ہو سکتا تھا۔ لیکن حیرت اس پر ہے کہ نواب صاحب کی کسی بات سے کبھی یہ ظاہر نہیں ہوا کہ ان پر کیا گذر رہی ہے۔ تنگ حال ہونا اور اس کا اظہار نہ ہونے دینا اتنا ہی مشکل ہے جتنا اقتدار کو پہنچنا اور آپے میں رہنا۔

نواب صاحب بڑے اونچے درجے کے ارسٹوکریٹ تھے جس کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ کیسی ہی تکلیف یا پریشانی میں کیوں نہ مبتلا ہوں اس کا اظہار اس کی کسی بات سے نہ ہو۔ ہمارے ہاں ادنیٰ درجے کی بھی ارسٹوکریسی ملتی ہے لیکن جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ یونان کے عہد اولیں کی ارسٹوکریسی (اشرافیت) ہے جو وہاں کے دیوتاؤں کا درجہ اختیار کر چکی تھی۔

نواب صاحب مجھ پر کتنا کرم کرتے تھے اور میرے بچوں اور عزیزوں

سے کس محبت اور عزت سے پیش آتے تھے۔ جی چاہتا ہے اسی کا تذکرہ تفصیل سے کروں ـــــــ وضع داری کی کئی قابل قدر مثالیں سامنے آسکتی ہیں لیکن بیان کرتا ہوں تو اس کا احساس ہوتا ہے کہ اس میں خودستائی اور خودنمائی کا بھی پہلو نکلتا ہے جو ممکن ہے کسی اور موقع پر گوارا کر لیتا یہاں اس کی کسی طرح ہمت نہیں ہوتی اور نہ کروں تو غیرت دامن گیر ہوتی ہے کہ وہ حق ادا نہیں کر رہا ہوں جو نواب صاحب کا مجھ پر ہے۔

نواب[1] صاحب کو سب سے پہلے غالباً ۱۹۲۰ء میں ان کے دولت کدہ مصطفےٰ کاسل میرٹھ میں دیکھا تھا۔ آج کے مصطفےٰ کاسل کو دیکھ کر چالیس برس یا اس سے بھی پہلے کے مصطفےٰ کاسل کا اندازہ مشکل ہے۔ کتنی خوبصورت، شاندار عمارت، وسیع باغ اور کتنے گھنیرے تناور درخت جو کبھی کبھی اتنے درخت نہیں معلوم ہوتے تھے جتنے پرانے زمانے کے سورما اور ان کی داستان ہائے رزم و بزم۔ ایسے دیو پیکر درخت اتنی تعداد میں اس قرینے سے یک جا وسط شہر میں میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھے تھے۔ عمارت کے وسط میں ایک مختصر سا عجائب خانہ تھا جس میں طرح طرح کے نوادر قرینے سے سجائے گئے تھے۔ ایک چیز اب تک یاد ہے۔ ہاتھی دانت میں ایک نسوانی پیکر تراشا گیا تھا۔ اس کی اونچائی غالباً ۸۔۱۰ انچ ہوگی اس وقت اس کو دیکھ کر کچھ اس طرح کا خیال گذرا تھا کہ عورت میں کشش کی جتنی باتیں فطرت نے ودیعت کی تھیں یا ابتدا سے آج تک اچھے اور بڑے شعراء نے دریافت کی تھیں ان کے بعد بھی کچھ باقی رہ گیا

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۹۲۔

تھا جس کو مجسمہ نے پورا کر دیا تھا۔

"مدتوں بعد یاد نہیں آتا کس سلسلے میں ایک دفعہ پھر مصطفےٰ کاسل جانا ہوا۔ نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ عمارت، باغ، درخت سب کہنگی، ویرانی افسردگی کی زد میں تھے۔ سوائے نواب صاحب کی شفقت اور شگفتگی کے جو زمانے کی لائی ہوئی کسی زبونی اور ابتری سے بدلی نہ تھی — آج دفعتاً سننے میں آیا کہ نواب صاحب رحلت فرما گئے۔ مصطفےٰ کاسل ڈھے گیا۔ جس میں کتنی اور کیسی کیسی یادیں دفن ہوگئیں۔ محبت و مروت کی یادیں، مہمان نوازی اور وضع داری کی یادیں، عزت و حمیت کی یادیں شرافت اور شفقت کی یادیں۔ ایک شخص کے زندہ رہنے سے کتنی اقدار اور روایات کو فروغ تھا۔ اس کے گذر جانے سے کتنی شمعیں بے نور اور محفلیں سونی ہوگئیں ؎

"کہاں ہے آج تو اے آفتابِ نیم شبی"

"نواب صاحب کی فردِ اعمال تو خدا کے علم میں ہے اور نجاتِ اخروی کا سررشتہ بھی اسی کے ہاتھ میں ہے لیکن نواب صاحب کی محبت و منزلت سے میرا دل جس قدر معمور ہے اس سے امید کرتا ہوں کہ مرحوم کو خدا اپنی بے پایاں بخشش کی بشارت اس محبت سے بھی دیتا ہے جو وہ اپنے نیک بندوں کی طرف سے اپنے بعض گنہگار بندوں کے دل میں ڈال دیتا ہے۔"[1]

پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس

پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس[2] دفعتاً ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے۔ ان کی باتوں اور تحریروں سے بے شمار لوگوں کے دل خوش

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۹۵-۱۰۳ [2] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۱۳۰ - ۱۴۱ -

ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ اللہ تعالےٰ نے ان سے اتنی بڑی خدمت لی تو یقیناً ان کو اپنی بے کراں نوازشوں سے سرفراز بھی فرمایا ہوگا۔

"اگر ہم ذہن میں کسی ایسی محفل کا نقشہ جمائیں جہاں تمام ملکوں کے مشاہیر اپنے اپنے شعروادب کا تعارف کرانے کے لئے جمع ہوں تو اُردو کی طرف سے ہم بہ اتفاق آرا کس کو اپنا نمائندہ انتخاب کریں گے؟ یقیناً بخاری کو۔ بخاری نے اس قسم کے انتخاب کے معیار کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ نمائندوں کا حلقہ مختصر ہوتے ہوتے معدوم ہونے لگا ہے۔ یہ بات کس وثوق سے ایسے شخص کے بارے میں کہہ رہا ہوں جس نے اُردو میں سب سے کم سرمایہ چھوڑا ہے لیکن کتنا اونچا مقام پایا۔

"بڑے سے بڑے ذہنوں سے ٹکر لینے اور محفل پر چھا جانے میں بخاری کا جواب نہ تھا، خواہ وہ محفل علم و دانش کے اکابر کی ہو۔ خواہ بے تکلف احباب اور بے فکروں کی، خواہ سیاسی شاطروں کی، بات کوئی ہو۔ موقع کیسا ہی ہو، بخاری نہ مشتعل ہوتے تھے نہ مایوس، نہ متفکر۔ توازن اور تفنّن کی فضا برابر قائم رکھتے تھے۔ مسئلہ زیر بحث کتنا ہی نازک اور پیچیدہ کیوں نہ ہو بخاری اپنی بات بہت کچھ منوا لیتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ حریفوں کو پسپا ہوتے ہی دیکھا اکثر لاجواب ہو کر۔

"بخاریؔ کے ترکش میں جتنے اور جس طرح کے تیر تھے۔ موقع آجانے پر ان کا انتخاب جس تیزی اور تیقّن سے کرتے اور جس مشاقی سے چلاتے وہ کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ ایسے تیر ہر ترکش میں نہیں ہوتے۔

لے ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۱۴۴ - ۱۴۸ - ۱۵۵ -

"جب تک پطرس لاہور میں انگریزی کے پروفیسر رہے۔ ان کا اور ان کے رفقاء کا اُردو شعر و ادب کی سمت و رفتار پر برابر اچھا اثر پڑتا رہا۔ ان میں اور ان کے بیشتر ساتھیوں میں اُردو شعر و ادب کا ذوق مشرقی تہذیب کا رکھ رکھاؤ اور طبائع کے اختلاف کے باوجود اپنی قدروں کی بڑی پاسداری ملتی ہے۔ اپنی بیش بہا غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے بخاری لاہور کے تعلیم یافتہ، ذہین، ہونہار نوجوان طبقے کے سرخیل رہے۔ اعلیٰ پائے کی ذہانتوں کا اتنا اچھا اور بڑا اجتماع اس زمانے میں شاید ہی کہیں اور دیکھنے میں آیا ہو۔ بخاری نہ ہوتے تو شاید ایسی مختلف النوع، بے مثل ذہانتوں کا ایک مرکز جمع ہونا ممکن نہ ہوتا۔ کبھی کبھی یہ بات بھی ذہن میں آئی ہے کہ اگر بخاری ان رفیقوں کے ساتھ لاہور میں اسی طرح پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے ہوتے جیسے سرسید اور ان کے رفقاء علی گڑھ میں تو اُردو کی نئی فتوحات کا کیا عالم ہوتا۔

"سوال یہ ہے کہ جہاں ذہنی صلاحیتوں کے اس کثرت سے اکابر موجود ہوں علمی، قومی، تہذیبی کارناموں کی روایات کی فراوانی ہو اور قوم و ملک کی نئی تشکیل و تنظیم کے لئے دعوت کار اور کارزار بھی کچھ کم نہ ہو۔ وہاں بے عملگی اور بے حوصلگی کیسی۔ اس اجتماع کے افراد نے اپنے اپنے طور پر چاہے جو کچھ اور جتنا کچھ کیا ہو اس سے انکار نہیں لیکن ایسی اور اتنی غیر معمولی قابلیتوں کا کوئی عہد آفریں کارنامہ سامنے نہ آیا۔ یہ بھی اپنی جگہ ایک المیہ نہیں تو مسئلۂ فکر یہ ضرور ہے۔

بخاری مرکز گریز اعلیٰ صلاحیتوں کو اپنے گرد جمع رکھ سکتے تھے۔ ایک حد تک انہوں نے رکھا بھی لیکن یہ شخصی تعلقات کی بنا پر تھا۔ کسی

عظیم مقصد یا منظم اسکیم کے تحت جیسی کہ مثلاً علی گڑھ تحریک بھی نہ تھا اور جس کے بغیر دور رس اور دیر پا نتائج نہیں پیدا ہو سکتے۔ آج بخاری کی یاد میں یہ بات ذہن میں آئی لیکن بے وقت نہیں آئی۔ اب بھی اس کا امکان ہے کہ لاہور کے بچے کھچے احباب ہونہار نوجوانوں کو اپنے سایۂ شفقت میں لے کر اس کام کو آگے بڑھائیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ایک نئے صحت مند، علمی، ادبی اور تہذیبی محاذ کی پاکستان کو بڑی ضرورت ہے۔

"بخاری بڑے بت شکن تھے۔ جینیس کا تقاضا بھی یہی ہے لیکن جہاں وہ خداؤں میں صرف مسلمانوں کے خدا کے قائل تھے وہاں بتوں میں صرف اپنے بتوں کے۔ وہ خطوط بڑے اچھے لکھتے تھے۔ ان کے کتنے اور کیسے دل آویز شد و خال ان خطوط میں جلوہ گر ملتے ہیں۔ اچھے خطوط وہی لکھ سکتا ہے جس کو مکتوب الیہ سے اخلاص اور اپنے آپ پر اعتماد ہو۔

"محبت کی سب سے معتبر علامت یہ ہے کہ عاشق اپنے راز محبوب پر ظاہر کرنے لگے۔ اچھے خطوط لکھنے کے لئے یہ رشتہ اتنا ضروری نہیں ہے خط لکھنے کا وہ فن ہے جہاں تکلف یا تصنع لکھنے والے کو لے ڈوبتا ہے۔ سیفٹی فرسٹ یا سلف فرسٹ کے بندے کبھی اچھے خط لکھنے والے نہیں ہو سکتے۔ "آمیزشے کجا گہراو کجا" کا اطلاق خط نگاری کے فن پر بھی ہوتا ہے۔

"امریکہ یا کہیں اور سے دوستوں کے نام جو خطوط انہوں نے وقتاً فوقتاً لکھے اور اردو کے رسالوں میں شائع ہوئے۔ ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی معلومات کتنی وسیع اور جامع، مشاہدہ کتنا تیز، ذہن

کتنا زرخیز، تاثرات کتنے گہرے تخیل کتنا نادرہ کار، اور بات کہنے کے انداز میں کتنی شوخی، شیرینی اور تازگی تھی۔ وہ اپنی نجی تحریروں میں کبھی کبھی اپنے سے بھی زیادہ دل کش معلوم ہونے لگتے تھے۔ یہ فن اور شخصیت دونوں کا اعجاز ہے۔

"کچھ عرصے[1] سے ان کی صحت تیزی سے گرتی جارہی تھی جس کے سبب سے خاموش اور دل گرفتہ رہنے لگے تھے۔ اس کے باوجود جیسے کبھی کبھی "بادِ شمالی" کا گذر ہو جاتا اور افسردہ کلیاں مہکنے لگتیں۔ کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر دوستوں کو جمع کرتے سیر کو نکل جاتے۔ ان کے ساتھ کھانا کھاتے اور ہنس بول کر وقت گذار لیتے۔ جو ان کا ہمیشہ سے محبوب مشغلہ تھا"

بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب مرحوم

"موت[2] سے کسی کو مفر نہیں لیکن جو لوگ اعلیٰ مقاصد کی تائید و حصول میں تادمِ آخر کام کرتے رہتے ہیں وہ کتنی ہی طویل عمر کیوں نہ پائیں ان کی وفات قبل از وقت اور تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے پہلی صورت طبعی اور ارضی ہے۔ دوسری اخلاقی اور مادی۔ تقدیرِ الٰہی نے صرف نوعِ انسان کو موخرالذکر اقدار کے تحفظ و ترفع کے لئے انتخاب کیا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی زندگی اور وفات دونوں میں اس کی تعبیر ملے گی۔

"عنفوانِ شباب کی بے پایاں اور لیسا اوقات تند صلاحیتوں کی تربیت و تہذیب اور ان کو صحیح راستے پر لانے اور رکھنے کے لئے بڑے جتن

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۱۵۶ - ۱۵۷

[2] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۱۷۹ - ۱۸۰ - ۱۸۱ - ۱۸۲ -

کرنے پڑتے ہیں. مولوی صاحب یقیناً بڑے خوش قسمت تھے کہ ان کو سرسید کا سایہ اور سہارا اور ان کے نادرۂ روزگار رفقائے کرام کی صحبتیں نصیب ہوئیں۔ انہیں علی گڑھ میں اتنی معقول و موثر نظری و عملی رہبری نہ میسر آتی تو کیا معلوم وہ کدھر نکل جاتے۔ . . . یہ اس لئے کہنا پڑا کہ آج کل بیشتر ذی استعداد اور ہونہار نوجوانوں کو مناسب و معقول رہبری اور ماحول نہ ملنے سے بے راہ روی نے دنیا کو جس انتشار مایوسی اور بے زاری سے دوچار کر رکھا ہے وہ ہمارے سامنے ہے جس کو دور کرنے میں ہماری بہترین مساعی اب تک ناکام رہی ہیں۔ خدا نہ کرے یہ سرکشی اور گمراہی اپنا تاوان لئے بغیر نہ رہے جیسا کہ تاریخ بتاتی چلی آ رہی ہے جس کے آثار روز بروز نمایاں ہو رہے ہیں۔

"مولوی صاحب کو شروع سے آخر تک وقت کی ایسی گراں مایہ شخصیت کی صحبت و رفاقت نصیب رہی جنہوں نے ہمارے قدیم کی اعلیٰ روایات و اقدار کو جدید کے اہم تقاضوں سے روشناس کرانے اور سازگار بنانے میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اس سے ہماری علم دوستی تہذیب و شائستگی، فرض شناسی، محنت کوشی، ایمان داری اور دلیری کے کارنامے روشن ہیں۔ انہوں نے ایک نازک اور پرآشوب زمانے میں قدیم کا اعتبار و وقار جدید کی تاخت و تاراج میں محفوظ بھی رکھا اور روشن بھی۔

خیال[1] ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کی زندگی نے کچھ اور وفا کی ہوتی تو

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۱۸۸ - ۲۰۰ - ۲۰۶۔

کراچی میں اُردو یونیورسٹی قائم کر دیتے جس کے لئے وہ کتنے مضطرب اور کس درجہ کوشاں تھے۔ وقت کا تقاضا بھی تھا اور حالات بھی سازگار ہو چلے تھے لیکن انسان کی زندگی اس کے مقاصدِ جلیلہ کی زندگی سے ہمیشہ کم ہوتی ہے وہ کتنی ہی طویل عمر کیوں نہ پاتے بالآخر مرتے۔ بڑے مقاصد کی بھی زندگی ہوتی ہے لیکن ہوتی ہے ہماری آپ کی زندگی سے علیحدہ جس پر کبھی موت طاری نہیں ہوتی۔ ہوتا یہ ہے کہ مقاصدِ عظیمہ وقتاً فوقتاً اپنی زندگی کا کچھ حصہ ہمارے آپ کے حوصلے اور استعداد کے مطابق ہم کو ودیعت کرتے رہتے ہیں۔ اسی کے بہ قدر ہم کام کرتے ہیں۔ پھر دوسروں کے لیے جگہ خالی کر دیتے ہیں۔

"کوئی مہم آج تک فرزانوں سے سر نہ ہوئی۔ اس کے لئے دیوانوں ہی کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اُردو کی "وادی پرخار" اپنے کانٹوں کی پیاس بجھانے کے لئے ہمیشہ کسی "آبلہ پا" کی منتظر رہے گی اور مولوی عبدالحق جیسا بے نیاز آبلہ پا اس وادی سے اب تک نہیں گذرا۔

"مولوی صاحب میں بے شمار خوبیوں کے ساتھ کچھ کمزوریاں بھی تھیں جو اس مزاج اور ماحول کا خاصہ ہیں جو مولوی صاحب کا تھا لیکن ان کو معرض بحث میں لانا ضروری نہیں سمجھتا۔ انسانی ذہن اور آئندہ نسل میں انسان کی فضیلتوں ہی کی یاد باقی رہے تو اچھا ہے۔ خوبیوں کو جتانا اور کمزوریوں کو نظر انداز کرنا کسی اور آئین کے مطابق ہو نہ ہو۔ آئین سیرت نگاری کے مانے ہوئے ضوابط کے خلاف یقینی ہے جہاں ہر شخص کے کھرے کھوٹے کو علیحدہ کر کے دکھاتے ہیں۔ میں سیرت نگاری کے فرائض انجام دینے کے منصب پر فائز ہونے یا کیۓ جانے کا خواہشمند

بھی نہیں ہوں۔ کسی کی خوبیوں کو جتانے اور کمزوریوں کو چھپانے کے طریقے کو اصولاً صحیح نہیں سمجھتا۔ لیکن عملاً اس کو غلط بھی نہیں قرار دیتا۔ اس لئے کہ دیکھا اکثر یہ جاتا ہے کہ بُرے اور بدنیت اشخاص بڑے اور اچھے لوگوں کی تمام خوبیوں سے منہ موڑ کر ان کی صرف ایک آدھ کمزوریوں کو اپنی بداعمالی و بے راہ روی کے جواز میں چن لیتے ہیں۔

کسی کے عیب نکالنے سے بہتر مشغلہ چپ رہنا ہے اور دونوں سے بہتر اس کی خوبیوں کو ظاہر کرنا ہے اس طریق کار سے فن کا حق ادا ہوتا ہو یا نہیں یہ فن کار اور ان کے مربی اور محتسب جانیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ انسان اور انسانیت کے تقاضے فن اور فنکار کے تقاضوں سے وسیع تر اور عظیم تر ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

میں اسکول کا طالب علم تھا کیسے اچھے وہ دن تھے جب جینے کی ہر خوشی اپنے دیار اور اپنے عزیزوں اور دوستوں میں نصیب تھی۔ اور اس سے کم خوشی مجاہدوں کے دیار میں جان دینے کی اس دعوت و بشارت میں نہیں ہوتی تھی جو مولانا ابوالکلام کی آتش نوائی میں ملتی تھی۔ عمر کا وہ دور کتنا مسعود اور کتنا عجیب تھا۔ اچھے اور برے کاموں کے لئے جیتے رہنے اور جان دینے دونوں کی یکساں خوشی تھی۔ گذرے ہوئے دنوں کی یاد کسی کو نہیں عزیز ہوتی بالخصوص بوڑھوں کو جنہیں صرف ماضی کی جائے پناہ میسر ہوتی ہے اس لئے یہ کہنا کہ وہ عہد کتنا مسعود اور عجیب تھا واقعہ کے اعتبار سے ممکن ہے اتنا صحیح نہ ہو جتنا

اپنی یاد کے اعتبار سے میرے لئے حسین و عزیز ہے۔

"معاف کیجئے[1] گا ماضی کی یاد نے ماضی سے بھی کہیں دور پھینک دیا۔ ماضی کو میں اپنا کارنامہ نہیں قرار دیتا۔ یہ بھی نہیں چاہتا کہ آپ قرار دیں۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اپنے آپ کو کبھی ماضی کا کارنامہ سمجھنے لگتا ہوں۔ بہر حال وہ زمانہ کب کا ختم ہوا اور زمانہ بھی کیا کرنے اس کی تقدیر بھی یہ ہے۔

"ظاہر[2] ہے پرانے وقت کا ہوں۔ راگنی بے وقت ہے زمانہ ترقی کر چکا ہے۔ زندگی اور زندگی کے تار پود نئے اسلوب سے مرتب ہو رہے ہیں۔ ہر چیز کی قدر و قیمت بڑھ رہی ہے جس چیز کو ہم متاع یوسفی سمجھتے تھے وہ متاع کاسد سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور جسے اب دیکھ کر ہم خجل اور سراسیمہ ہوتے ہیں وہ حاصلِ حیات ہے۔ زمانہ اور زندگی کی رفتار ہی نہیں اس کا رخ بھی بدل گیا ہے لیکن زندگی کی برہنگی کو برگزیدہ حقائق کا انکشاف کیوں کر مانا جائے۔ سائنس کے کرشموں کو انسانیت کی معراج کیسے قرار دیا جائے۔ آرٹ اور آزادی کی قربان گاہ پر کن سعادتوں کی بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے۔ افراد کی شادی اور غمی کیا ہوگی۔ ان کی پروا کیوں نہیں کی جاتی۔ جماعت کے ریگ زار سے افراد کی امید و امنگ کے نخلستان کیوں فنا کئے جا رہے ہیں۔ زمانہ کے بدلنے سے زندگی کی سیئات حسنات میں کیوں کر تبدیل ہو جاتے ہیں۔

"مولانا[3] ابوالکلام سے خط و کتابت عمر بھر میں دوبار ہوئی۔ ملاقات صرف

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۸۹ - ۱۰۶ [2] گنج ہائے گراں مایہ صفحہ ۱۹

[3] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۱۰۵ - ۱۰۶۔

ایک بار۔ وہ بھی ان کے آفس میں چند منٹ کے لئے ڈیوٹی سوسائٹی سے متعلق ۱۹۴۰ء کے آخر میں۔ بہت سے دوسرے اصحاب کے مانند مولانا سے میری غائبانہ اور بہت گہری عقیدت اس وقت سے ہے جب بلقان اور طرابلس کی جنگ برپا تھی۔ الہلال میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے۔

"مولانا ان برگزیدہ ہستیوں میں تھے جو اپنے عہد سے بڑی تھیں۔ وہ آفرینندۂ عہد تھے۔ اس لئے ان کی کشمکش ایسے لوگوں سے رہتی جو زائیدہ عہد ہوتے۔ وہ ہماری تاریخ، ہماری تہذیب اور ہمارے علوم کا اعتبار و افتخار تھے۔ اس کا احساس آج ہو رہا ہے جب وہ ہم میں نہیں رہے۔ کیا کیا جائے ایسا احساس بھی ایسے ہی وقت ہوتا ہے۔

[1] علم کی معرفت اور مذہب کے شرف و سعادت نے ایسی بلند نظری اور خود اعتمادی پیدا کر دی تھی کہ وہ زندگی کے مصائب و مکروہات اور سیاست کے شور و فتن سے پراگندہ خاطر اور تلخ کام نہیں ہوتے تھے جو شخص ہار جیت دونوں میں اپنا سہارا خود ہو اس کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہوئے ہیں جو نارمل ہوں اور اپنا سہارا خود ہوں۔

"مولانا ابوالکلام آزاد عوام کے آدمی نہ تھے۔ کتنے خواص کو بھی ان کے ہاں عوام کے درجے پر اکتفا کرنا پڑتا تھا۔ شاید انہوں نے اقبال کے عقاب کی طرح چٹانوں کی بلند و ویران تنہائیوں میں اپنی دنیا بنا رکھی تھی۔

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۱۱۲ - ۱۱۹ - ۱۲۰

وہ عزلت نشین، دیر آشنا اور کم آمیز تھے۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ ہر قوم ہر ملک اور ہر زمانے کے "خاصانِ بارگاہ" سب سے کنارہ کش ہو کر زندگی کا وہ زمانہ جو ترغیباتِ نفس کے اعتبار سے غفلت اور غلبے اور ضمیر و دانش کے اعتبار سے نیم پختہ ہوتا ہے۔ عبادت و ریاضت میں گذارتے ہیں۔ اس خلوت، عبادت اور ریاضت (اعتکاف) کا مقصد، مطالعہ ذات اور محاسبۂ نفس ہوتا ہے۔ اس سے ان پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ ان کی زندگی کا کیا مشن ہے اور وہ خلقِ خدا کی کس خدمت پر مامور (من اللہ) ہونے والے ہیں۔ ان مراحل سے گذرنے کے بعد وہ دعوتِ حق اور خدمتِ خلق کے لئے عامۃ الناس میں آتے ہیں۔ یہ تو نہیں بتا سکتا کہ مولانا اپنی زندگی کے کس خاص عہد میں اس مرحلے اور منزل سے گذرے ہیں یا نہیں۔ اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اس مطالعے اور مجاہدے میں کسی نہ کسی حد تک مولانا آخر دم تک منہمک رہے۔ اپنے محاسبے کے لئے اپنی کمیں گاہ میں بیٹھنا ایک بات ہے اور بڑی بات ہے اور آپ اپنی بنائی ہوئی جنت یا خانقاہ میں بیٹھنا قطعاً دوسری بات ہے اور بہت معمولی بات ہے۔ اول الذکر حالت وسیلہ ہے ایک بڑے مقصد کا اور مؤخر الذکر بجائے خود ایک مقصد ہے لیکن ادنیٰ مقصد۔ ایک پناہ لیتا ہے اور دوسرا پناہ بنتا ہے۔

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی سردار دور دور ایسا نظر نہیں آتا جس کے سپردِ ہندوستانی مسلمانوں کی حمایت و ہدایت کی ذمہ داری اعتبار و افتخار کے ساتھ کی جاسکے۔

ع اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی۔"

حسن عبداللہ مرحوم

بھونپو بے وقت بجا۔ دل دھک سے ہو گیا۔ حسن عبداللہ رحلت کر گئے۔ یونیورسٹی کے حال ہی میں "اسٹیوارڈ" مقرر ہوئے تھے۔ اس کام کے علاوہ یونیورسٹی میں رسد رسانی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ اکڑنے اور فروتنی دونوں میں یگانہ ——— نہ آہستہ بولتے تھے نہ چپکے سے کام کرتے۔ بڑے شریف گھرانے کے تنہا اُجالا تھے۔ اخلاق و وضعداری میں کھرے۔

میرے وہ شاگرد تھے۔ انہوں نے مسلم یونیورسٹی سے اُردو میں ام اے کیا تھا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی فکر میں لندن گئے۔ لڑائی چھڑی تو سلسلہ منقطع کر کے ہندوستان واپس آ گئے۔ گریجویٹ ہوتے ہی وکالت شروع کر دی تھی لیکن ان کا دل اُردو لکھنے پڑھنے میں لگتا تھا۔ کچھ دنوں آگرہ میں اُردو فارسی کے لیکچرار رہے۔

میرے سامنے وہ سگریٹ نہ پیتے۔ میں دفعتاً ان کے آفس میں پہنچ جاتا اور وہ سگریٹ پیتے ہوتے تو اسے مسل کر چھپا دیتے یا پھینک دیتے اور سرو قد کھڑے ہو جاتے۔ ان سے بارہا کہا، اس تکلف میں کچھ نہیں دھرا ہے اس سے مجھے آپ ہی سے نہیں خود اپنے سے بیگانگی کا احساس ہونے لگتا ہے اور یہ بات میرے لئے ہمیشہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ان کو یہی اچھا لگتا ہے۔

وہ جذباتی آدمی تھے۔ جذباتی آدمی بالعموم مخلص ہوتا ہے اس کے دل میں کھوٹ کپٹ کا بڑی مشکل سے گذر ہوتا ہے۔ طبعاً وہ عوام کے آدمی تھے اور چھوٹوں کی حمایت میں بڑے سے بڑے کو خاطر میں نہ لاتے

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ صفحہ ۲۶۳ - ۲۶۴ - ۲۶۵ -

تھے۔ مجھے ان کی یہ ادا بھاتی تھی۔

میرا وہ بہت خیال کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر میرے دل میں شگفتگی اور اعتماد پیدا ہو جاتا تھا اور جس شخص کو دیکھ کر میرے دل کی یہ حالت ہوتی ہے اس کے مرنے کا مجھے بڑا غم ہوتا ہے لیکن اس غم کا مقابلہ اس غم سے کیسے کروں اور کون کر سکتا ہے جو مرحوم کے بوڑھے باپ، بوڑھی ماں، بھائی پر فدا ہونے والی بہنوں، نیک نفس بیوی اور معصوم بچوں کا ہوگا۔ ایسوں کا غم اور ایسا غم اس رحمتِ بے کراں کی طرف سے مغفرت کی بشارت ہے جس کے جوار میں مرحوم پہنچ گئے۔ میں کچھ ایسا ہی عقیدہ رکھتا ہوں۔

محمد ایوب عباسی مرحوم

محمد ایوب[1] عباسی مرحوم اتنے اچھے تھے، اتنے ارزاں تھے اور اتنے ناگزیر تھے کہ وہ موجود تھے تو ان کی مثال نعائمِ فطرت کی تھی۔ مثلاً ہوا، پانی روشنی، جو اس درجہ عام وارزاں ہیں کہ ان کی طرف توجہ مائل نہیں ہوتی۔ لیکن ان میں سے کسی میں کہیں سے کوئی فرق آجائے تو پھر دیکھئے کیسی کیسی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اور یہی ناقابلِ التفات چیزیں کیسی نعمتیں بن جاتی ہیں ـــــ ایوب ایسے ہی تھے۔

میری ہی نہیں میرے عزیزوں اور دوستوں کی بھی ان سے بڑی پرانی ملاقات چلی آتی تھی۔ اور میں نہیں بتا سکتا کہ ہم سب کی زندگی میں ایوب کس قدر دخیل تھے اور ان کی موت نے ہم سب کو کیسا بے قرار و مایوس اور کس درجہ بے دست و پا کر دیا۔ وہ میرے ہی دیار کے تھے۔ اور ایک بڑے مستند، شریف، ذی علم اور صاحب خیر گھرانے کے چشم و چراغ

[1] گنج ہائے گراں صفحہ ۱۵۱- ۱۵۲ - ۱۵۳- ۱۵۶- ۱۵۷

تھے۔ میں علی گڑھ میں تھرڈ ایر میں تھا جب ایوب فرسٹ ایر میں داخل ہوئے۔ بی اے۔ ال۔ ال بی ہو کر پروووسٹ آفس میں ملازمت کر لی۔ اور علی گڑھ ہی میں رہ بس گئے۔ اسکول کی تعلیم کے دوران میں وہ میرے عزیزوں و خوردوں کے ہم سبق تھے۔ علی گڑھ آئے تو ہم سب ایک ہو گئے اور سترہ اٹھارہ سال تک ہر رنج و راحت میں ایک دوسرے کے شریک رہے۔

"مجھ پر میرے بچوں پر میرے دوستوں پر اور میرے خاندان پر جان چھڑکتے تھے۔ ایک دفعہ بیوی بچے مکان گئے۔ میں اور دو بچیاں رہ گئیں۔ باورچی بک بیک چلا گیا۔ برسات کا موسم تھا۔ میں دن بھر مارا مارا پھرا تھا۔ کوئی پانچ چھ بجے شام گھر واپس ہوا۔ دیکھا تو ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی ہے۔ بچیاں صحن میں آم کھا رہی ہیں۔ ذرا سی دیر میں ایوب صاحب آنکھ ملتے راکھ میں لت پت باورچی خانہ سے ڈانٹ کر بولے۔ "جی گلچھڑے اڑائیے۔ لکڑیاں بھیگی ہوئی ہیں۔ چولہا ٹوٹا ہوا ہے۔" میں نے کہا کیا ہوا۔ آخر ڈائننگ ہال کو کیا ہوا تھا۔ وہیں سے انتظام کر لیا ہوتا۔ بولے جی شام کے پانچ چھ بجے آپ کے لئے ڈائننگ ہال سے باقر خانیاں آ جاتیں۔ بچیاں کیا کرتیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آفس سے براہِ راست شہر گئے۔ وہاں سے بچیوں کے لئے آم اور پکانے کے لئے کچھ ساگ ترکاری لائے۔ بچیوں کو آم میں پھنسا کر خود باورچی خانے میں پل پڑے۔ ترکاری ساگ اور کچھ اسی قسم کی چیزوں سے الجھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا بھئی ایوب خدا کے لئے کچھ تو ٹھکانے کی چیز کھا پی لیا کرو ورنہ آنکھیں بھیک مانگنے لگیں گی۔ بولے۔ جناب نے بھی تو منجن ہی کھا

کھا کر عینک کے نمبر بڑھائے ہیں۔ کھانا پینا ختم ہوا تو اپنی کھری چارپائی بچیوں کی چارپائی کے درمیان بچھا کر لیٹ گئے اور ان سے ان ہی کی دلچسپی کی اِدھر اُدھر کی باتیں کرنی شروع کر دیں۔ جب وہ سو گئیں تو سر سے پاؤں تک کمبل تان کر خاموش ہو گئے۔

ایوبؔ صاحب کی سیرت و شخصیت کا عجیب اور نادر پہلو یہ تھا کہ بڑے سے بڑا آدمی ہو یا چھوٹے سے چھوٹا ان سے عزت آمیز محبت کرتا تھا۔ ترس کھا کر یا مجبور ہو کر نہیں بلکہ ان سے محبت کرنے میں اسے لطف آتا تھا۔ ایوب سے محبت کر کے جیسے دل کو تسکین ہو جاتی تھی۔ ایک طرح کی پُر افتخار اور اطمینان بخش تسکین جیسے یہ احساس کہ ہم میں بھلائی کرنے یا بلند ہونے کا جذبہ یا استعداد ہے۔ محبت کی ایک قسم وہ بھی ہوتی ہے جو اپنے سے حقیر یا پست حال سے کی جاتی ہے جیسے لوگ اپنے کتے سے کرتے ہیں یعنی اسے سمجھتے کتا ہی ہیں لیکن چومتے چمکارتے رہتے ہیں اس قسم کی محبت بالعموم بڑے آدمی چھوٹے سے کرتے ہیں، لیکن ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ محبت یا اخلاق کا مظاہرہ کرنے کے اعتبار سے تو لوگ انہیں انسان سمجھیں لیکن خود ان کے جذبۂ فرعونیت کی تسکین ہو۔ یعنی ہم ایسے ہیں کہ ترس کھا کر اپنے بندے سے محبت کرتے ہیں۔ اور اس طور پر اس کی زندگی میں امید و فخر کی ہلکی سی لہر دوڑا کر ہم چشموں میں بیٹھنے اور سر بلند ہونے کے قابل بنا دیتے ہیں۔ اس طرح کی محبت یا عزت ایوب صاحب سے کرنے کی کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ایوب صاحب

۱؎ گنج ہائے گراں مایہ صفحہ ۱۶۳ - ۱۶۶ -

وہ تھے جس کے لئے ہر شخص اپنی عزت یا شہرت کو داؤ پر لگا دینے کے لئے بے تامل تیار ہو سکتا تھا۔ ایوب صاحب سے محبت نہ کیجئے۔ یا ان کی عزت نہ کیجئے تو یہ محسوس ہوتا کہ ہم میں شریفانہ جذبات یا احساسِ ذمہ داری کی کمی ہے۔

" وہ اپنے رشتہ داروں سے کچھ بہت زیادہ راضی نہ تھے۔ سب کے سب ایوب صاحب کی شرافت اور کشادہ دلی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے درپے رہتے تھے۔ اس کا انہیں غم تھا۔ ایک دن بہت اداس تھے۔ آئے تو میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح ان کا جی بہل جائے۔ معلوم نہیں کیا ہوا کہ وہ یکایک آبدیدہ ہو گئے۔ میں نے پوچھا تو بڑے تامل کے بعد واقعہ سنایا۔ وہی عزیزوں کی دنائت اور شقاوتِ کار۔ میں نے کہا ایوب صاحب! آپ بددل نہ ہوں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ قصور ہے تو صرف اتنا ہے کہ آپ خوش حال اور نیک نام کیوں ہیں۔ ہمارے آپ کے اعزہ کے دلوں سے نیکی اور فیاضی اٹھالی گئی ہے۔ اغیار کو تو یہ مسرور اور بافراغت دیکھ کر خوش ہوں گے اور فخر کریں گے۔ لیکن اپنوں کو کھاتا پیتا یا ہنستا بولتا دیکھ کر غم و غصہ کے انگاروں پر لوٹنے لگیں گے۔ یہ اپنے نکھے پن اور بے غیرتی کو اپنی بہت بڑی خوبی اور اپنا حربہ سمجھتے ہیں۔ یہ اپنے کھاتے کماتے عزیزوں کو غاصب سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آپ نے ان تمام نعمتوں پر قبضۂ مخالفانہ کر رکھا ہے۔ جو بصورت دیگر ان کے قبضہ میں آتیں۔ وہ کبھی نہ دیکھیں گے کہ وہ خود کتنے ناکارہ اور بے ایمان ہیں اور جو فراغت، ناموری اور نیک نامی سے رہ رہا ہے اس نے کتنی محنت کی ہے اور اذیت اٹھائی ہے۔ اور یہ کچھ ہمارے بیشتر رشتہ داروں ہی کا حال نہیں ہے بلکہ اس انفرادی

کمزوری اور کمینگی نے پھیل کر جماعتی رنگ اختیار کر لیا ہے۔ جماعتی ہی نہیں بلکہ قومی اور سیاسی بھی۔ سرمایہ و مزدوری کی جنگ اپنی جگہ برحق، بجا نب ہے۔ اور جہاں تک اس کے اخلاقی اور اقتصادی پہلوؤں کا تعلق ہے اس کے معقول ہونے میں شبہ بھی نہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس اسکیم کو چلانے والے اور اس سے فائدہ اٹھانے والے بیشتر وہی لوگ ہیں جو نکمے، بد خود غلط، اور کینہ پرور ہیں۔ دنیا کے کسی آشوب کا مطالعہ کیجیے آپ کو بالآخر یہی نظر آئے گا کہ معقول نظام یا تحریک نامعقولوں کے ہاتھ میں تھی۔ آپ ہی سوچیے کیا مزدور اور کاری گر کے علاوہ کوئی اور طبقہ اس دنیا میں قابلِ عزت اور لحاظ نہیں ہے۔ دنیا کی نجات دولت یا دولت کی مساوی تقسیم پر نہیں بلکہ محنت اور قابلیت کے صحیح احساس و تنظیم پر ہے۔ میں آج کل بازی گروں کے اصولِ تقسیم کا بالکل قائل نہیں جس سے "دولت" ان کے ہاتھ میں جائے اور "مساوی" میرے ہاتھ میں رہ جائے۔

آخر میں میں نے ان سے کہا۔ ایوب صاحب اپنا کام کیے جائیے۔ دولت و شہرت کا حساب عزیزوں کو نہیں اللہ تعالٰے کو دیا جائے گا۔ البتہ آپ اس کے لئے تیار رہیئے کہ جتنا اللہ آپ کو کار گذار، فارغ البال، نیک نام اور بھلا مانس بنائے گا اتنا ہی شیطنت آپ کی دشمن بنتی جائے گی۔

مرحوم اپنے جن بزرگوں یا دوستوں کو عزیز رکھتے تھے انہیں میرے ہاں ضرور لاتے اور مجھ سے ملا کر بہت خوش ہوتے۔ پھر بڑا اصرار کرتے کہ میں ان سے ان کے گھر یا جائے قیام پر جا کر مل آؤں۔ یہی نہیں بلکہ جب کسی کو تکلیف یا مصیبت میں دیکھتے یا اس کے ہاں خوشی کی کوئی بات ہوتی تو مجھے خبر کرتے کہ میں وہاں ہو آؤں۔ میں ایسا کر دیتا تو ان پر مسرت اور شکر گذاری

کا عجیب عالم طاری ہوتا۔ ظاہر ہے اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ میری اس بھلمساہت کی لوگ قدر کریں۔ لیکن یہ بات یہیں نہیں ختم ہو جاتی۔ واقعہ یہ ہے کہ جس شخص یا بات سے انہیں تقویت یا مسرت ہوتی تھی اس میں وہ مجھے شریک کر لینا چاہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ میں نے ان کے انتخاب کو پسند کر لیا تو اس پر استناد کی مُہر لگ گئی۔ تیسرے یہ کہ انہوں نے جس کو مجھ سے ملایا اس کے ساتھ بہت بڑا سلوک یہ کیا کہ مجھ ایسے (بزعم خود) معقول آدمی سے ایسے متعارف کیا۔ بہ ظاہر یہ باتیں دور از کار اور خود میرے برخود غلط ہونے پر دال ہیں اور اپنے منہ سے ان کا تذکرہ کرنا میرے لئے بڑی بھدی بات ہے لیکن میں مرحوم کی بعض تحت شعوری سرگرمیوں سے واقف ہوں۔ ان کا مقصد وہی تھا جو میں نے بیان کیا۔

"یونیورسٹی[1] سے ایک قطعہ زمین مکان بنانے کے لئے میں نے پٹہ پر لی تھی۔ یہ ایوب صاحب کے مکان سے متصل تھی۔ برسوں میرے پاس افتادہ پڑی رہی۔ مرحوم کا مسلسل اصرار رہا کہ رشید صاحب مکان بنوا لیجئے۔ ہر شخص بنوا رہا ہے۔ آخر آپ کیوں نہ بنوائیں۔ تھوڑا سا حصّہ چھوڑ دیجئے گا اس میں ایک جھونپڑا ڈال لوں گا۔ مویشی پالوں گا، مرغیاں رکھوں گا اور کھیتی کیاری کروں گا۔ میں نے کہا میں مکان نہ بنواؤں گا۔ ساری زمین آپ کی ہے جو چاہے کیجئے۔ مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ آپ سے کچھ ہوتا ہے یا نہیں۔ کہنے لگے جی نہیں۔ میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ یہاں آپ کا مکان ہو آپ تمام روپیہ خرافات میں اٹھاتے ہیں۔ مکان ہو گا تو ایک چیز ہو جائے گی۔ آپ قریب ہو جائیں گے۔ وسیع عالی شان مکان۔ میں سمجھوں گا میرا ہی

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ صفحہ ۱۶۹

مکان ہے۔ جب چاہوں گا چلا جایا کروں گا۔ ایک ٹھکانا ہو جائے گا۔

مکان بنا لیکن ایوب کا ارمان پورا نہ ہوا۔ اب وہ اور ان کا ارمان دونوں یونیورسٹی کے گورستان میں آسودۂ راحت ہیں۔ یہاں پہنچ کر مجھے بے اختیار اپنا چھوٹا چچازاد بھائی نوجوان مرگ رفیق یاد آگیا جس نے بارہ تیرہ سال مرتے دم تک مجھ پر اور میرے بیوی بچوں پر اپنی روشن اور رنگین زندگی کی وہ متاع نثار کردی۔ جس کی قیمت اس دنیا میں آج تک کوئی نہیں لگا سکا۔ آہ کیا نثار ہونا اور کس کس طرح نثار ہونا جس نے تمام عمر یہ خیال دل میں نہ آنے دیا کہ اپنی استعداد سے اپنے آپ کو کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچنا چاہیئے بلکہ اسی کا قائل رہا اور اسی پر مرمٹا کہ اس کی ہر نعمت اور اس کی ہر متاع میرے اور میرے بیوی بچوں ہی کو راحت و فائدہ پہنچانے کے لئے تھی۔ بہادر اور باوقار رفیق بھی مکان کا ارمان اپنے ساتھ لے گئے۔ میں اپنا مکان دیکھ کر مسرور و مطمئن ضرور ہوتا ہوں لیکن جب رفیق اور ایوب یاد آتے ہیں تو دل بے اختیار ہو کر ناممکنات کی آرزو کرنے لگتا ہے۔ یعنی کاش دونوں زندہ ہو جاتے اور میں انہیں بھی مکان میں گلے لگاتا۔ ان کا خوش ہونا اور دھوم مچانا دیکھتا اور مطمئن ہو جاتا کہ میں نے بھی کچھ کام کیا۔

مدتِ حیات کا حساب کتاب سال اور ماہ کے گذرنے سے نہیں کرتے۔ عزیزوں کی مفارقت سے بھی کرتے ہیں۔ وہ اٹھائے جاتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اپنی زندگی ختم ہو گئی۔ عمر چاہے جہاں تک پہنچے۔ عمر پانے کو زندہ رہنا نہیں کہتے۔ زندگی اپنی زندگی سے اتنی عبارت نہیں ہوتی جتنی عزیزوں کی زندگی اور خوشی سے ہوتی ہے۔ یہ نہیں تو زندہ رہنا اور نفس کے مطالبے پورے کرتا رہنا ایک مسلسل بے غیرتی اور بڑھتی ہوئی

تنہائی اور تاریکی ہے جس کو نہ چھپا سکتے ہیں نہ اس سے چھٹکارا حاصل کرتے ہیں اور بہ ستم بالائے ستم یہ کہ ایسے حق بجانب بھی نہیں قرار دے سکتے۔"

ام۔ اے او کالج کے چند کردار

بڑے لوگوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اکثر گدڑی سے لعل اور سنگریزوں سے گہر چن لیتے ہیں۔ ان کو آب و تاب سے سجاتے اور مستفید ہوتے ہیں۔ ان کی نظر میں ان میں وہ سب کچھ دیکھ لیتی ہیں جو دوسروں کے لئے ممکن نہیں ہے رشید صاحب نے بھی اپنے ام۔ اے او کالج کے ماحول سے کئی کردار چنے ہیں جن کو انہوں نے نہ صرف ہمیشہ یاد رکھا بلکہ ان کی بعض خوبیوں اور صلاحیتوں کو اپنے دل میں بھی جگہ دی اور بہ قول ان کے "ان کرداروں کو کبھی کبھی یاد کرکے گماں ہونے لگتا ہے کہ سیرت اور شخصیت یا بحیثیت مجموعی میری قسمت کی تشکیل میں ان کو دخل ہو تو عجب نہیں۔

ان کرداروں میں ایک تو ان کا بیرا سراج ہے اور دوسرا کالج کے ڈاکیہ شیخ جی اور ایک تفریحی کردار میاں کھانی ہیں۔ ایک اور کردار جس کی غیر منقطع وفا شعاری اور فرض شناسی سے وہ بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں کالج کا گھنٹہ بجانے والا کندن ہے

بیرا سراج

"احباب، اساتذہ، اعزا اور رفقاء سے قطع نظر ام۔ اے او کالج کے کتنے طرح طرح کے کردار بے اختیار یاد آتے ہیں۔ اس لئے کبھی کبھی گمان ہونے لگتا ہے کہ سیرت

---

[1] آشفتہ بیانی میری صفحہ ۱۷۱-۱۷۳-۱۷۴-

اور شخصیت یا بہ حیثیت مجموعی میری قسمت کی تشکیل میں ان کو دخل ہو تو عجب نہیں۔ مثلاً میری سائڈ (سید محمود کورٹ مغربی) کا بیرا سراج ۱۹۵۰ء میں پہلی بار ان سے سابقہ ہوا جہاں دس برس پہلے سے ان کا عمل دخل تھا۔ اب تک بفضلہٖ بقیدِ حیات ہیں۔ ایک دن اتفاق سے نظر آ گئے۔ آنکھوں سے کچھ معذور ہو گئے ہیں۔ قریب پہنچ کر آواز دی تو پہچان گئے۔ کتنی باتیں اور یادیں تازہ ہو گئیں۔ ان کو میں نے ہمیشہ ایک ہی حال میں پایا۔ نہ خوش نہ ناخوش۔ نہ سراسیمہ، نہ متعجل، نہ متامل، نہایت کم گو۔ ہر سوال کا جواب مختصر الفاظ میں۔ اس اندیشہ سے قطعاً بے نیاز رہ کر کہ جواب کے عواقب کیا ہوں گے۔ ہر کام مقررہ وقت پر کر ڈالنا یہ ناممکن تھا کہ اس میں دیر سویر ہو۔

دوپہر کو شہر جانا اور اپنے کمرے کے طالب علموں کی ضرورت کی چیزیں خرید لانا معمول تھا۔ یہ کبھی نہ ہوا کہ سراج کوئی چیز بھول گئے ہوں۔ یا دام پر لڑکوں سے حجّت کی نوبت آئی ہو۔ یوں بھی اس زمانے میں حساب کرنے میں جھگڑنا چاہے وہ کسی سے ہو اچھی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ نہ کبھی بدتمیزی کی نہ چوری کی۔ نہ انعام مانگا۔ کسی نے دے دیا تو اس پر شادمانی اور شکرگذاری کا بھی اظہار نہیں کیا۔ یا کرتے ہوں تو ان کا کوئی خاص طریقہ ہو گا جس کا علم دینے والے کو کبھی نہ ہوا۔

۱۹۱۵ء سے اب تک ان کو یکساں حال میں دیکھ رہا ہوں۔ درمیان میں کیسے کیسے انقلاب آئے اور گذر گئے۔ اس دن سراج کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ اسی استغنا اور پامردی سے اسی جگہ پر جمے ہوئے ہیں جہاں میں نے ان کو، انہوں نے مجھ کو چھوڑا تھا جیسے اس دنیا کا تمام ناؤ نوش

یا نالہ و تفسیر ان کے لئے "بہ دردِ سر نمی ارزد ۔" کا مصداق ہو۔

شیخ جی پوسٹ مین

میں نے چھ سال مسلسل بورڈنگ ہاؤس میں گذارے اور صرف ایک پوسٹ مین سے سابقہ رہا۔ ان کا نام یاد نہیں رہا۔ ہم سب ان کو "شیخ جی" کہا کرتے تھے اور شیخ جی کا جیسا حلیہ ہو سکتا ہے بجنسہٖ ان کا تھا۔ ہمہ وقت خلجان میں مبتلا نظر آتے، چال ڈھال، جسم و جان، بات چیت سبھی سے جیسے غلط پتے پر کوئی رجسٹری، بیمہ، یا منی آڈر دے آئے ہوں اور سمجھ میں نہ آتا ہو کہ کیا کریں۔

ظاہر ہے کہ بڑی تعداد میں طلباء کے خطوط اور منی آڈر آتے ہوں گے شیخ جی ہر طالب علم سے آشنا تھے۔ صورت سے اتنے نہیں جتنے اس کی آواز سے، گھنٹہ بجا، کلاس ختم ہوئی سارے لڑکے کلاس روم سے نکل آئے۔ اس موقع پر فرض کر لیجئے۔ شیخ جی کا بھی گذر ہوا۔ لڑکوں نے گھیر لیا۔ سبھی کہہ رہے ہیں "شیخ جی میرا ہے۔" یعنی میرا کوئی خط یا منی آڈر ہے۔ اور شیخ جی بغیر کسی کو دیکھے صرف آواز پہچان کر کہتے جا رہے ہیں "آپ کا ہے" "یا آپ کا نہیں ہے۔" یہ دونوں فقرے اتنی جلد جلد اور اس درجہ بے اختیار ہو کر کہتے کہ اس زمانے میں تفریحاً ہم سب اس لہجے کی نقل کرنے لگے تھے۔ شیخ جی کا یہ کہہ دینا کہ ہے یا نہیں ہے۔ کبھی غلط نہیں ہوتا تھا۔ نئے لڑکوں کو کبھی کبھی یقین نہ آتا۔ اس لئے خطوں کا پلندہ دیکھنے پر اصرار کرتے اور شیخ جی کے قائل ہو جاتے۔

کھمانی پان والے

کھمانی تفریحاً تھے۔ ٹریجڈی تھے۔ بھید تھے،

ا۔ آشفتہ بیانی میری صفحہ ۱۷۶ - ۱۷۸

علامت تھے، تقدیر تھے، جانے کیا تھے، شاید یہ سب ایک ساتھ تھے۔ اتنے اور اس طرح کے بوڑھے کہ عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ چو نچال اتنے کہ نوجوان نہیں بچے کا دھوکا ہوتا تھا۔ بات زیادہ دیر تک نہیں کرپاتے۔ سپاہیوں کی طرح قواعد پریڈ کرنے لگتے اور معلوم نہیں کس زبان کے الفاظ میں پریڈ کے احکام نافذ کرتے۔ پان بیچتے تھے۔ لکڑی کی چھوٹی سی بھدی گاڑی تھی جس پر سرکی ڈال رکھی تھی۔ وہ بھی جگہ جگہ سے خستہ تمام دن رات گئے تک اسی گاڑی کو کھینچتے ڈھکیلتے بورڈنگ ہاؤسوں کا چکر لگاتے رہتے۔ پان کے سامان کے علاوہ اپنی زندگی کے لئے جن چیزوں کو ضروری سمجھتے تھے وہ سب اسی گاڑی میں رکھ لی تھی گویا گاڑی نہ تھی پہیئے پر ان کا مکان تھا۔

کانوں میں عجیب طرح کی آواز آنے لگتی جس سے معلوم ہوجاتا کہ آس پاس کہیں کھمانی آگئے ہیں۔ کسی طرح یہ پتا نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کیا صدا لگاتے تھے۔ واقعی کچھ الفاظ تھے یا صرف حلق میں پھنسی ہوئی یا فضا میں بھٹکی ہوئی کوئی مبہم آواز یا صرف ایک گونج، پان کیا بناتے تھے صرف لیپ پوت کر دیتے تھے۔ اس کا ساز و سامان گاڑی کے اندر ہوتا جو باہر سے بالکل نظر نہ آتا لیکن ان کا ہاتھ انہیں اجزا پر پڑتا جن کی ضرورت ہوتی۔

ترنگ میں ہوئے اور اکثر رہا کرتے تھے تو پان دے کر فوجی قاعدے کا سلام کر دیا۔ آپ کی بھی طبیعت گدگدائی تو کہہ دیا "کھمانی تمہاری قواعد دیکھنے کو جی چاہتا ہے"۔ کھمانی گاڑی کے اندر سے ڈنڈا نکال کر قواعد شروع کر دیتے۔ خود کمانڈ دیتے۔ خود ہی پریڈ کرتے۔ کیا کمانڈ دیتے تھے۔

نہ وہ جانتے تھے نہ ہم آپ سمجھ سکتے تھے۔ کسی نے فرمائش کر دی "کھمانی انگریزی ناچ دکھاؤ۔" کھمانی ڈنڈے کو میم صاحب قرار دے کر ناچنے لگتے۔ جی میں آیا تو ڈنڈا پھینک دیا اور دو چار پینترے ہندوستانی ناچ کے بھی دکھا دیئے۔ کھمانی بھولے بسرے یا عالم بے خبری میں محض ذرا دیر کے لئے اپنی بیوی کو یاد کرتے جسے وہ میم صاحب کہا کرتے تھے۔ ہم سب بھی تفریحاً میم صاحب ہی کہہ کر ان کی بیگم کا ذکر چھیڑتے۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے کھمانی کی زندگی میں کہیں کوئی بڑی بدبختی ہے جس کو وہ اپنی طرح طرح کی حرکتوں یا کرتبوں سے بھلانے کی کوشش کرتے ہوں۔ جیسے ایک سرد سنسان تنہائی میں اسیر ہوں جس سے رہائی نصیب نہ ہوتی ہو۔ کسی نے پان کے پیسے دے دیئے تو احسان نہیں۔ کھمانی کسی شغل میں ہوں کوئی طالب علم قواعد یا ناچ کی فرمائش کر دیتا تو سب کام چھوڑ کر دکھانے بتانے لگتے۔

کھمانی کسی کو پہچانتے نہ تھے۔ پان ہر ایک کو بے تکلف دے دیتے تھے کوئی دام دینا بھول جاتا یا اس وقت پیسے نہ ہوتے اور معذرت کر کے یا اس کے بغیر چلا جاتا تو ان کو خبر نہ ہوتی۔ اس کا جب جی چاہتا دام چکا دیتا۔ کھمانی یہ بھی نہ پوچھتے کہ دینے والا کون تھا۔ کب کے دام چاہیئے تھے یا کتنے چاہئیں تھے جیسے پان دے کر وہ سب کچھ بھول جاتے۔ اپنے کو بھی جیسے اس عالم میں پہنچ جاتے ہوں جہاں زمانہ خرام میں نہ ہو قیام میں ہو۔ کہیں ان کا ذکر آتا یا آواز آجاتی تو ایک طرح کی بشاشت کی لہر دوڑ جاتی۔ تھوڑی دیر کے لئے جیسے مصروفیت اور مکروہات ختم ہو جائیں۔ گویا کھمانی کا دور تھا۔ ان کا پان کھایا جائے گا اور ان سے جی بہلایا جائے گا۔

"کسی کو معلوم نہ تھا کہ کھانی کون تھے۔ کہاں سے آئے تھے اور ان کی سرگذشت کیا تھی؟ ایک دن معلوم ہوا کہ اس فضا میں گم ہو گئے جہاں کتنے دنوں سے ان کی صدا گم ہونے کے لئے سرگرداں تھی۔"

کُندن

کندن مر گیا اور گھنٹے بجتے رہے۔ کندن کالج کا گھنٹہ بجاتا تھا معلوم نہیں کب سے۔ کم و بیش ۳۰۔ ۳۵ سال سے اتنے دنوں سے اس پابندی سے کہ اس طرف خیال کا جانا بھی بند ہو گیا تھا کہ وہ مر جائے گا یا گھنٹہ بجانے سے باز آجائے گا۔

"طالب علمی کا زمانہ ختم کر کے اسٹاف میں آیا تو یہ گھنٹہ بجا رہا تھا۔ اسی کے گھنٹوں کے مطابق کام کرتے کرتے پوری مدت ملازمت ختم کی۔ یونیورسٹی سے رخصت ہوا تو اسے گھنٹے بجاتے چھوڑا۔ گھنٹے کی آواز روزمرہ کے اوقات میں اس طرح گھل مل گئی تھی جیسے وہ کہیں باہر سے نہیں میرے ہی اندر سے آرہی ہو۔ جیسے وہ وظائف جسمانی کے ان معمولات میں داخل ہو گئی ہو جن کا شعوری طور پر احساس نہیں ہوتا۔ کئی دن بعد کسی نے بتایا۔ کندن مر گیا۔ ایک دھچکا سا لگا۔ ارے کندن مر گیا۔ اتنے دنوں سے گھنٹے کی آواز آتی رہی اور حسب معمول یہی سمجھتا رہا کہ کندن بجا رہا ہے۔ بتائے بغیر کیوں نہ معلوم ہو گیا کہ کندن مر گیا۔ نادانستگی میں اس کی یاد کے ساتھ کیسا قصور رہا۔

"پھر وہی بات ذہن میں آئی جو ہمیشہ ہر ذہن میں آتی ہے کہ موت سے مخصوص افراد چاہے جس شدت سے متاثر ہوں۔ نظام فطرت میں اس سے زیادہ ناقابل التفات واقعہ دوسرا نہیں۔ اس سے فطرت کے نظام میں کوئی خلل پڑتا ہے نہ دنیا کے طور طریقوں میں فرق آتا ہے۔ اس احساس سے تسکین تو کیا ہوتی بے چارگی اور بے زاری کے احساس میں اضافہ ہو گیا۔

کیسے نہ کہوں کہ افراد کا متاثر نہ ہونا نظام فطرت کے متاثر ہونے نہ ہونے سے بڑا حادثہ ہے۔ انسان کی جس نہج پر ترکیب ہوئی ہے۔ اس میں تو افراد ہی کے تاثرات سب کچھ ہیں۔ باقی تمام شعبدہ ہائے طلسم بے سببی ۔"

"موت اور زیست کی گردش نے کتنوں کو بڑا کتنوں کو چھوٹا کتنوں کو یکساں کر دیا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے موت سے زیادہ ہم سطح کر دینے والی دوسری کوئی شے نہیں۔ اس ۳۰ - ۳۵ سال میں ہم سے قریب، ہم سے دور ہمارے لائے ہوئے کیسے کیسے انقلابات برپا ہوئے۔ نوجوانوں کی کتنی نسلیں اس ادارے سے نکلیں اور زندگی کے چھوٹے بڑے محاربوں میں فتح و شکست سے کس کس طرح دوچار ہوئیں یا ہیں۔ ان سب کو کیسے اور کہاں تک یاد میں سمیٹوں۔ یہ سب ہوتا رہا۔ لیکن کندن کا بجانا جوں کا توں رہا۔ جیسے اس کا گھنٹہ بجانا یونیورسٹی کے موجود اور معتبر ہونے کا اعلان تھا۔ لیکن ہوا وہی جو بالآخر ہو کر رہتا ہے۔ کندن مر گیا۔ تقدیر کے اس معمول میں فرق نہ آیا۔

ع زرندہم چو توئی یا زفسق ہم چو منی

اگر یہ ہے اور ہے بھی یہی تو یہ جنگ۔ نامساوی طاقتوں کی ہے۔ جس میں فتح ہمیشہ کمزوری کی مانی جائے گی۔"[1]

یونیورسٹی میں تقریبیں چھوٹے بڑے پیمانے پر ہوا کرتی ہیں نشستوں کے لئے میز کرسی کی فراہمی کا انتظام کندن کے سپرد ہوتا تھا۔ بڑے سے بڑے پیمانے پر جتنی جلدی اور جس خوبی سے وہ یہ سب انتظام کر دیتا اور

---

[1] ہم نفسان رفتہ صفحہ ۱۶۱ -

[1] ہم نفسان رفتہ صفحہ ۱۶۲ -

دیکھتے ہی دیکھتے سارا فرنیچر صحیح وسالم اپنی اپنی جگہ پر واپس پہنچا دیتا. وہ صرف اُسی کے بس کی بات تھی. چیخ و پکار، نہ دوڑ دھوپ، نہ تو تکار علی گڑھ میں ہر فن مولا نہیں تو ہر فن کے مولا مل جائیں گے جو اپنی اپنی وادی کے مسلمہ طور پر امام مانے جاتے ہیں اور کام کتنا ہی دشوار اور بڑا کیوں نہ ہو اس کو اس خوش اسلوبی سے اتنا جلد انجام دیں گے جیسے ان کے پاس جادو کی کوئی چھڑی ہو یا موکل قبضے میں ہو.

"آخر زمانے میں کندن نے اپنے لئے ایک اچھا گھر بنوانا شروع کر دیا تھا." "کالج کا نمک کھانے" کا ایک تصرف یہ بھی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص چاہے وہ منصب یا دولت کے اعتبار سے چھوٹا ہو یا بڑا۔ تقریب منانے تعلیم دلانے اور مکان بنانے کا منصوبہ بڑے ہی پیمانے پر باندھتا ہے. ستم یہ ہے کہ اپنا ہی نہیں دوسرے کا کام بھی اسی پیمانے پر کرنے، کرانے یا دیکھنے کو جی چاہتا ہے. اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے لیکن اب تک اس حرکت سے کسی کو باز آتے نہیں دیکھا گیا. کالج کا نمک کھانے کا ایک اور اثر بھی ہے. سب اثروں سے زیادہ کاری اور خطرناک. جو کندن کیا، وقت پر سبھی بھول جاتے ہیں یا خاطر میں نہیں لاتے. وہ یہ کہ جتنا بڑا منصوبہ ذہن میں آتا ہے اس کو پورا کرنے کے وسائل اتنے ہی محدود ہوتے ہیں. کندن بھی اسی تقدیر کا شکار ہوا.

کندن کے بارے میں جتنے خیالات ذہن میں آئے اور جس طرح کے جذبات امڈے، ان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس طرح کر سکتے ہیں کہ اس کی جن باتوں سے اور مدت العمر کی غیر منقطع وفا شعاری اور فرض شناسی سے جو تاثرات ایک نارمل شخص کے دل پر بے اختیار طاری ہو جاتے ہیں

ان کو روکا جا سکتا یا ان سے روگردانی کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں کی جا سکتی تو آج یا کل دنیا کا چاہے جیسا رنگ ہو کندن کی یاد تازہ رہے گی۔

○

گردے کا آپریشن اور اس کی تفصیل

رشید صاحب گردے کے مریض تھے اور یہ تکلیف ان کی عرصہ تک جاری رہی تو مجبوراً احباب اور اعزہ کے مشورہ پر وہ آپریشن کرانے پر آمادہ ہوئے۔ آپریشن کامیاب ہوا اور ان کا ایک گردہ ماؤف کر دیا گیا تھا۔ اس آپریشن کی داستان کو انہوں نے اپنے مزاحیہ انداز میں بڑے دل کش طور پر لکھا ہے۔ اسے پڑھ کر رشید صاحب کی ہمت اور انداز طبیعت کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مصائب اور تکالیف کو ہمیشہ بہت معمولی رنگ میں دیکھنے کے عادی تھے۔ اور کبھی اس سے پریشان نہیں ہوتے تھے۔ حقیقت کا سامنا کرنے کی ان میں ہمت تھی۔ من حیث معالج ڈاکٹر انصاری مرحوم کے وہ معتقد تھے اور جب کبھی موقع ملتا، ان کی فنی مہارت کی داد ضرور دیتے۔ رشید صاحب کی زندگی میں یہ آپریشن اس لحاظ سے ضرور اہمیت رکھتا ہے کہ اس کی وجہ سے ان کو بہت تکلیف اٹھانی پڑی تھی ورنہ یہ ایک معمولی واقعہ ہے لیکن چونکہ اس داستان کو ان کے طنز و مزاح کی چاشنی نے خوب سے خوب تر کر دیا ہے۔ اس لئے اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"کالج[1] کے عہد میں کرزن ہسپتال اور یونانی مطب میں طالب علموں کے علاج کا انتظام رہتا تھا۔ اس زمانے میں دوا تجویز کرنے میں جتنی توجہ

---

[1] آشفتہ بیانی میری صفحہ ۱۶۵ - ۱۶۶

صرف کی جاتی اتنی مرض تشخیص کرنے میں نہیں۔ میری یہ عادت شاید اس زمانے کی ہے جس میں ذاکر صاحب کے تصرف کو بھی بڑا دخل ہے کہ یونانی علاج میں اس پر اصرار کروں گا کہ طبیب جو مرض چاہے تجویز کرے۔ دوا میں اپنی تجویز کردہ استعمال کروں گا۔ اس کے بہت سے فوائد ہیں ایک یہ کہ طبیب کو مرض تشخیص کرنے اور دوا تجویز کرنے میں جتنی زحمت اٹھانی پڑتی ہے وہ مریض اور معالج میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس طریقے سے ایسے امراض کا بھی علاج یا انکشاف ہو جاتا ہے جس کی نہ مریض کو خبر تھی نہ معالج کو۔ تیسرے یہ کہ اس حادثے کی بھی تصدیق ہو جاتی تھی ع "میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا۔" یعنی مرض دور نہ ہوا نہ سہی۔ دوا تو مزیدار تھی۔ پھر یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ مریض اپنے پیدائشی یا جمہوری حق سے محروم نہیں ہوتا۔ یعنی آئینی یا حفاظتی حدود میں رہ کر اس کو اپنی عاقبت یا صحت بگاڑنے یا سدھارنے کا حق اور اختیار حاصل رہتا ہے۔

"میں ہمیشہ مریض رہا اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے اپنی تکلیف میں رجوع کرتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ میرا مرض معمولی مرض نہیں ہے اور اس کا انجام اچھا نہیں ہے۔ ایسی حالت میں جب ذہن کی فضا ایسی مٹیالی، نم ناک اور غلیظ ہو جاتی جس کو میں اس طرح چھو سکتا تھا جیسے گلی سڑی پھپھوندی کو۔ اس وقت میں ان کے مطب کا رُخ کرتا۔ انتظار میں اکثر زیادہ وقت صرف ہوتا اور میں ان کے انتظار کے کمرے میں بیٹھا

ل‍ہ گنج ہائے گراں مایہ صفحہ ۱۳-۱۶ -

فتح پوری کی دوکانوں، گذرنے والوں کی تگ ودو، گاڑیوں اور پھیری والوں کے شور و شغب دیکھتا اور سوچتا کہ یہ چہل پہل، یہ لہر لہر، یہ مشغولیت، یہ خلفشار زندگی ہے جس سے میں ہمیشہ کے لئے علیحدہ کر دیا جاؤں گا۔ زندگی ہی وہ کل ہے جو اپنے جزو سے مستغنی ہے تو مجھ پر ہراس، مایوسی اور اکثر بغاوت کا جذبہ طاری ہو جاتا اور میں زیادہ بے تابی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا منتظر ہوتا۔

"اتنے میں ڈاکٹر صاحب کی آمد کی خبر آئی . . . دیکھتے ہی مسکراتے اس طور پر کہ گھنی پلکوں کے نیچے سے ان کی آنکھیں مسکرانے لگتیں۔ کہتے بھئی تم کہاں؟ بڑے عرصہ تک غائب رہے۔ میں کہتا ڈاکٹر صاحب بڑی تکلیف ہے۔ پریشان ہوں۔ کچھ کرتے دھرتے نہیں بنتا۔ بولتے گھبراؤ نہیں۔ ابھی دیکھتا ہوں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ باتیں اس لب و لہجہ سے اور اس طرح ہنس ہنس کر اعتماد، اعتقاد اور دل ربائی کے ساتھ دوستی اور بزرگی کی شان سے کہتے کہ مجھے خود محسوس ہونے لگتا کہ میں ناحق پریشان ہوا۔ اس سے پہلے کیوں نہ آیا۔ خواہ مخواہ اتنے دنوں مصیبت و مایوسی میں کیوں مبتلا رہا۔

"ڈاکٹر انصاری سے رخصت ہو کر میں اپنے آپ کو بالکل تندرست سمجھنے لگتا۔ اگر مرض کی کچھ تکلیف بھی ہوتی تو سمجھتا کہ دوا استعمال کرنے کے بعد ہی جاتی رہے گی۔ چنانچہ میں مطب سے اترتے ہی فتح پوری اور چاندنی چوک کی چہل پہل اور ہما ہمی میں گم ہو جاتا۔ پھل والوں کے ہاں سے پھل خریدتا اور کسی ہوٹل میں جا کر کھانا کھاتا اور مدتوں پرہیز کرتے کرتے کھانے پینے کا جو لطف کھو چکا ہوتا اس کو بد پرہیزی سے از سر نو حاصل

کرتا اور زندگی خوشگوار اور خوش آئند معلوم ہونے لگتی۔

"میرے نزدیک ہر مرض کی کوئی نہ کوئی حد ہونی چاہیئے۔ بہ صورت دیگر مریض کو اختیار ہے کہ وہ حد سے گذر جائے جس طور پر ہمیشہ تندرست رہنا بھی غیر طبعی ہے۔ اسی طور پر ہمیشہ بیمار رہنا بھی بد مذاقی ہے۔ پھر چونکہ یہ دور ترقی و تہذیب کا ہے (یعنی تم چاہو کر سکو یا نہیں۔ تمہاری بیویاں جو چاہیں کر سکیں) میں نے گردہ صاحب کی متواتر اور مسلسل کئی ماہ تک تالیف قلوب کی لیکن جب دیکھا کہ میرے اغماض اور چشم پوشی کو یہ ایک روشن خیال تعلیم یافتہ بیوی کے مانند میری کمزوری پر محمول کرنے لگے ہیں تو پھر ایک رات جب کہ زلف شب گردہ تک پہنچ چکی تھی۔ ہم علیگڑھ سے کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنو کے لئے روانہ ہو گئے اور ارادہ کر لیا کہ اس کمبخت گردہ کو بالکل "مٹیا برج" بنا ڈالیں گے۔ بیوی بچوں سے کہہ دیا کہ حکیم عبداللطیف صاحب وائس پرنسپل طبیہ کالج علی گڑھ کا اصرار ہے وہ لکھنؤ خربزے کھلانے لئے جا رہے ہیں۔ تمہارے لئے بھی بھیجوں گا۔ غرض دوسرے دن دوپہر کے قریب لکھنؤ پہنچ گیا۔

میں نے کوشش کی تھی کہ کسی عزیز دوست یا دشمن کو میرے ارادہ عمل جراحی کی خبر نہ ہونے پائے لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ پردۂ تقدیر نہیں بلکہ پردۂ تحریر میں کیا ہے لکھنو میں ہمارے ایک دوست اور رفیق کار مل گئے۔ ایک روز ذرا دیر کے لئے ملاقات ہوئی تھی۔ تھوڑی سی گفتگو ہوئی اور پھر ہم دونوں رخصت ہو گئے۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ ہماری آمد اور ارادہ کی خبر لکھنؤ کے کسی روزنامہ میں موجود ہے۔ اب کیا تھا رانہ کا

لے مضامینِ رشید صفحہ ۲۹-۳۰-۳۶-

افشا ہوتا تھا کہ احباب وغیرہ و اعزہ "صف اندر صف قطار اندر قطار" چلے آرہے ہیں۔ خطوط اور تار ان کے علاوہ۔

اب میرا زیادہ وقت موت و حیات کے فلسفہ یا تندرستی و مرض کے نظریہ پر بحث کرنے میں صرف ہوتا تھا۔ کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کے ذہن یا تجربہ میں کوئی بات ایسی نہ آئی ہو جو میرے ارادے کے نامعقول یا نامسعود ہونے کے مقابلے میں نصِ قطعی کا حکم نہ رکھتی ہو۔ ایک صاحب نے کہا اس قسم کے عملِ جراحی سے عہدہ برآ ہوتے کسی کو نہیں دیکھا۔ فلاں شخص آپریشن کراتے ہی جاں بحق ہو گیا۔ میں نے کہا میرا ارادہ جاں بحق ہونے کا نہیں ہے یوں اس کو کیا کیجیے گا لوگوں کی شادیاں بھی ہو جاتی ہیں۔ مر بھی جاتے ہوں گے۔ پھر اس کو کیا کیجیے۔ میں ایسی زندگی کو موت سے زیادہ ہولناک سمجھتا ہوں جس میں انسان زندگی کے فرائض اور لذائذ دونوں سے محروم رہے۔ انسان اپنے بیوی بچوں، اعزا، و احباب کی نسبت سے زندگی کو ناچیز یا محبوب سمجھتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انہیں سے خاطر خواہ طور پر عہدہ برآ ہونا کامیاب اور کامراں زندگی کی دلیل ہے۔ میں بہ ذاتِ خود زندگی کو ایک ذمہ دارانہ تفریح سمجھنے کا عادی رہا ہوں اور ہر ایسی حالت یا واقعہ کو جلد سے جلد بھول جانے کا خوگر رہا ہوں۔ جو زندگی کے اس مفہوم کے منافی ہو لیکن ان دنوں مسلسل اور غیر شاعرانہ طور پر بیمار رہنے سے میری طبعی شگفتگی مضمحل ہونے لگی تھی اور یہی سبب ہے میں نے آخری اور قطعی فیصلہ کر لیا ہے۔ اب رہا یہ کہ میں جاں بر نہ ہو سکوں گا۔ بیوی بچوں پر کیا گذرے گی۔ یہ صورتِ حال بھی ایک سمجھدار شخص کے نزدیک ناقابلِ تسخیر نہ ہونا چاہیئے۔ ایک مجہول اور مریض شوہر یا باپ اپنے بیوی بچوں کے لئے ایک متوفی باپ یا شوہر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ بشرطیکہ وہ

اتنی دولت و ثروت کا مالک نہ ہو کہ وہ روزی کمانے یا نہ کمانے سے بے نیاز ہو۔ اور میری حالت ایسی نہیں ہے۔ بس میرے نزدیک لوگوں کی انتہائی گمراہی یہ ہے کہ وہ اپنے متعلقین کی صلاح و فلاح کا تنہا اپنے آپ ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو آج دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ یا شاید دنیا اور اس کا نقشہ دونوں ہی ناپید ہوتے۔ دنیا میں کافی مثالیں ایسی ملیں گی جس میں بیوہ اور یتیم کافی عافیت اور شہرت کے ساتھ درجات دے چکے ہیں۔ اس طور پر کافی مثالیں ایسی بھی ہیں جہاں شوہر اور باپ کی موجودگی میں بھی صرف محرومیاں حصے میں آئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ انسان کی کمزوری ہے اور اس کی بے بنیاد دہشتیں ہیں جن کے سبب سے اس نے اپنے مرنے کے عدم جواز میں یہ افسانے اور کمزور دلائل قائم کر لئے ہیں۔ مرنے اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر جانے کی مصیبت تو عام ہے۔ بہت کم گھرانے ایسے ہوں گے جہاں یہ ہولناک حادثے نہ پیش آئے ہوں گے۔ اگر ہمارے گھر یہ مصیبت پیش آنے والی ہے تو برا ماننے یا ضرورت سے زیادہ ماتم کرنے کے کیا معنیٰ۔ ایک ایسا سانحہ جو تمام دنیا اور تمام خاندانوں کے لئے عام ہے آخر میرے خاندان کے لئے کیوں نہ ہو۔ اصل یہ ہے کہ ہر شخص اور ہر خاندان کی کفیل خود دنیا اور اس کی بوالعجبیاں ہیں یا اگر ہمارے ناظرین زیادہ تعلیم یافتہ، روشن خیال نہ ہوں تو میں کہوں گا کہ اس میں تھوڑا بہت خدا کا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔ اور جب ہم خدا کے قائل ہیں تو اس کی واضح یا پُراسرار قدرتوں اور مصلحتوں کا بھی قائل ہونا پڑے گا۔

میرے ایک دوست، بزرگ اور استاد جو میرے خیال میں اس درجہ عزیز رکھتے ہیں جتنا شاید میں کوشش بھی کروں تو خود ان کو یا کسی دوسرے

کو عزیز نہیں رکھ سکتا جس حد تک وہ میرے لئے قربانی یا ایثار کر سکتے ہیں ان کے لئے نہیں کر سکتا اور نہ شاید آمادہ ہو سکتا ہوں۔ میرے اس ارادے کے موئد تھے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ ان کا عزم و استقلال محبت یا بشریت کی بنا پر میرے اس ارادے سے کبھی کبھی متاثر اور متزلزل ہو ہو جاتا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک موقع پر برسبیلِ تذکرہ ان سے عرض کیا کہ آپ دیکھتے ہیں مرض کی یہ آئے دن کی مصیبت کیسی تلخ ہے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے اس صورتِ حال کے ماتحت زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہ جاتا۔ آپ جانتے ہیں اب اس کا علاج صرف آپریشن رہ گیا ہے۔ رہا یہ کہ عمل جراحی کامیاب ہو گا یا نہیں تو یہ صورت اول فہوالمراد۔ بصورت دیگر دیکھنا یہ ہے کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک آخری انجام کا وقوف نہ ہو اس پر حکم لگانا بے محل اور غلط طریقۂ کار ہے۔۔۔۔

"میں قسمت کا قائل ہوں اور یہاں میں قسمت کے الٰہیاتی یا مذہبی مفہوم سے نہیں لغوی مفہوم سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک قسمت نام ہے صرف حصہ یا تقسیم کا۔ یعنی ہر شخص کو دنیا کی نعمتیں اور دنیا کی محرومیاں تقسیم کر دی گئی ہیں۔ مساوی اور غیر مساوی کا سوال نہیں ہے۔ کسی کو تندرستی، کسی کو دولت و قناعت، کسی کو ہمت و حیا، کسی کو زن و فرزند، کسی کو علم و فضل کسی کو قبولِ عام ارزانی کیا گیا ہے۔ اسی طرح سے محرومیاں اور نامرادیاں بھی حصے میں آئی ہیں۔ عام طور سے ہم کو جو نعمت حاصل ہوتی ہے اور کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کو کوئی نعمت حاصل نہ ہوتی ہو (اس کو تو نظر انداز کر دیتے ہیں، اور دوسروں کو جو نعمت حاصل ہے اس کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں حالانکہ دنیا کی مجموعی نعمتیں مجموعی طور پر کسی کو کبھی نصیب

نہیں ہوئیں اور نہ ہوں گی اور ـــــــــــــــــــــــــ

بالفرض نصیب ہوئیں تب بھی میرا خیال ہے آپ اس کو مطمئن نہ پائیں گے۔ زندگی کا مقصد بھی یہی ہے کہ فطرت کی طرف سے انسان کو جو نعمتیں عطا کی گئی ہوں ان پر قناعت کرے۔ ان سے جائز طور پر زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔

"اب آپ مجھے دیکھئے میری سوانح زندگی سے واقف ہیں۔ خدا نے علم کی دولت عطا فرمائی ہے۔ کھانے پینے سے خوش رکھا۔ جاں نثار احباب و اعزا دیئے۔ شہرت اور قبولِ عام ارزانی فرمایا۔ مجموعی طور پر یہ نعمتیں ایسی ہیں جن کے وجود پر ہر سمجھدار انسان کو شکر گذار ہونا چاہیئے۔ میرے استادِ محترم مولانا حاجی سید سلیمان اشرف صاحب حج کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ کتنوں نے آپ سے فرمائش کی تھی کہ خانہ کعبہ میں پہنچ کر ان کے مختلف اُمور دینی یا دنیاوی کے بارے میں دعا فرمائیے گا۔ مولانا محترم کے پاس میں نے ایک عریضہ بھیجا تھا اور استدعا کی تھی کہ حریم قدس میں میری طرف سے یہ عرض کر دیا جائے کہ اے خدا تیرا ایک ناچیز بندہ تیری دی ہوئی نعمتوں کا شکر گذار ہے۔ وہ کچھ مانگتا نہیں۔ اس کا صرف سجدۂ شکر قبول فرمایا جائے۔"

"آپ یقین فرمائیں میں اپنی زندگی کو کامیاب سمجھتا ہوں۔ اگر اب پیامِ رحلت آگیا ہے تو گھبرانا بے معنیٰ ہے۔ اب تک خدا نے ہر قسم کی خجالت و مصیبت سے محفوظ رکھا ہے معلوم نہیں آئندہ کیا پیش آئے۔ اس وقت تک میری زندگی جیسی کامیاب اور مسرور گذری ہے وہ غالباً میرے بعد میرے احباب، اعزاء اور ملک کے لئے ایک سرمایۂ نیک ہو گی۔ اس کے علاوہ اور کیا چاہیئے۔ دوسری طرف اگر اس مرض کو میری زندگی کا دردناک پہلو تصوّر

فرمائیے تو اس حقیقت کو بھی مدِ نظر رکھیئے کہ میں اس مرض کی شدّت اور سختی کے باوجود ہمیشہ غیر معمولی طور پر ہمیشہ شگفتہ اور بشاش رہا ہوں ۔ اور یہی نہیں بلکہ جو لوگ مجھ سے وابستہ رہے ہیں ان کو بھی شگفتہ اور بشاش رکھ سکا ہوں۔ پھر اس مرض کو عذابِ جان یا میری زندگی کی محرومی کیوں تصور فرمائیے ۔ اچھا ان سب کو جانے دیجئے۔ وہ لوگ جو مرض اور ازالہ مرض کے بارے میں ماہرین فن کا درجہ رکھتے ہیں ان کی رائے ہے کہ آپریشن ہونا چاہیئے اس لئے جہاں تک دنیاوی تدابیر میری جان بچانے اور مرض کے دفعیہ کے لئے کی جا سکتی ہیں وہ کی جائیں گی ۔ بہت ممکن ہے کہ جاں بر ہو جاؤں پھر اس وقت کی خوشی اور شادمانی کا کون اندازہ کر سکتا ہے بالآخر ہم یورپین وارڈ کے ایک کمرے میں پہنچ گئے ع وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا ۔

"جس[1] روز آپریشن ہونے والا تھا۔ اس کی صبح کو ہر آنے والے نے بشارت دی کہ آج آپریشن ہو گا۔ ڈاکٹروں نے دلاسا دیا۔ نرسوں نے پوچھا ڈرتے تو نہیں ۔ بعض صاحبوں نے کہا "شاباش" اور کسی نے صرف افسوس پر اکتفا کیا۔ اعزہ پریشان و افسردہ تھے ۔ دوستوں پر یاس طاری تھا۔ ڈاکٹر اور نرسیں مستعد اور آمادۂ کار نظر آتی تھیں ۔ مجھے نوٹس دیا گیا کہ دس منٹ کے اندر تیار ہو جاؤ۔ میں نے وضو کیا۔ دو رکعت نفل ادا کی اور دعا مانگی ۔ خدایا تو جو کچھ کر رہا ہے وہ بالکل صحیح اور درست ہے ۔ اب تک تو نے مجھ پر جو احسان و کرم کیا ہے تو علیم ہے میں کتنا شکر گذار ہوں ۔ ایک تمنا یہ البتہ ہے کہ اگر یہ آخری وقت ہے تو میری یاد کو مجھ سے محبت کرنے والوں کے لئے آسان کر دے ۔ زندگی میں میں نے تجھے اکثر بھلا دیا ہے اس کے گواہ

---

[1] مضامینِ رشید صفحہ ۴۲۔

بہت ملیں گے۔ اس وقت صرف تجھے یاد کر رہا ہوں اس کا گواہ صرف تو ہے۔

اس کے بعد ایک ڈاکٹر نے آکر مارفیا کا انجکشن دیا اور دو خدمت گاروں نے بیماروں کی کرسی پر بٹھا کر آپریشن تھیٹر پہنچا دیا۔

کرسی سے اتر کر آپریشن تھیٹر میں داخل ہوا جو میز بتائی گئی اس پر لیٹ گیا۔ سرہانے سے ایک ڈاکٹر نے کلوروفارم دینا شروع کیا۔ میں نے سوچا دیکھوں کلوروفارم کا اثر کس طور پر ہوتا ہے۔ اس لئے یہ ارادہ کر لیا کہ بے ہوش ہوتے میں عجلت سے کام نہ لوں بلکہ کلوروفارم کے اثر کی مدافعت کروں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً تین چار منٹ تک کلوروفارم دیا گیا اور دماغ پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ البتہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز حلق میں رہ رہ کر اٹکتی اور سوزش پیدا کرتی ہے اس لئے میں نے دو ایک دفعہ سر کو ایک طرف جھٹک بھی دیا۔ لیکن پھر میں نے خیال کیا کہ یہ تجربہ پُر لطف یا دلچسپ نہیں ہے اور مجھے کلوروفارم کا اثر قبول کر لینا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے دماغ کو آزاد چھوڑ دیا اور ایک ہی سیکنڈ میں یہ معلوم ہوا کہ گویا دماغ دھنی ہوئی روئی کی مانند تھا اور اس میں آگ لگا دی گئی تھی اور پھر مجھے خبر نہیں کیا ہوا۔

"آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو کمرے میں پایا۔ تکیوں کے سہارے تقریباً ۱۲۰ درجے کے زاویے پر لٹا دیا گیا تھا۔ نہ آپریشن کی کوئی تکلیف تھی اور نہ کلوروفارم کا کوئی اثر۔ . . . رات ہوئی اور تکلیف میں اضافہ ہوا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے گردے کے مضافات کی رگیں آتش سیال بن گئی ہیں اور دردِ گردہ عود کر آیا ہے۔ یہ تکلیف ناقابلِ برداشت تھی۔ یہاں تک کہ ایک ڈاکٹر اور نرس نے آکر مارفیا کا انجکشن دے دیا۔ اور پھر صبح تک غافل رہا۔ یہ حالت صرف شب میں تقریباً تین چار دن تک رہی اور ایک دو روز

مارفیا کا انجکشن لیتا رہا۔ لیکن ڈاکٹر نے بتایا کہ سونے کے لئے منشّی اور منوّم چیزوں کا عادی ہونا مضر ہے اس لئے اس کی کوشش کرو کہ خود بخود نیند آجائے۔ چنانچہ اس کے بعد پھر نیند لانے کے لئے نہ کوئی انجکشن دیا گیا نہ کوئی دوا استعمال کی گئی۔ دو تین راتیں نہایت تکلیف سے گذریں اور ان تین چار دن تک میں نے آہ و بکا اور اظہارِ مایوسی و واماندگی میں کچھ بد مذاقی کا بھی ثبوت دیا کہ تیمار دار پریشان ہو گئے اور نرسوں اور ڈاکٹروں نے کبھی کبھی کسی قدر دُرشت لہجہ میں میری خبر بھی لی۔ چار پانچ دن کے بعد ہر تکلیف میں تخفیف شروع ہو گئی۔ غالباً ساتویں دن ٹانکے علیحدہ کر دیئے گئے اور تقریباً کوئی تکلیف دہ شکایت باقی نہیں رہی۔ میں خود بہ خود اٹھنے بیٹھنے لگا۔ تھوڑا بہت کمرے میں ٹہلنے بھی لگا۔

"اب مجھ کو اجازت دے دی گئی تھی کہ "کھاؤ پیو اور ٹہلو"۔ دوستوں اور اعزا نے کھانے پینے کی چیزیں خوب خوب بھیجیں اور میں نے بھی انتہائی انتقامی جذبے کے ساتھ ان کی پذیرائی کی۔ بیماری اور پرہیز میرے لئے لازم و ملزوم رہے لیکن کوئی سلیم المذاق انسان ہندوستانی علاج اور پرہیز سے عرصے تک ہم آہنگ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے تھوڑے سے غور و فکر کے بعد میں ہمیشہ دوا اور پرہیز میں ایک حدِ اوسط یا مفاہمہ قائم کر لیا کرتا تھا۔ مثلاً ایک حکیم صاحب نے بتایا کہ پیٹھے کو کچل کر گردہ پر ضماد کیا جائے اور اس کا عرق پی لیا جائے۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا اور اس پر کاربند بھی رہا کہ پیٹھے کی مٹھائی براہ راست کھائی جا سکتی ہے۔

"میرے نزدیک ہسپتال سے زیادہ تکلیف دہ کوئی مقام نہیں ہوگا۔ اس اعتبار سے نہیں کہ وہاں انسان کو رہنے سہنے کی کوئی تکلیف ہوتی

ہے بلکہ اس بنا پر کہ یہاں ہر ہر قدم پر ہر سمت اور ساری فضا میں سوا افسردگی درد و شیون کے نہ کچھ نظر آتا ہے اور نہ کچھ اور محسوس ہوتا ہے۔ درماندہ مریض اور حزیں تیمار داروں کے تکلیف دہ منظر کو تندرست ڈاکٹر اور غالباً تندرست تر نرسوں کی مستعدی اور کبک خرامی اور زیادہ وحشت انگیز یا افسردہ کن بنا دیتی ہے۔ صفائی اور ستھرا پن میرے نزدیک بہترین چیزیں ہیں لیکن ہسپتال اور جیل خانہ کی صفائی اور ستھرا پن میرے لئے اکثر وحشت انگیز ہوتا ہے۔

رشید صاحب شاعر نہ تھے لیکن وہ نہ صرف سخن فہم تھے بلکہ اُردو شاعری اور شعرا کے بارے میں ایک خاص نظریہ بھی رکھتے تھے۔ وہ غزل کو شاعری کی آبرو سمجھتے تھے لیکن اس میں کچھ ترمیم و تجدید چاہتے تھے۔ شعراء کی بعض باتوں اور حرکتوں کو ناپسند کرتے تھے اور یورپی ممالک کے شعرا کی طرح ان میں بھی وہی وقار، رکھ رکھاؤ دیکھنا چاہتے تھے۔ اپنے معاصر شعراء میں وہ اقبالؔ کے علاوہ اصغرؔ گونڈوی، حسرتؔ موہانی، جگرؔ اور فانیؔ کو بہت پسند کرتے تھے اور ان سے مراسم اور تعلقات بھی ان کے گہرے اور دوستانہ تھے۔ طنز و مزاح کا افادی پہلو یہ ہے کہ وہ سماج، ادب اور معاشرہ میں صحت مندانہ تبدیلی پیدا کر دے۔ اکبر الٰہ آبادی نے اپنے اشعار کے ذریعے اور پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنی نثر کے ذریعہ اس کا پورا حق ادا کیا ہے اپنے مختلف مضامین میں انہوں نے وقتاً فوقتاً شاعری اور شعراء پر اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے۔ جسے طنز و مزاح کی چاشنی اور ان کے مخصوص اندازِ تحریر نے بہت پُر کشش اور سحر آگیں بنا دیا ہے۔

کچھ اردو شاعری اور شعرا کے بارے میں

"ہر عقلمند شخص کے لئے دو حماقتیں ضروری ہیں۔ ایک شادی اور دوسری شاعری۔ شادی اضطراری ہے اس لئے اس سے مفر نہ ہوا۔ شاعری اختیاری تھی اس لئے اس کی کوشش کی مگر بہ قول آتش جب موصوف جوان تھے یا بقول فانیؔ "حب ممدوح کے مرجانے کا زمانہ تھا۔" بہ ہزار دقت اور اس میں غالباً کچھ سرقہ اور اتنا ہی توارد بھی شامل تھا، دو مصرعے کھڑے کئے لیکن قبل مسیح اڈیشن کے استاد نے بتایا کہ ایک مصرعہ تو موزوں نہیں ہے اور دوسرا بے معنیٰ ہے۔ میں نے جی کڑا کر کے دریافت کیا کہ اگر دونوں ملا دیئے جائیں تو کچھ کام کی بات نکل آئے گی؟ انہوں نے کہا دو مہمل مل کر ایک معقول کب ہوتا ہے۔ میں نے ذرا ڈھیٹ ہو کر کہا۔ آخر انگریزی میں "بلینک ورس" بھی تو مروج ہے۔ کہنے لگے اُردو میں زٹل قافیہ بھی تو ہے۔

بہر حال موصوف نے اس کے بعد ہی دنیا سے رحلت کی۔ میں نے بھی فرطِ عقیدت سے اپنے دونوں مصرعے ان کے لوحِ مزار پر ثبت کرا دینے چاہے لیکن ادھر قبہ جات کے مسائل ایسے پیش آئے کہ دوستوں نے مشورہ دیا کہ اس دورِ فتنہ میں اس کا ارادہ کیا گیا تو مرحوم خاکسار، پسماندہ، اور باقیاتِ صالحات یہ دو مصرعے کسی کی خیر نہیں۔ مجبوراً ان کو بہ حفاظت تمام مقفل کر دیا تھا۔ سنا ہے بعض بے فکروں نے ان کو اڑا لیا ہے اور اب ان ہی دو مصرعوں کی دہائی مچ رہی ہے۔

---

[1] مقدمہ دیوانِ فانیؔ باب دوم صفحہ ۷۔

اس "اقرار صالح" کے بعد ناظرین اطلاع پائیں کہ میں اُن لوگوں میں ہوں جن کو موزوں اشعار بھی اس وقت تک یاد نہیں ہوتے جب تک انہیں ناموزوں نہ بنالیا جائے یعنی مجھے اشعار یاد نہیں رہتے اور جو یاد آتے ہیں وہ شعر نہیں صرف سہل ممتنع ہو کر رہ جاتے ہیں. کبھی سہل زیادہ، ممتنع کم، اکثر ممتنع زیادہ اور سہل بالکل نہیں. بایں ہمہ اچھے اشعار کا مجھ پر وہی اثر ہوتا ہے جو بچپن میں ہوتا تھا. اچھا شعر ذہن میں آیا نہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے معلوم نہیں کیا چیز تصورات کو کہاں کہاں لئے پھرتی ہے. وہی افسانہ و افسوں، وہی روشنی و تاریکی، لذت و اذیت، خوف و امید جو بچپن میں پیدا ہوتے تھے. اب بھی بیدار ہو جاتے ہیں. جہاں چاہتے ہیں لئے پھرتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں چھوڑ دیتے ہیں.

"اچھا شعر مجھ پر کچھ ایسا ہی اثر کرتا ہے جیسے اچھا کام کرنے سے خوشی ہوتی ہے. مطلب یہ ہے کہ ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ مجھ پر شعر کا کیا اثر ہوتا ہے. پر جو میں نے بتایا ہے وہ محض مثال کے طور پر ہے. اور مثال پر مجھے بھروسہ نہیں ہوتا کیونکہ دنیا میں سارا جھگڑا اسی مثال کا سہارا لینے سے پیدا ہوا ہے.

بہ طیب خاطر میں کسی شاعر سے شعر سنانے کی فرمائش نہیں کرتا اور اس بات سے اور زیادہ بدحظ ہوتا ہوں کہ خود شاعر بے تکلف ہو کر یا یہ ادبی اشتعال جس کا مرتکب بھی اکثر وہ خود ہوتا ہے شعر سنانے لگے. اسے آپ میری بدتمیزی پر محمول کریں یا شاعر کی یا دونوں کی. کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا.

"بات یہ ہے کہ بعض صوری یا معنوی اعتبار سے (صوری زیادہ معنوی

---

۱ گنج ہائے گراں مایہ صفحہ ۲۳۶

برائے نام)، شعر سننے اور داد دینے کے لئے بالعموم میرا انتخاب کیا جاتا ہے اور یہاں یہ حال ہے کہ پورا مصرعہ درکنار اس کا جُز تک اٹھانے سے ڈرتا ہوں کہ کہیں الفاظ یا اعراب وغیرہ کا الٹ پھیر نہ ہو جائے۔ جب تک شاعر دوسرا مصرعہ پڑھتا ہے اور اکثر بار بار اور دیر تک پڑھتا رہتا ہے۔ پہلا بھول چکا ہوتا ہوں۔ اس لئے پورے شعر کی داد دینے کے لئے طرح طرح کے سامعین کا منہ تکنا پڑتا ہے اور جلد سے جلد فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ ان میں کون ملوے مانڈے کی غرض سے آیا ہے، کون میزبان کو ایصال ثواب کرنا چاہتا ہے۔ کون شاعر کو ضرب شدید یا خفیف پہنچانے کا تہیہ کر رہا ہے اور کون مجھ کو محفل سے باہر نکلنے کا چیلنج دے رہا ہے۔ اس کے بعد کہیں میرا منہ اس قابل ہوتا ہے کہ شاعر کو دکھا سکوں۔ دوسری اور سب سے بڑی آزمائش میرے لئے یہ ہوتی ہے کہ کبھی کبھی میں شعر سے متاثر ایک طرح ہوتا ہوں لیکن داد دوسری طرح دینی پڑتی ہے۔ ساتھ ہی ڈرتا بھی رہتا ہوں کہ اس کشمکش میں کہیں مقدم موئخر نہ ہو جائے۔ چنانچہ جہاں کہیں اس کا خطرہ ہوتا ہے کہ شاعر اور اس کے کلام دونوں کی کرامات پر سب سے پہلے مجھے ایمان لانا پڑے گا اور اعلان بھی کرنا پڑے گا۔ میں داد دینے والا ساتھ لے جاتا ہوں جس کی مجھے خاصی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ داد دینے والے سے یہ طے رہتا ہے کہ وہ اس طرح داد دے کہ اگر میں دینے لگوں تو کوئی سن نہ پائے۔ یا دینے والا ہوں تو ہمت نہ پڑے۔[۱]

"شاعری اور شاعر دونوں کی بڑائی اس میں ہے کہ کسی جذبے، فکر یا خیال کو مرتفع کئے بغیر یہ پیش کیا جائے۔ بعض شاعر ہر طرح کے جذبات و

۱؎ ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۲۳۰

خیالات کو جوں کا توں پیش کر دینا شاعری کا تقاضا سمجھتے ہیں یہ ان کی بھول یا بدنیتی ہے۔ انسان[1] کی ترقی کا معیار یہ ہے کہ اس نے اپنے جذبات یا میلانات کو اپنے اقوال و افعال میں منتقل کرنے سے پہلے کہاں تک جانچا اور پرکھا، اور ان کی تراش و خراش اور تہذیب و تربیت میں کہاں تک کوشش کی اور کامیاب ہوا۔ اس طور پر دل میں مختلف قسم کے خیالات آتے ہیں لیکن ان کے ظاہر کرنے کا جواز صرف یہ نہیں ہے کہ وہ ذہن و دماغ میں پیدا ہوئے بلکہ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ کب، کسی طور پر اور کتنی کمی بیشی کے ساتھ ظاہر کئے جائیں کہ حقِ ترجمانی بھی ادا ہو جائے اور بد مذاقی کا الزام بھی عائد نہ ہو۔

"آج کل کے لکھنے والے خیالات کے پیدا ہونے، سوچنے اور ان کے اظہار میں کوئی وقفہ دینا پسند نہیں کرتے اور یہی ان کی اور اُردو ادب کی محرومی ہے۔ خیالات کی آفرینش اور ان کے قلم بند کئے جانے کے درمیان ایک وقفہ ہوتا ہے جس میں خود نفسِ خیال کے ترک و قبول اور اس کے طریقۂ اظہار پر غور کیا جاتا ہے۔ یہی وہ ساعت ہوتی ہے جس کو نظر انداز کرنے یا نہ کرنے سے لکھنے والا ہمیشہ کے لئے بدنام یا نیک نام ہو جاتا ہے۔ رہ نوردانِ ادب کے لئے یہی منزل عالم برزخ ہے جس سے مفر نہیں۔

ہمارے[2] بعض شعراء اور افسانہ نگار ایسے ہیں جن کی فنی چابک دستی میں شبہ نہیں لیکن وہ اپنے جذبات و واردات کو ظاہر کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیتے اور اس کو اپنی خامی نہیں شاعری کا تقاضا قرار دیتے ہیں۔ شہوت، غصہ، نفرت، خود نمائی کے جذبات بڑے منہ زور ہوتے ہیں

---

[1] مقدمہ دیوان فانی باب اول صفحہ ۲۴

[2] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۲۳۱۔

اور کم و بیش ہر انسان میں ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی غلط نہیں ہے کہ حیوان اور انسان میں فرق بھی ہے کہ حیوان ان پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ لیکن انسان ان کو بس ہی میں نہیں رکھتا بلکہ ان کو بہتر مقاصد اور بہتر شکل میں ڈھال لیتا ہے۔ وہ محسوس تو حیوان ہی کی طرح کرتا ہے لیکن اظہار انسان کی مانند کرتا ہے جو محسوس کرے، اسی کو ظاہر کرے قرین فطرت یقیناً ہے۔ قرین انسانیت نہیں ہے۔ اپنی خامی کو شاعری کا تقاضا سمجھنا نالائقی کی علامت ہے۔ انسان کا انا الحق کہنا ایسا غلط نہیں ہے۔ تلاشِ معرفت میں بعض فقرا یا صوفیا پر یہ واردات طاری ہوئی ہیں۔ لیکن ان واردات اور ان کے اظہار کو دلیلِ کم نظری و کم ظرفی قرار دے کر کہنے والے کو قتل کر دیا گیا ہے۔

سوا الہام کے جو خدا کی طرف سے صرف اس کے رسول پر نازل ہوتا ہے اور رسول اس کو بجنسہٖ امت کو پہنچا دیتا ہے کوئی ایسا خیال نہیں ہے جو شاعر کے دل میں آتا ہے اور وہ اس میں حسب ضرورت تصرف کئے بغیر ہم تک پہنچا دیتا ہو۔ یہ تمام تر شاعر کے ذوق اور ظرف پر منحصر ہے کہ وہ اس خیال کو کس مقصد سے کس شکل میں ہم تک پہنچاتا ہے۔ اگر وہ سرشت کا اچھا، فن سے واقف، زبان کا رمز شناس ہے۔ کہنے کا سلیقہ رکھتا ہے اور صحیح موقع و محل کو پہچانتا ہے تو اس کی بات مؤثر، مفید اور دیرپا ہوگی۔ اگر اس میں یہ صفات نہیں ہیں تو یہ شاعری نہیں کچھ اور ہوگی جس کو آپ شاعر کی نارسائی یا نالائقی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ شاعر، ڈاک خانہ، تار گھر ریڈیو نہیں ہوتا جو صرف خبر رسانی کا کام انجام دیتے ہیں۔ وہ فن کار اور معلم کی حیثیت سے حسن و صداقت کا داعی ہوتا ہے۔

"میں[1] نے بعض مستند اور عمر رسیدہ شعراء کو دیکھا ہے جو دوسرے شاعر کی برائی بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مشاعرہ میں شاعر اپنا کلام سنا رہا ہے اور یہ بیٹھے اس پر بازاری فقرے چست کر رہے ہیں اور آس پاس کے نالائقوں سے اپنی خفیف الحرکتی کی داد لیتے جا رہے ہیں۔ اس طرح کی بے ہودگی کسی اور میں ہو تو ہو شاعر میں ہرگز نہیں ہونی چاہیئے۔ اس طرح کی حرکت شاعر ہی نہیں کرتے وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو شعر و ادب کے پارکھ سمجھے جاتے ہیں اور جنہوں نے عمر کا بیشتر حصہ شعر و ادب کی خدمت میں گذارا ہے۔ بس یہ گوارا نہیں کہ ان کے ہوتے دوسرا کیوں؟ بعض اشعار، بعض شعراء اور بعض مواقع ضرور ایسے ہوتے ہیں جب پھبتی یا فقرے بے اختیاراً زبان پر آجاتے ہیں۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ یہ فقرے اور پھبتی کبھی کبھی وہ مزا دے جاتے ہیں جو اچھے اچھے اشعار نہیں دے پاتے لیکن اس طرح کے فقرے اور پھبتی کہنے کا حق مشاعرہ میں سامعین کو تو حاصل ہے خود شعراء کو نہیں۔

"معتبر[2] شاعر وہ ہے جو تمام علوم "سینہ و سفینہ" کے اسرار و رموز سے کماحقہ' واقف ہو یا نہ ہو اس سے آشنا ہو کہ فلاں خیال، جذبہ، یا فکر پر کسی علم کا عمل مناسبِ حال ہوگا۔ مثلاً کسی خاص خیال کو فنونِ لطیفہ، فلسفہ، تصوف اخلاقیات، مذہبیات، کیمیا، طبیعات وغیرہ میں سے کسی علم و فن یا علوم و فنون کے رموز و عائت کی رو سے سلجھا کر توانائی دے کر اور سنوار کر معین

---

[1] نقوش شخصیات نمبر حصہ اول صفحہ ۳۲۰۔

[2] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۲۳۳۔

تک پہنچایا جائے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ مفید و مؤثر ہو۔ یہاں اس سے یہ مراد نہیں کہ ہر شاعر علم و فن سے واقف ہو (سب سے زیادہ تو اسے اپنے فرض اور فن سے واقف ہونا چاہیئے) کہنا صرف اتنا ہے کہ جو علوم انسان کو فطرت کا راز سمجھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں اپنے اپنے طور پر مدد پہنچاتے ہوں۔ شاعر کو ان کا علم ہونا چاہیئے۔ اس کو شاعر کے ان علوم پر قدرت رکھنے سے تعبیر نہیں کریں گے نہ اس کا مطالبہ کریں گے۔ بلکہ اسے ان علوم پر اس کا شاعرانہ تصرف قرار دیں گے۔

"غزل[1] جتنی بدنام ہے اتنی ہی مجھے عزیز ہے۔ شاعری کا ذکر آتے ہی میرا ذہن غزل کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ غزل کو میں اُردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں۔ غزل کی اہمیت کا انحصار اس پر نہیں ہے کہ کبھی اس میں عشق و شباب کی باتیں کی جاتی تھیں یا اس کے وسیلے سے عورتوں سے گفتگو کی گئی یا کی جاتی ہے۔ اس کا احترام اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس سے گفتگو کرنی آجاتی ہے . . . . . . شاعری دنیا کی مادری زبان ہے۔ اس لئے شاعری میں مخصوص ذہن، زندگی اور زمانہ کی ترجمانی اور تلاش ضروری بات ہو تو ہو آخری بات نہیں ہے۔ البتہ ایسی شاعری میں اعلیٰ انسانی اور فنی قدروں کا پایا جانا ضروری ہے۔ اور میرے نزدیک اعلیٰ انسانی قدریں وہ ہیں جو زندگی اور کائنات کے بامراد اور برگزیدہ ہونے پر دلالت کرتی ہوں۔ ادنیٰ، اچھی یا اعلیٰ شاعری کا دار و مدار اس پر ہے کہ شاعر کس سطح سے شاعری کا حق ادا کر رہا ہے۔ زندگی کی آنی و فانی لذت والم سے رشتہ جوڑتا ہے یا زندگی اور فن کی اعلیٰ قدروں

---

[1] جدید غزل۔ نگار کراچی سالنامہ ۱۹۶۵ء صہ ۱۰۲۔

کو جانتا اور کائنات کی عظمت کو پہچانتا ہے۔ شاعری فنون لطیفہ میں ہے لیکن میں صرف ان فنونِ لطیفہ پر ایمان رکھتا ہوں جو فنونِ عظیمہ کا درجہ رکھتے ہوں۔

"شاعر برا ہے، اچھا ہے، معمولی ہے، گھٹیا ہے ان سب کا دار و مدار اس پر ہے کہ اس نے اپنے تحت شعور کا اظہار کس طور پر، کس سطح سے اور کس نیت سے کیا۔ شاعری خوب کو خوب تر بناتے رہنے کا مشن یا منصب ہے اور کوئی شاعر اس منصب کا اہل نہیں اگر وہ عظیم سے واقف ہو اور حقیر پر اکتفا کرلے۔

"شاعری میں حسنِ محض کا میں قائل نہیں۔ میں سرے سے "محض" کا قائل نہیں ہوں۔ میں حسنِ خیال اور حسن عمل کو بھی ایک دوسرے سے علیحدہ دیکھنے سے معذور ہوں۔ معقول شخص نامعقول شخص، یا نامعقول شخص، معقول شخص کیسے ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کوئی ہوتا ہو لیکن نہ وہ میرے ذہن میں آتا ہے نہ میرے دسترخوان پر آنے پائے گا۔

حسنِ خیال اور حسنِ اظہار کی کارفرمائی شاعری نہیں موتی، ہر ذہنی مشغلے میں ملتی ہے۔ میں ریاضی، فلسفہ، سائنس وغیرہ کا طالب علم کبھی نہیں رہا لیکن کبھی کبھی تفریحاً ان کے بعض مستند مصنفین کا سرسری مطالعہ کیا ہے جہاں کہیں بات سمجھ میں آگئی ہے تو ان کے بات کہنے اور پیش کرنے کے انداز میں اُتنا ہی لطف آیا ہے اور بصیرت نصیب ہوئی جتنا غالبؔ اور اقبالؔ کی نظموں میں۔

"میں کچھ اس کا قائل ہوں کہ شاعر ادیب یا آرٹسٹ نہ زمانے کے پابند ہوتے ہیں نہ زندگی کے نہ نقاد کے۔ زمانہ، زندگی اور نقاد تینوں شاعر

---

[1] جدید غزل نگار کراچی۔ سالنامہ ۱۹۶۵ء صفحہ ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۱۳، ۱۲۰۔

ادیب اور آرٹسٹ کے منتظر ہوتے ہیں۔ زمانہ ان کا پابند ہوتا ہے۔ وہ زمانے کے پابند نہیں ہوتے۔ اگر شاعر اپنے ماحول کا پابند یا نقاد کی حکم برداری پر مجبور ہو تو شاعری ادب اور زندگی سے تازہ کاری جو عین زندگی ہے جاتی رہے۔
میں شاعری میں تجربات کا قائل ہوں لیکن تجربات میں شاعری کا نہیں۔ میں تجربہ کو تجربہ ہی سمجھتا ہوں۔ الہام نہیں سمجھتا۔ فن اور زندگی دونوں میں جان تجربہ ہی سے آتی ہے جو تجربے سے بھاگے یا تجربہ میں مقید ہو گئے ان کا مستقبل کوئی نہیں۔ مستقبل کا بذات خود میں کچھ زیادہ شیدائی نہیں ہوں۔ میں تو ماضی کے مستقبل اور مستقبل کے ماضی کا قائل ہوں۔ میں حال کو ماضی اور مستقبل دونوں سے زیادہ اہم سمجھتا ہوں۔ ماضی کا اسیر اور مستقبل کا منتظر میں نے ایسوں کو پایا جن کا ماضی اور مستقبل دونوں مشکوک ہوتا ہے۔

بڑی شاعری میں منجملہ اور باتوں کے دو نہایت ضروری ہیں۔ ایک تو اس کا رشتہ کسی اعلیٰ اور عظیم حقیقت سے اور دوسرے اس کا ربط کسی اعلیٰ اور عظیم شخص اور شخصیت سے ہو۔ علم تلاش حقیقت ہے۔ شاعری جستجوئے انسانیت۔ بڑی سے بڑی کوئی حقیقت ایسی نہیں ہے جو انسان کے لئے نہ ہو . . . ذاتی طور پر میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ بڑی شاعری میں بڑے انسان کا ہونا لازمی ہے اور بڑا انسان سب سے بڑے انسان کی نشاندہی کرتا ہے۔

میں شاعر کی اہمیت کا اندازہ اس سے کرتا ہوں کہ اس کا خدا، انسان اور عورت کا کیا تصور ہے۔ ہماری زندگی اور ہماری شاعری میں ان تینوں کا بڑا دخل ہے۔ پرانی چال کے شعراء ہوں یا نئی چال کے۔ چکر باالعموم عورت ہی کے گرد لگائیں گے۔ یہ اختیار آپ کو حاصل ہے چاہے ان کی شاعری

کو عیاری اور عیاشی کہیں یا عبادت و انقلاب. بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہو گی لیکن اس کے غلط ہونے کا امکان ذرا کم ہی ہے کہ جس شاعر کا جیسا تصور عورت کا ہوگا. کم و بیش ویسا ہی تصور اس کا خدا اور انسان کا ہوگا. میں نے آج تک کسی بڑی شاعری یا بڑے شاعر کے ہاں یہ نہ دیکھا کہ اس کا عورت کا تصور معمولی یا ادنیٰ درجہ کا ہو، انسان کی عظمت کا قائل خدا کی عظمت کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔[1]

دنیا کتنی ہی تیزی سے آگے کیوں نہ بڑھ رہی ہو. انسان کا ذہن ہمیشہ اس سے آگے ہوتا ہے. انسانی ذہن اپنے کارنامے پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھتا ہے. وہ ان کارناموں میں نہ پناہ لیتا ہے. نہ ان کو پناہ دینے کی خواہ مخواہ کوشش کرتا ہے. اچھے اور بڑے کارنامے اپنی حفاظت خود کرتے ہیں. فن ہو یا زندگی، منتخب افراد ہی کے ذہن کے مرکب پر سوار ہو کر آگے بڑھتی ہے. ان کے لئے اب تک کوئی مرکب دریافت نہیں ہوا. قدیم ہو یا جدید اپنے اظہار و اقتدار کے لئے فرد کا محتاج ہے کسی اور کا نہیں. فرد کی اہمیت سے انکار کرنا جہالت بھی ہے اور ظلم بھی۔

میں[2] فن سے فنکار کو کہیں زیادہ اہم اور عظیم سمجھتا ہوں. فن کی کوئی حقیقت نہیں اگر اس کا پیدا کرنے والا یا اس کا پروان چڑھانے والا موجود نہ ہوں. فن، ریاضی کا مسئلہ نہیں ہے شخصیت کا مسئلہ ہے. فن ہو، مذہب ہو، یا اس قبیل کی اور حیثیت یا حقیقت شخص کے بغیر ان کا فروغ پانا ناممکن ہے. فن کی اہمیت کا اندازہ اس کے مقصد سے کیا جاتا ہے۔

---

[1] نگار سالنامہ ۱۹۶۵ء صفحہ ۱۱۵

[2] نقدِ غالب صفحہ ۳۲۸.

ماہئیت سے نہیں، اور شخص کا امتیاز اس کی استعداد سے ہے۔ اس کے انجام سے نہیں۔

شاعری ہو یا دوسرے فنونِ لطیفہ، یا کوئی اور بڑا ذہنی کارنامہ، یہ سوسائٹی کے منفرد اشخاص کے سہارے نشوونما پاتے ہیں اور آگے بڑھتے ہیں خواہ یہ منفرد اشخاص اونچے طبقے میں پیدا ہوئے ہوں خواہ نچلے طبقے میں۔ میں اسے بھی مانتا ہوں کہ اونچے طبقے میں منتخب افراد کے پیدا ہونے کا امکان زیادہ رہتا ہے۔ اقدار اور روایات زندگی میں اس طور پر پیدا یا نمودار نہیں ہوتیں۔ جس طرح فطرت میں حیوانات اور نباتات پیدا ہوتے ہیں اور پروان چڑھتے ہیں۔ اقدار اور روایات سوسائٹی کے بہترین افراد کے فکر و عمل کے کسر و انکسار کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

"سوسائٹی کے بارے میں میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ وہ بجائے خود ایک لایعقل لیکن سودمند ادارہ ہے اور صلح پسند اور سادہ مزاج لوگوں کی جائے پناہ۔ سوسائٹی منتخب افراد کو جنم دے کر سو جاتی ہے اور اس کا کوئی مصرف باقی نہیں رہ جاتا۔ یہ منتخب افراد نئی سوسائٹی کو جنم دیتے ہیں اس سوسائٹی کو بھی بالآخر وہی دن دیکھنے پڑتے ہیں۔ ایک ہی سوسائٹی دوبارہ منتخب افراد کو جنم نہیں دے سکتی۔

"شاعری میں غم کے عنصر کو میں بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ ۔ ۔ لیکن بذاتِ خود میں غم کا زیادہ قائل نہیں ہوں۔ زندگی، ادب، آرٹ، غرض ہر عظیم انسانی سرگرمی کو روشنی رہبری اور رفعت امید سے ملتی ہے۔ الم سے نہیں۔ زندگی کو مرض اور مایوسی سے تعبیر کرنے والوں کی کمی نہیں

لے نگار کراچی سالنامہ ۱۹۶۵ء ص ۱۱۷۔

ہے۔ میں خود زندگی کو یکسر عیش و فراغت نہیں قرار دیتا۔ لیکن زندگی فی نفسہ مرض اور مایوسی کی نفی کرتی ہے اور یہی سبب ہے کہ ابتدائے تہذیب سے آج تک طرح طرح کی مزاحمتوں کے باوجود اچھے اور اولوالعزم انسان زندگی کو بامعنی و بابرکت بنانے اور پرکھنے میں کوشاں اور کامیاب رہے ہیں اور یہ ان ہی کا فیضان ہے کہ زندگی اور زمانہ، انسان کی تعمیری و تخلیقی سرگرمیوں سے مالا مال رہا ہے۔ میں زندگی اور فن دونوں کا جواز امید میں پاتا ہوں الم میں نہیں۔

شاعری قافیہ پیمائی نہیں ہے۔ شاعری زندگی کو آئینہ وغیرہ بھی نہیں دکھاتی۔ اس طرح کی حرکتیں دوسرے تیسرے درجے کے شعرا اور ادیب کرتے ہوں گے۔ شاعری زندگی آزمائی ہے۔ وہ زندگی جو انعام بھی ہے، آزمائش بھی۔ شاعری زندگی سے کچھ کم بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ زندگی کو آپ چاہیں تو امریکی یا روسی خانوں میں بانٹ لیں۔ شاعری خانوں میں نہیں بانٹی جا سکتی۔ اس لئے کہ شاعری دنیا کی مادری زبان ہے۔

"شاعری میں استادی شاگردی اور مذہب و اخلاق میں مرشد، مرید یا گرو چیلے کا رشتہ کہیں اور نہیں تو ایشیائی ممالک میں اتنا قوی اور محترم مانا گیا ہے کہ اس کو کبھی کبھی خون کے رشتے سے زیادہ وقعت دی گئی ہے۔ اس طرح کے رشتے یا ادارے زمانہ جہالت کی یادگار ہوں یا دورِ اجتہاد و انقلاب کی اس سے بحث نہیں۔ غرض صرف یہ کرنا ہے کہ ذوق شعر و ادب کی سیرابی اور صحت مندی کے لئے شاگردی، استادی اور اعمال و افکار کے سنوارنے سدھارنے کے لئے مرشد، مرید گرو چیلے کا جو رشتہ یا ادارہ مشرق میں مدت الایام سے چلا آرہا ہے۔ وہ اپنے

گوناگوں فوائد کے اعتبار سے بہت اہم اور قابلِ قدر مانا گیا ہے اور ہندوستانی تمدن میں اس رشتے اور رابطے کا ایک خاص مقام ہے۔ آج کل نوجوانوں میں جو عام ذہنی انتشار ملتا ہے اس کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں وہاں ممکن ہے ایک یہ بھی ہو کہ استاد شاگرد، یا مرشد مرید کا شخصی رشتہ جو مدتوں سے مجرب چلا آتا تھا اس کی طرف سے ہم نے اپنی توجہ ہٹالی ہے۔

شادی کو حماقت قرار دیتے ہوئے رشید صاحب نے عورتوں کی فطرت اور نفسیات کا بہت دلچسپ تجزیہ پیش کیا ہے۔ تجسس اور پاسبانی کو عورتوں کی فطرت بتاتے ہوئے اس سے پیدا ہونے والے مسائل کو طنز و مزاح کے پیرایہ میں بڑے دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دنیا کی نصف مصیبتیں عورتوں کی وجہ سے پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ پنڈورا بکس ہو یا گندم خوری سب میں عورت ہی کا ہاتھ نظر آتا ہے۔

شادی ایک حماقت

حماقت[1] نہ کسبی ہے اور نہ وہبی، لیکن یہ صرف متعدی ہے جو کسی نا اہل کی خوش نصیبی کی طرح اُڑ کر لگتی ہے۔ دنیا میں کوئی شخص مستقل احمق نہیں ہے۔ حماقت یا بعض امراض کے صرف دورے ہوا کرتے ہیں جن کی کم و بیش مقررہ میعادیں ہوتی ہیں جیسے ٹائیفائڈ یا کونسل اور اسمبلی کی میعادیں۔ اس دوران وہ سب کچھ کر گزرتا ہے۔ شادی کر لیتا ہے۔ قرض ادا کر دیتا ہے۔ ایک صاحب نے بڑی دعاؤں اور التجاؤں کے بعد ایک رفیقۂ حیات

---

[1] مضامینِ رشید صفحہ ۲۹۹-۳۰۰۔

پائی۔ عہدِ زفاف منانے کے لئے کسی مقام پر پہنچے۔ عروسہ کو وہ جگہ پسند نہ آئی۔ ارشاد ہوا تم کیسے احمق ہو جو ایسی جگہ لائے۔ غریب نے دبی زبان سے کہا جانِ من جگہ کا انتخاب تو تم ہی نے کیا تھا۔ خطاب ہوا لیکن تم نے اختلاف کیوں نہیں کیا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ دنیا کی نصف مصیبتیں محض اس لئے ہیں کہ بابا آدم اپنی سالم پسلیوں کے ساتھ سپردِ خاک نہیں ہوئے۔

"تجسّس عورت کی فطرت اور پاسبانی اس کی عادت ہے۔ اس کو اس کی فکر نہیں کہ مرد روپیہ کس طور پر کماتا ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ خرچ کیوں کر کرتا ہے۔ یہ بات بجائے خود قابلِ سوز خوانی نہیں۔ رقّت تو اس پر آتی ہے کہ اس کا خرچ کرنے کا تصور وہی ہے جو برطانوی اقتدار میں آئی۔ سی ایس کا ہوتا تھا۔ یعنی ہر وہ فعل جو آئی سی ایس کرتا برطانوی اقتدار میں گویا معین ہوتا اور ہر وہ فعل جو کسی ہندوستانی تعلیم یافتہ سے سرزد ہوتا برطانوی اقتدار کے منافی ٹھہرتا۔

"وہ مرد کے مخلص ترین دوست کو اپنے سب سے نکھے رشتہ دار سے بدتر سمجھتی ہے اور اپنے ہر فعل کے جواز میں کسی نہ کسی طور پر اس حقیقت کو جتا دیا کرے گی کہ تم سے شادی کرنے میں اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی قربانی کی ہے اور اس کے ثبوت میں یہ دعویٰ بھی پیش کرے گی کہ فلاں بیوی کے پاس مرغی، طوطے، بندر اور بھالو پلے ہوئے ہیں اور تمہارے یہاں یہ چیزیں نہیں ہیں۔

"متجسّس اور پاسبان کبھی قانع نہیں ہو سکتا۔ یہی حالت عورت کی

ا مضامینِ رشید صفحہ ۱۰۰- ۱۰۱- ۱۰۲- ۱۰۳

ہے۔ اس کی ساری زندگی مسلسل تفتیش اور تذبذب ہے۔ وہ اپنی خوبی یا خوش وقتی سے مسرور اور مطمئن نہ ہوگی بلکہ دوسروں کی، بشرطیکہ وہ اس کے رشتہ دار نہیں ہیں۔ کمزوری یا بدحالی سے مطمئن رہے گی۔ گھر میں اسے کوتوال کی سی حیثیت حاصل ہے۔ ایسا کوتوال جس سے بدمعاش آسودہ اور نیک معاش فکرمند رہتے ہوں۔ شوہر کا شمار ان لوگوں میں ہے جن کا نام درج رجسٹر نمبر دس ہوتا ہے۔

"عورت سے محبت کرنا ہمیشہ سے ہر قوم اور ہر ادب میں مقبول رہا ہے اسی محبت کی آڑ یا زد میں سب کچھ ہوا۔ جیل خانہ، ہسپتال، فنونِ لطیفہ مضمون نویسی، شاعری، اکاسا، وصیت نامے اور پاگل خانہ قسم کی تمام چیزیں اس کی منت کش ہیں۔

اگر دنیا کے انقلابات کی کبھی اندرون خانہ تاریخ لکھی جا سکی تو عشقِ مجازی کے کرتوت اور کارناموں کے عجیب و غریب کرشمے ملیں گے۔

رشید صاحب نے اپنے مضامین میں وقتاً فوقتاً اپنے عادات و خصائل رہن سہن، کھانے پینے، ملنے جلنے اور پسندیدگی و ناپسندیدگی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس سے ان کو سمجھنے میں بہت آسانی ہوتی ہے اور ایک طرح ان کے ان مضامین کے آئینے میں ان کی صاف تصویر ہماری نظر کے سامنے آجاتی ہے جیسا کہ ان کے طنز کا انداز ہے وہ بہت سی سماجی، اقتصادی، ادبی، مذہبی اور سیاسی برائیوں کی نشاندہی اپنے اوپر رکھ

---

[1] نگار لکھنو حسرت نمبر ۱۹۵۲ء صہ ۲۲۔

کر کرتے ہیں۔ اس سے بدمزگی پیدا نہیں ہوتی اور اصلاحی مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ سیاست سے وہ ہمیشہ علیحدہ اور علی گڑھ کی محبت میں دیوانے رہے۔ کہیں کہیں کھلے دل سے انہوں نے اپنی کمزوریوں کا بھی اعتراف کیا ہے اور یہ صرف عظیم اور اعلیٰ ظرف لوگوں ہی سے ممکن ہے۔ وہ حقیقت پسند تھے۔ مصائب اور زندگی کی دشواریوں کا سامنا کرنے کی ان میں ہمت تھی۔ ان کو احساس تھا کہ انہوں نے علی گڑھ کی زندگی، ہماہمی، بیوی بچوں کے مسائل میں الجھ کر اپنے بہت سے اعزا اور بزرگوں کے حقوق کی بجا آوری میں غفلت برتی اور جیسا چاہیئے تھا نہ کر سکے۔

عادات وخصائل ومیلانِ طبع

علی گڑھ[1] میں آکر میری عادت ہو گئی ہے کہ ہر کام خواہ کتنا ہی ضروری ہو اس وقت کیا جائے جب اس کام کا وقت بالکل ہی گذر جانے پر آگیا ہو۔ کام ہمیشہ وقت پر ہی ہو کر رہا لیکن اس کے لئے جس بے تکی و بے پناہ جدوجہد کو بر سرِ کار لانا پڑتا اس سے عہدہ برآ ہونے کا احساس بھی بڑے مزے کا ہوتا ہے۔ اس سے مجھ میں وہ اعتماد پھر عود کر آتا۔ جس کو میں کسی نہ کسی وجہ سے کھو چکا ہوتا تھا۔ اس سے میں اپنے آپ میں نوجوانوں کا سا حوصلہ اور تب و تاب محسوس کرنے لگتا۔ یہ وہ خود فریبی تھی جس نے مجھے دنیا کے تمام آلام و مصائب کے مقابلے میں مستعد اور مگن رکھا۔

مجھے[2] اچھے کھانے پہننے اور راحت کی زندگی پسند نہیں۔ یہ باتیں دراصل

---

[1] سہیل کی سرگذشت صفحہ ۱۷۔

[2] ۔ ،، ،، ،، صفحہ ۱۶

عورتوں اور بچوں کو زیب دیتی ہیں۔ لباس و جسم کی تزئین میرے نزدیک صرف عورتوں کے لئے مباح ہے۔ اس مسئلے پر یہاں نہ مردوں سے لڑنا چاہتا ہوں اور نہ عورتوں سے بگاڑ کرنا پسند کروں گا۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اگر زندگی کا اپنے اور دوسروں کے لئے انفرادی یا مجموعی طور پر نفع رساں ہونا ہی زندگی کا اصل مقصد ہے تو میرا خیال ہے کہ جہاں تک وضع قطع، رہن سہن مرنے جینے، نفع یابی و نفع رسانی کا تعلق ہے پرانے لوگ نئے لوگوں سے کسی طرح خسارے میں نہیں۔ نہ ان کو ملزم قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ان پر ترس کھانے کی ضرورت ہے۔[1]

"میں سب سے کم وقت کھانا کھانے، کپڑا پہننے، منہ ہاتھ دھونے، حوائجِ ضروریہ سے فارغ ہونے یا سفر کے لئے آمادہ ہو جانے میں لیتا ہوں۔ یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی ہے کہ دل میں خوشی اور خلوص ہو تو رسمی تکلفات بے معنی ہیں۔ مجھے اپنے اوپر وقت، دولت، راحت اور اسی قبیل کی دوسری چیزیں صرف کرنا بڑا شاق معلوم ہوتا ہے لیکن مجھے یہ چیزیں بجائے خود ناپسند نہیں۔ مجھے ہر پسندیدہ چیز پسند ہے۔ البتہ میں اس کے درپے رہتا ہوں کہ اپنے بجائے ان کا فائدہ دوسروں کو پہنچاؤں۔

"[2]دولت اور فراغت کے خلاف ہونا آرٹ، ادب، زندگی اور اس طرح کی دوسری باتوں کے صحیح و صالح تصور کے لئے آج کل ضروری خیال کیا جانے لگا ہے۔ میں اس کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں اس لئے کہ آرٹ، ادب، امیری، غریبی وغیرہ کے بارے میں میرا کچھ ایسا خیال ہے جیسے وہ میرے لئے

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ صفحہ ۲۰۲۔ [2] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۱۱۔

ہوں نہ کہ ہیں ان کے لئے۔ امیری غریبی، افراد کی زندگی پر ان کا اثر ضرور پڑتا ہے لیکن یہ بات بھی بھلانے کی نہیں کہ افراد کی زندگی کا امیری غریبی پر بھی بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ آرٹ اور ادب اشخاص پر معمولی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن غیر معمولی شخص سے آرٹ اور ادب، زیر وزبر ہو جاتے ہیں۔ زندگی اپنا چولا افراد میں بدلتی ہے۔ جماعت میں نہیں۔ جماعت اختراع وانقلاب سے معصوم ہوتی ہے۔ اختراع و انقلاب صرف افراد کا حصہ ہے۔ دولت اور فراغت سے اشخاص بدلتے نہیں بے نقاب ہو جاتے ہیں۔

"مجھے[۱] زندگی میں ایک چیز کی بڑی تمنا رہی جو میرے اطمینان کے مطابق پوری ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ یعنی یا تو میرے پاس اتنی دولت ہوتی کہ میں حاجت مند کی اپنے اطمینان کے مطابق مدد کر سکتا یا میرا کوئی ایسا دولتمند دوست ہوتا کہ جب کبھی اس قسم کی ضرورت پیش آتی تو وہ میری خاطر اور مجھ پر بھروسہ کر کے اسے پورا کر دیتا۔ میں خدا کی ناشکرگذاری نہیں کروں گا اس بارۂ خاص میں میرے دوستوں ہی نے نہیں بلکہ میری تحریک پر بعض اجنبیوں نے غیر متوقع مدد کی۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ میری تمنا اس حد تک پوری نہ ہوئی جس حد تک میں اسے پوری دیکھنا چاہتا تھا۔

"میں اس آدمی سے بہت خوش رہتا ہوں جو مجھ سے کم ملے اور زیادہ سے زیادہ مجھ سے کام لے۔ مجھے درباری سے سخت نفرت ہے درباری کے محتاج وہ لوگ ہوتے ہیں جو خود اپنی نظروں میں حقیر ہوتے ہیں اور اس ذہنی عذاب سے بچنے کے لئے وہ دوسروں کا

---

[۱] سہیل کی سرگذشت صفحہ ۱۶ - ۲۳۔

سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ اپنا نفس لعنت بھیجتا ہے تو وہ قصیدہ خواں اپنے اردگرد رکھتے ہیں۔ طوائف سے ہمدردی بھی کی جاسکتی ہے۔ درباروالوں پر صرف لعنت بھیجی جاسکتی ہے۔[1]

مصاحبین کی عقل و ذہانت کا مغالطہ ان کی سرکار پر ایسا طاری ہوتا ہے کہ وہ کبھی یہ محسوس نہیں کرتا کہ اس نظامِ شمسی اور کائناتِ عالم میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو اس کے مصاحبین سے زیادہ باوقعت اور قابلِ توجہ ہیں۔ یہ مشیر اور مصاحب اکثر تیسرے درجہ کے لوگ ہوتے ہیں اور ان کی مثال بعض جزوی ترمیم کے ساتھ ان مردہ کیڑوں کی ہے جو انجکشن کے ذریعے سے جسم انسانی میں پہنچا دیئے جاتے ہیں اور زندہ کیڑوں کو ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ مصاحب اور مشیر کار ناگزیر خرافات میں سے ہیں ورنہ رؤسا کی غیر ضروری آمدنی کا غیر ضروری ترمصرف ہی کیا ہو۔

"زیادہ[2] سونا اور زیادہ کھانا میرے نزدیک نحوست اور بدتوفیقی ہے۔ یہ باتیں صرف مریضوں اور لیڈروں کے لئے روا رکھی جاسکتی ہیں۔ دنیا اور اس کے کاروبار اتنے دلچسپ ہیں اور ہر آن انسان کو بہتر و برتر بنانے میں اس درجہ معاون ہوتے ہیں کہ میں سونے میں ان کو کھونا گوارا نہیں کرسکتا۔ سونا محض سونے کی خاطر میرے نزدیک فعلِ عبث ہے۔ دنیا دیکھنے اور برتنے کا جو لطف اور ذمہ داری ہے اس کو آدمی سمجھ لے تو میرا خیال ہے کہ وہ بغیر اشد ضرورت کبھی سونے پر آمادہ نہ ہوگا۔

"بڑا قرض لے کر چھوٹے چھوٹے قرض دینے اور اس کے ادا کرنے

---

[1] مضامینِ رشید صہ ۱۵۷ [2] سہیل کی سرگذشت صہ ۲۳-۱۸۔

کی بے حد خوشی ہوتی ہے۔ میں قرض کو فنونِ لطیفہ میں سے سمجھتا ہوں۔ کب لیا جائے۔ کس سے لیا جائے۔ اس سے دوستی بڑھائی اور گھٹائی کس طرح جا سکتی ہے۔ میرے ایک دوست اکثر بے وجہ مجھ سے خفا اور اپنی بیوی کی طرف سے مغموم ہو جایا کرتے تھے۔ چنانچہ کبھی میں ان کو ایسی حالت میں پاتا تو فوراً کسی بہانے سے قرض مانگ بیٹھتا اور وہ یک لخت چوکنے اور چونچال ہو جاتے تھے۔

سفر[1] میں آپ کم ایسے ساتھی پائیں گے جو اچھی جگہ پر خود قبضہ پانے کی فکر نہ کریں۔ ہار جیت کا کوئی تفریحی کھیل آپ ہارنے یا جیتنے لگیں تو فوراً ظاہر ہو جائے گا کہ آپ شرافت و انسانیت کی کس منزل میں ہیں۔ شاپنگ میں معمولی ساتھی بہت جلد اکتا جاتا ہے اور چاہے وہ کتنی کوشش اس کے خلاف کیوں نہ کرے اس کی بیزاری ظاہر ہو جائے گی۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب وہ اپنا کام ختم کر چکا ہو اور سب سے بڑھ کر آزمائش تو وہ ہے جب آپ کی قسمت میں خواتین کے ساتھ شاپنگ کرنا لکھا ہو۔ شاپنگ کا تو مجھے مرض ہے جس طرح بعض خبطی علی الصباح بلا قیدِ موسم و موقع بے ضرورت غسل کرنے یا ٹہلنے سے باز نہیں آتے اور شریفوں کے سامنے فخر کرنے سے نہیں شرماتے اور اس روزمرہ میں خلل آ جائے تو تمام دن سکرات میں مبتلا رہتے ہیں۔ ویسے ہی اگر میں کسی نئی جگہ جاؤں اور وہاں محض قوم کے درد میں مبتلا رہوں اور شاپنگ کرنی نصیب نہ ہو تو میں بھی آپے میں نہیں رہتا اور سمجھتا ہوں کہ لوگ انسانیت پر فخر کیسے کرتے ہیں جب مجھے شاپنگ کرنے تک کی فرصت یا مقدرت نہیں۔

---

[1] ذاکر صاحب ص ۱۳۱۔

شاپنگ میں میرا اصول یہ ہے کہ روپے کم خرچ کئے جائیں۔ اشیا زیادہ خریدی جائیں۔ دوڑ دھوپ زیادہ کی جائے۔ روپئے زیادہ ہوں تو کم خرچ کرنا آسان ہے جب کم ہوں تو کم خرچ کرنا بڑا مشکل فن ہے اور بالکل نہ ہونے پر بھی خرچ کئے جانا تو خاصانِ خدا ہی کا خاصہ ہے۔ ایسی حالت میں اگر کوئی نادر چیز نظر آجائے تو کسی صاحبِ مقدرت کی تلاش کروں گا اور اس سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے لئے اسے خرید لے اور میرے ذوقِ خواری یا خریداری کو تسکین پہنچائے۔[۱]

"جو بات کوئی صاحب خود ظاہر نہیں کرنا چاہتے اس کو ان کے سامنے کسی شکل میں نہیں چھیڑتا۔ نہ اس ٹوہ میں رہتا ہوں کہ کیا ہوا اور کیوں ہوا۔ میرا یہ رویہ تنہا کسی ایک صاحب ہی کے ساتھ نہیں اپنے سب ہی عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ تمام عمر یہی رہا۔ تا وقتیکہ مجھے اس کا یقین نہ ہو جاتا کہ وہ اپنی دشواری میرے سامنے اس لئے نہیں پیش کرتے تھے کہ ان کے خیال میں اس سے میرے تردّدات میں اضافہ ہونے کا امکان تھا۔ ایسی صورت میں ان کی فکر اور پریشانی کا پتہ لگانے کی ضرور کوشش کرتا ہوں۔

"میں[۲] مسلمان پیدا ہوا۔ نہ میری پیدائش میں میرا کوئی دخل تھا اور نہ مسلمان ہونے میں لیکن زندگی بھر جب مجھے ہر بات میں دخل تھا خودکشی بھی کر سکتا تھا اور اسلام سے بھی منحرف ہو سکتا تھا میں نے زندگی اور اسلام دونوں کو ایک ہی بات سمجھا۔ ظاہر میں بھی باطن میں بھی۔ مجھے اسلام کا پابند

۱؎ ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۳۴ ۔ ۲؎ سہیل کی سرگذشت صفحہ ۱۹ ۔

رہنے میں کبھی کوئی اہتمام نہ کرنا پڑا۔ بری بات کو میں نے ہمیشہ برا سمجھا۔ اور ہر اچھی بات میں اسلام کو معاون پایا۔

یونیورسٹی میں رہ بس جانے کے سبب سے میں نے مسلمانوں کی گذشتہ ۵۰۔ ۵۵ سال کی سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں کا مشاہدہ بڑے اطمینان سے کیا۔ اطمینان یوں کہ مجھے ازل سے ایمان، عقل، آرٹ وغیرہ کا جو حصہ ارزانی ہوا تھا وہ ذرا واجبی ہی تھا۔ اس لئے کوئی تحریک یا تہلکہ کہیں اٹھا۔ کیسا ہی اٹھا۔ میں اپنے کو بچائے رکھنے کی فکر کرتا تھا۔ یعنی نہ ان تحریکوں اور تہلکوں سے آنکھ مچولی کھیلی نہ زور آزمائی کی۔ نتیجہ یہ ہوا عقل، صحت آبرو، سب بحال رہے۔[۱]

"گذشتہ ۵۰۔ ۵۵ سال میں علی گڑھ کا کوئی انقلاب ایسا نہ تھا جس میں بحیثیت طالب علم یا ممبر اسٹاف نہ گذرا ہوں۔ میری زندگی کا سب سے وقیع حصہ علی گڑھ کے لئے صرف ہوا۔ میں نے یہاں شہرت حاصل کی اور آسودگی پائی۔ علی گڑھ کی فیض بخشیوں نے مجھے دوسرے کے فیض سے بے نیاز کر دیا۔ علی گڑھ میری زندگی، میری شخصیت اور میری تحریر میں جاری و ساری ہے۔"[۲]

"میں اپنی زندگی سے بہت خوش اور مطمئن رہا ہوں۔ مجھے کم و بیش ہر وہ نعمت حاصل رہی جس کی میں نے خواہش کی لیکن ایک بات البتہ ایسی ہے جو اکثر مجھے کھٹکتی ہے۔[۳]

"علی گڑھ آئے ہوئے مدت ہوئی۔ گھر سے پہلے پہل نکلا تو زندگی کچھ اور تھی اب کچھ اور ہے۔ پہلا زمانہ بڑی تنگ حالی کا تھا۔ اب خدا

۱؎ ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۲۴۷ ۲؎ سہیل کی سرگذشت صفحہ ۱۵۔

۳؎ گنج ہائے گراں مایہ صفحہ ۵۵۔

کے فضل سے ہر طرح کی کامرانی اور فراوانی حاصل ہے۔ یہ بھی اللہ کا کچھ کم احسان نہیں کہ قریبی اعزا میری کامرانی سے خوش اور مطمئن ہیں۔ لیکن جو بات کھٹکتی ہے وہ یہ کہ علی گڑھ کی زندگی، یہاں کی ہماہمی، بیوی بچے، دوست احباب وطن سے دوری اور اسی قسم کی بہت سی باتوں نے کبھی اس کا موقع نہ دیا کہ ان لوگوں کا دھیان بھی آتا جو میری دولت، راحت اور شہرت میں شریک ہونے کا حق رکھتے تھے۔ مجھ پر بہنوں کے حقوق ہیں۔ ان حقوق کو میں تھوڑا بہت ادا کرنے کی کوشش بھی کرتا ہوں لیکن دل گواہی دیتا ہے کہ جو کرنا چاہیئے اور جتنا کرنا چاہیئے اس سے اغماض کرتا ہوں۔ بہنیں اپنے اپنے گھر جا چکی ہیں۔ بھائی بھی برسر کار ہیں۔ ان میں کوئی آرام سے بسر کر رہا ہے اور کوئی تنگی ترشی سے۔ کبھی کبھی وطن جاتا ہوں اور جلد واپس آجاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے اگر میں ان سے ملنے کے لئے ذرا دیر اور ٹھہر جاؤں تو ان کی خوشی کی انتہا نہ ہوگی۔ لیکن وہ جانتے ہیں کہ میں بیوی بچوں میں جلد سے جلد واپس آجانا زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ اس لئے اشارۃً کنایۃً بھی کبھی اس کا اظہار نہیں کرتے کہ میں تھوڑے عرصے کے لئے اور ٹھہر جاؤں۔

میری[1] داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ میری علی گڑھ کی زندگی اس زندگی سے بالکل مختلف ہو گئی ہے جو میں اپنے والدین اور اعزا کے ساتھ وطن میں بسر کر چکا۔ اس زندگی میں جہاں میں گذشتہ آلام و مصائب کو بھول چکا۔ وہاں ان ذمہ داریوں کو بھی بڑی حد تک نظر انداز کر گیا جو اپنے بزرگوں

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ ص ۵۷۔

اور عزیزوں کی طرف سے مجھ پر عائد ہوتی ہیں۔ وہ مجھ پر اب بھی جان چھڑکتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرے رنج و راحت سے جتنا وہ ملول یا مسرور ہوتے ہیں۔ اتنا ان کے رنج و راحت سے میں محزون یا محظوظ نہیں ہوتا۔ فراغت کی زندگی میں یہ محرومی اکثر میرے لئے بڑی تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے۔

"میں اپنے بزرگوں اور عزیزوں کے رنج و راحت میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے مسرت کے پیالے کو جو بہت ہی اُتھلا ہے اپنی ادنیٰ توجہ سے لبریز کردوں لیکن مجھ سے یہ ہو نہیں پاتا۔ نفس حیلے تراشتا ہے تو میں اپنی جگہ مطمئن ہوکر بیٹھ جاتا ہوں۔

پھر بھی علی گڑھ مجھے عزیز ہے۔ اس کی کوتاہیوں کے باوجود اگر وہ قابل اعتنا ہوں یقیناً ان عزیزوں اور بزرگوں کو بھی عزیز ہو گا جن کو اس نے اپنے فیضِ تربیت سے، اخلاص و افتخار سے، رہنے سہنے اور دوسروں کو رکھنے کا سلیقہ اور حوصلہ دیا اور انسانی زندگی جن قیمتی اقدار و روایات کے سہارے نمود و نمو پاتی اور برگ و بار لاتی ہے ان سے آشنا کیا۔ پچاس سال تک مسلسل جس کو علی گڑھ نے اپنی ان نعمتوں سے بہرہ مند رکھا ہو علی گڑھ کے بارے میں اس کے تصورات و تاثرات اگر ع "بے ربطیٔ شیرازۂ اجزائے حواس" کی حد تک پہنچتے ہوں تو کیا تعجب۔

" جیسا کہ وقتاً فوقتاً اعتراف کرتا رہا ہوں۔ میں بذاتِ خود کچھ

ا؎ آشفتہ بیانی میری صہ ۹ - ۱۲

"مقامی" سا آدمی واقع ہوا ہوں۔ "آفاقی" یا "ماورائی" قسم کا ہونے کی نہ صلاحیت رکھتا ہوں نہ حوصلہ، نہ ہوس۔ اس لئے میری فکر و نظر بھی محدود آنی و فانی قسم کی چیز ہے۔ ہر شخص کی ہمت اس کی طبعی اور ذہنی صلاحیتوں کے مطابق ہوتی ہے۔

میری "ہمت" یقیناً بلند نہیں ہے اس لئے ممکن ہے "پیش خدا و خلق" میرا اعتبار بھی کچھ زیادہ نہ ہو۔ بایں ہمہ خود اپنی نظر میں کچھ ایسا نا معتبر بھی نہیں ہوں۔

"داستان طویل ہو گئی۔ عام طور پر اس کے دو اسباب ہوتے ہیں تبحرِ علمی یا زہ سرائی۔ کچھ ان کے معتقد ہوں گے اور کچھ بر لحاظ زفع شر دونوں کے قائل۔ بہر حال ہر ایک کے لئے کافی مواد ہے۔ البتہ دعا یہ ہے کہ ان سطور کا حشر ایسے ہاتھوں سے ہو جو متذکرہ صدر ہر سہ محرومی سے مامون و مصئون ہو۔ اپنی طرف سے البتہ یقین دلا سکتا ہوں کہ اس قسم کی جراءتِ رندانہ یا "شوقِ فضول" کا آئندہ عزم نہ کروں گا۔

ناظرین دعا کریں فسخ عزائم کی نوبت نہ آئے کیونکہ میں وجود باری کا قائل ہوں۔ علماً، عملاً، فطرتاً، اخلاقاً، ضرورتاً ۔۔ اور وغیرہ۔[۱]

رشید صاحب کی مقبولیت آخر میں خود ان کے لئے وبال جاں بن گئی تھی۔ پاک و ہند میں تمام معیاری رسائل کے ایڈیٹروں کی خواہش، تمنا اور کوشش ہوتی کہ ان کا مضمون اس میں ضرور شامل ہو۔ اور اس کے لئے وہ کوئی دقیقہ ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ بغیر ان کے مضامین کے رسائل میں رونق

---

[۱] مقدمہ دیوانی فانی باب دوم صفحہ ۱۔

نہیں آتی۔ طنز نگاروں میں وہ چوٹی کے چند لکھنے والوں میں سے ایک تھے۔ ان کا اسلوب منفرد تھا جس کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ مدیرانِ رسائل کی فرمائش اور ریڈیو والوں کی زبردستی نے ان کو بے حال کر رکھا تھا۔ ان کی اسی کیفیت کو دیکھ کر میں نے ان پر ایک مضمون میں ان کو بوڑھے انشؔا سے تشبیہہ دی تھی۔ جن کی ظرافت کو بادشاہ کے عجیب حکم نے اور رشید صاحب کی طنز نگاری کو ریڈیو والوں اور مدیرانِ رسائل کی فرمائش نے نقصان پہنچایا۔

مضمون لکھنے سے پہلے وہ جس منزل اور حالات سے گذرتے تھے اس کی کچھ جھلک ہمیں ان کے بعض مضامین میں جہاں تہاں ملتی ہے۔

مضمون لکھنے سے پہلے کن کن منزلوں سے ان کو گذرنا پڑتا تھا۔

مجید[1] صاحب اور مجھ میں بالمشافہ یہ طے ہوا کہ ہو سکا تو کارواں کے لئے مضمون لکھ دوں گا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ مجید صاحب کو یقین کہ میں مضمون لکھ دوں گا اور مجھے یہ تقویت کہ آخر لکھنا تو اپنے اختیار کی بات ہے۔ چنانچہ مجید صاحب نے یاد دہانی کے لئے تار بھی بھیجے لیکن میں دنیا کی بے ثباتی پر ہنستا رہا۔ ایک روز دروازے پر ایک موٹر آکر رکی۔ میں نے ہر قسم کی موٹر دیکھی ہے لیکن یہ موٹر اپنی سج دھج اور شور و شعب میں نرالی تھی۔ ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ صاحب (پرنسپل طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نمودار ہوئے۔ ایک نعرہ لگایا۔ مجید کا خط آیا ہے۔ تم نے کارواں کے لئے مضمون لکھا یا نہیں۔ پہلے تو میں نے ذہن میں اس امر کا جائزہ لیا

---

[1] مضامین رشید صفحہ ۱۷۲۔

کہ مکان میں کوئی شخص بیمار تو نہیں ہے۔ جب اس طرف سے اطمینان ہوا تو کسی قدر دلیر ہو کر بولا۔ کیسا مضمون؟ ڈاکٹر صاحب بولے ناک میں دم ہے۔ تم نے کارواں کے لئے مجید سے مضمون لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کا خط آیا ہے کہ مضمون لے کر بھیج دیا جائے۔ میں نے کہا جناب لکھنے یا نہ لکھنے کا وعدہ تو میں نے ان سے کیا تھا۔ آپ مجھ پر کیسے مسلط ہو گئے۔ بولے السلام علیکم۔ گاڑی پر لرزہ طاری ہوا۔ محلہ والوں کے کان کھڑے ہوئے۔ انجن نے زقند بھری اور سوار و سواری دونوں غائب۔

؎ برق تھی، صرصر تھی یا تھا زلزلہ

ٹائیفائڈ نے ورد فرمایا۔ گھر میں بچی بیمار ہوئی۔ خیال آیا ڈاکٹر صاحب کے ہاں چلیں۔ ساتھ ہی ساتھ مضمون کا خیال آیا۔ جس کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ معاً جھوٹ بولنے کی تحریک ہوئی۔ ایک مصرعہ بھی ذہن میں آ گیا اور ایسا رواں اور شگفتہ کہ دیکھتے ہی دیکھتے پوری نظم مرتب ہو گئی۔

ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ عرض کیا بچی ٹائیفائڈ میں مبتلا ہے۔ کہنے لگے حال سناؤ۔ میں نے حال کہنا شروع کیا اور ڈاکٹر صاحب نے نسخہ لکھنا۔ میں نے ابھی نمبر بھی متعین نہیں کی کہ ڈاکٹر صاحب نے پوری نظم تیار کر دی۔ اتنے میں آمنہ دوڑی آئیں اور فرمایا باجی نے پوچھا ہے آپ نے کارواں کے لئے مضمون نہیں لکھا۔ میں نے کہا باجی سے کہہ دیجئے کہ اس پھیر میں نہ پڑیں۔ اڈیٹر اور مضمون نگار کے معاملات سے ان کو کوئی سروکار نہ ہونا چاہیئے۔ ڈاکٹر صاحب[1] نے کہا لفاظی اور لسانی کسی اور وقت کے لئے ملتوی کرو۔ یہ تو بتاؤ مضمون لکھی

---

[1] مضامینِ رشید صفحہ ۱۷۵۔

لکھا یا نہیں۔ اس کے لئے میں تیار ہو کر آیا تھا۔ بولا عنقریب ختم ہونے والا ہے لیکن بچی کی بیماری کو کیا کروں۔ فرمایا اچھی ہو جائے گی۔ مضمون تیار کر لو۔ میں نے کہا لیکن مشکل یہ ہے کہ مضمون لکھنا اتنا آسان نہیں جتنا آپ کا نسخہ لکھ ڈالنا۔ کہنے لگے تو پھر تم نے لکھنے کا وعدہ کیوں کیا تھا۔ میں نے عرض کیا ڈاکٹر صاحب وعدہ کر لینا تو بس ایسا ہی ہے جیسے آپ نے کہا السلام علیکم۔ میں نے کہا وعلیکم والسلام۔ ایک اضطراری فعل کا جواب دوسرے اضطراری فعل سے دے دیا گیا۔ اس کے ایفا پر آپ کا اصرار کرنا یقیناً حقِ آسائش میں خلل اندازی ہے۔ فرمایا اچھا رخصت۔ السلام علیکم۔

تعطیلوں میں بارش اور چوروں کی یورش ہوئی۔ اس پر لطف یہ کہ مکان کے ایک حصے کی توسیع ہو رہی تھی۔ بارش اور سلسلہ تعمیر نے کاشانہ کا کیا یہ رنگ ؏

"کہ ہو گئے میرے دیوار و در در و دیوار"

بچی ٹائیفائڈ میں مبتلا۔ دن بھر تو ڈاکٹروں اور دوا خانوں کی سیر رہتی۔ رات بھر تیمارداری کا سلسلہ جاری رہتا۔ میں نے ایک بار تنگ آکر کہا۔ تیمارداری سے تو بہتر ٹائیفائڈ میں مبتلا ہونا ہے۔ بیوی نے کہا خاموش ہو جاؤ۔ اللہ کی مصلحت میں چون وچرا کی گنجائش نہیں۔ میں نے کہا چون وچرا کون کرتا ہے۔ رات بھر بیمار بچی کو گود میں لے کر ٹہلانے میں ایسے فقرے نکل ہی جاتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم مذہب کے معاملات میں بھی مجھ سے مشتبہ ہو جاؤ۔ مصلحت کی قائل تو مجھ سے زیادہ تم ہو نہیں سکتیں۔ دیکھتی نہیں آج کل چوروں کی وجہ سے تمام لوگ کس درجہ پریشان اور سراسیمہ ہیں۔ ہم تم کس قدر بے فکر ہیں۔

بچی کی بیماری چوروں سے نجات کا باعث ہو گئی ورنہ مکان ٹوٹا ہوا ہے چور گھس آتے تو ہماری تمہاری بے پردگی تو ہوتی ہی۔ تمہاری کفایت شعاری اور میری زیر باری دونوں مالِ مسروقہ بن جاتیں۔ بیوی نے کہا اچھا چپ ہو رہو۔ رات کے وقت چور ڈاکو کا ذکر نہیں کرتے۔ لیکن برسات میں مکان چھیڑنے کو کس نے کہا تھا۔ میں نے کہا، کہا کس نے تھا۔ مصیبت کہہ کر آتی ہے۔ ضرورت اور اتفاق کس کے بس کے ہیں۔ تم ہی بتاؤ ہماری تمہاری شادی کو کس نے کہا تھا کہ رومان کی حالت میں ہو اور رخصتی طوفانِ نوح اور کشتیٔ نوح میں ہو۔ بیوی نے جھلا کر کہا۔ کہاں کی بات کہاں پہنچا دی۔ تم تو مجھے ہمیشہ سے وبالِ جان ہی سمجھتے رہے۔ میں نے کہا بڑی مشکل ہے۔ میں نے چوروں کا تذکرہ کیا تو تم نے کہا رات کے وقت اس کا ذکر نہ کرو۔ میں نے سوچا نیتِ شب بخیر۔ شادی کا قصہ چھیڑوں اس پر تم چراغ پا ہو گئیں۔

تم ہی بتاؤ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

اتنے میں بچی نے چیخ ماری اور میں پھر ڈولی چلنے لگا اور موسیقی کی وہ دھن شروع کر دی جو موسیقی کی ایجاد سے بہت پہلے مدوّن ہو چکی تھی۔ اب بارش کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہوا چلنے لگی۔ شب کی تاریکی و خاموشی میں ایک طرح کا غم آلود سکر پیدا ہوا۔ جس نے رفتہ رفتہ دماغ، اعضا اور عضلات میں سرایت کرنا شروع کیا۔ . . . مریض بچی کو میں نے چارپائی پر آہستہ سے سلا دیا۔ خیال آیا کہ بیوی کو جگا کر خود سو رہوں اتنے میں چوکیدار کی چیخ سنائی دی۔ ہمارے محلے کے چوکیدار کی آواز ایسی ہوتی ہے گویا چور دیکھ کر مارے خوف کے اس کی چیخ نکل گئی ہو۔

بیوی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ بشرے سے یہ معلوم ہوتا تھا گویا میں نے ہی چیخ ماری ہے۔ فرمایا دیکھتے نہیں بچی بیمار ہے۔ میں نے کہا دیکھنے کی کون بات ہے۔ میں تو اس کے علاوہ یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ آپ آرام فرما رہی ہیں۔ چوکیدار چیخ رہا ہے۔ بارش ہو رہی ہے اور میں اُلو کی طرح بیٹھا ہوں۔ فرمایا تو اس میں میرا کیا قصور ہے کہ آپ کس طرح بیٹھے ہیں۔ اچھا اب جاکر سو رہیئے۔ تھوڑی دیر میں صبح ہو جائے گی۔ آپ کو ڈاکٹر بٹ کے پاس جانا چاہیئے۔ اور ہاں —— اس دن آمنہ بی کہتی تھیں کہ آپ نے کوئی مضمون لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ جسے اب تک پورا نہیں کیا۔ اب میرے تحمل کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے جھلا کر کہا وعدہ تو میں نے کیا تھا۔ آپ کیوں سر پر سوار ہو گئیں۔ جی میں آیا لکھوں گا۔ جی میں نہ آیا نہ لکھوں گا۔ نیک بخت بولیں۔ اچھا شور نہ مچائیے۔ اتنا تو لحاظ ہونا چاہیئے کہ ڈاکٹر بٹ صاحب ہم لوگوں پر کتنا کرم کرتے ہیں۔ ان کی ایک ذرا سی فرمائش تو پوری نہیں ہوتی۔ سارا گھر سر پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ آپ کا مضمون میری سمجھ میں تو کبھی آیا نہیں۔ میں نے کہا جس دن میرا مضمون آپ کی سمجھ میں آگیا اسی دن میں خودکشی کر لوں گا۔ فرمایا خودکشی کے اس سے بہتر مواقع پیش آیا کیئے ہیں لیکن آپ نے اپنا ارادہ ملتوی رکھا۔ اب اس وعدہ فراموشی کے موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیجئے۔ میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس لئے نہیں کہ اس سے رفع شر مقصود تھا بلکہ کوئی جواب ہی نہ سوجھا۔ جاکر چارپائی پر دراز ہو گیا۔

بہرحال اب پانی سر سے گذر چکا تھا۔ ارادہ کر کے بیٹھا کہ مضمون لکھوں گا۔ خیال آیا کہ کمرہ میلا ہے۔ تمام چیزیں بے ترتیب ہیں۔ ان کی صفائی کر لوں

۱؎ مضامینِ رشید صفحہ ۱۸۶۔

تو پھر اطمینان سے لکھوں۔ چنانچہ کمرہ صاف کیا گیا۔ سب چیزیں قرینے سے رکھی گئیں۔ قلم اٹھایا تو معلوم ہوا روشنائی نہیں۔ فوراً بک ڈپو پہنچا کہ روشنائی کی شیشی خریدوں۔ وہاں معلوم ہوا کہ بک ڈپو کی چھت ٹپک رہی ہے۔ فلاں کتاب نہیں آئی۔ پارسلوں کی بلٹیاں وی پی آئی ہیں۔ روپیہ کا انتظام کیجیئے۔ تین گھنٹے اس کی نذر ہوئے۔ شام ہو گئی۔ مکان واپس آیا تو معلوم ہوا کہ داخلے کے سلسلے میں لڑکے مع والدین آئے ہوئے ہیں۔ تھرڈ کلاس پاس ہوئے ہیں۔ گھر سے ایک پیسے کی امداد نہیں ہو سکتی۔ فیس معاف ہونی چاہیئے۔ قرض حسنہ دلوا دیئے۔ آفتاب ہال میں جگہ مل جائے۔ سیکنڈ ہینڈ کتابوں کا بندوبست کیجیئے۔ فرنیچر گھر سے دیجیئے۔ صبح حبیب صاحب سے ملائیے۔ وائس چانسلر کے ہاں لے چلئے۔ قوم کی غفلت۔ مسلمان بچوں کی تباہی پر ان کے ساتھ ماتم کرتا رہا اور ماحضر کھانا کھلاتا رہا۔

نو بجے رات کو زنان خانے میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ دو ایک صاحب بیمار ہیں۔ ایک صاحب کھانا کھانے سے انکار کرتے ہیں۔ دوسرے صاحب اس قدر کھا رہے ہیں کہ ان کی صحت خطرے میں ہے ان کے قضیے فیصل کر کے بیٹھا تھا کہ خیال آیا اب کلاس پڑھانے کے لئے کچھ پڑھ لوں۔ کچھ دیر تک مراقبے میں رہا کہ ایک طرف سے سسکنے کی آواز آئی جو رفتہ رفتہ بلند ہوتی گئی۔ پوچھا کیا ہے۔ آواز آئی پانی پیوں گا۔ جب تک پانی مہیا کیا جائے۔ ایک دوسرے بزرگ نے ایک نالہ سر کیا۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمایا ہم بھی پانی پئیں گے۔ ان کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ واپس آکر پھر کتابیں اٹھائیں۔

"دوسرے دن علی الصباح مضمون لکھنے بیٹھا تو معلوم ہوا روشنائی کی شیشی خریدنا بھول گیا۔ پینسل ڈھونڈھ کر نکالی۔ مضمون کا عنوان کیا ہو۔ کچھ دیر سوچتا رہا۔ بھڑ سے ہوا عنوان نہ سہی۔ مضمون کی فکر کرو۔ لیکن مضمون کا پتہ نہیں۔ اچھا عنوان پر زور لگاؤ۔ مثلاً چل میرے خامہ بسم اللہ"

ہم مضمون لکھ رہے ہیں اور یونیورسٹی کے گھنٹے پر کان لگائے ہوئے ہیں۔ یہ لیجئے گھنٹہ بجا . . . . دوسرا گھنٹہ اور ہم اس طور پر جھپٹے جیسے کوئی فائر بریگیڈ۔ آتش زدگی فرد کرنے کے لئے جا رہا ہو۔ بیوی تو زد سے بچ گئیں لیکن دو ایک بچے اور اسی قسم کی چند اور متفرق ذی حیات اور غیر ذی حیات چیزیں جھپٹے میں آتی گئیں۔ ہم غالب رہے اور کہیں مغلوب۔ کسی کو روتے، کسی کو بسورتے، کسی کو مجروح کرتے ہوئے صاف نکل گئے اور یک لخت معلوم ہوا کہ ہم کوئی نصف گھنٹہ مقررہ وقت سے پہلے کلاس پہنچ گئے ہیں۔ بحیثیت لیکچرار کلاس میں تنہا پایا جانا، پانے والوں کے لئے خاصا بصیرت افروز اور دلچسپ ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ہر اس گذر جانے والے کو مخاطب کرنا اور طوعاً و کرہاً اس سے اظہارِ خلوص یا برتری کرنا ضروری ہو جاتا ہے جس کے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ یہ ہماری ہیئت کذائی پر سوچنے کا اہل ہے۔ بہر طور کلاس میں پہنچ کر کرسی پر اسی طور جا کر بیٹھے جیسے سینکڑوں عقلمندوں میں ایک بے وقوف یا سینکڑوں بے وقوفوں میں ایک عقل مند۔

لاحول ولا قوۃ کہاں سے کہاں جا پڑا۔ ہاں تو تذکرہ تھا یہ کہ میں کام

۱؎ مضامین رشید صفحہ ۱۹۲ - ۲۷۰ ۲؎ مضامین رشید صفحہ ۱۴۲ - ۱۷۱ - ۲۳۴

۳؎ ۔ سہیل کی سرگذشت صفحہ ۱۸ ۔

اس وقت زیادہ کرتا ہوں جب فرصت کم ہو، موسم خراب ہو اور طبیعت بھی اچھی نہ ہو۔ ایسے مواقع پر کام میں لگ جانا یوں مفید ہوتا ہے کہ میرا ذہن اس تکلیف اور نامساعد حالات کی طرف منتقل ہی نہیں ہوتا۔ کام کرنا وہ نشہ ہے جس میں نہایت آسانی سے ہر قسم کے مصائب غرق کئے جا سکتے ہیں۔ جب موسم خوشگوار ہو اور طبیعت بحال ہو تو مجھے کام کرنا مطلق پسند نہیں ہوتا۔ میری لغت میں تعطیل منانے کے یہ معنی ہیں کہ کسی کو مزے کا خط لکھا جائے۔ گھر سے باہر قدم نہ نکالا جائے۔ باغ میں کام کیا جائے۔ گھر کی صفائی کی جائے۔ ایک آدھ وقت کا کھانا ترک کر دیا جائے۔ یا دو چار وقت کا کھا لیا جائے۔ بیوی بچوں کو بھی کوئی کام نہ کرنے دیا جائے جو ملنے آئے اس سے طرح طرح سے بچا جائے۔ غسل کا اہتمام کیا جائے اور صرف ہاتھ پاؤں جھاڑ لینے پر اکتفا کیا جائے۔ تعطیل میں کام کرنے کا جو وعدہ کر لیا جاتا ہے۔ اسے تعطیل ہی میں پورا کر دینا نہ میرے بس کی بات ہے اور نہ میں اسے پسند کرتا ہوں۔ تعطیل میں وہ کام کرے جسے کام کرنے کا سلیقہ نہ ہو یا جو کام نہ کرنے کے فن سے ناواقف ہو۔ میں نے اس فن میں بڑا ریاض کیا ہے۔ اوّل تو یہ کہ یہ بڑی کم ظرفی ہے کہ ادھر کام آیا ادھر لگے اسے کرنے۔ میں پہلے تو ہر قسم کا کام اکٹھا کرتا جاتا ہوں اور جب سمجھ لیتا ہوں کہ کاموں کی اچھی مقدار جمع ہو گئی ہے تو پھر ان کی کھتونی شروع کرتا ہوں۔ بڑے کام، اوسط کاموں کو چھوٹے، کاموں سے ٹکراتا ہوں اس میں سارے چھوٹے کام

ا؎ دیباچہ دنیائے تبسم (تصنیف شوکت تھانوی) صفحہ ۶۰۔

پاش پاش ہو کر ختم ہوتے ہیں اور اوسط کام بھی اچھی خاصی تعداد میں مجروح ہو جاتے ہیں۔ اب اوسط کو بڑے کاموں سے ٹکراتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ سارے اوسط کام، کام آجاتے ہیں اور بڑوں میں بھی مقتولین، مجروحین کی تعداد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جو جانچ پرتال کی جاتی ہے تو صرف بعض سخت جان ہی باقی ملتے ہیں ان کو اپنی سہل انگاری، حیلہ پردازی، ناکسی و نااہلی اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی زد میں جن کا اعلان نامناسب ہے لاتا ہوں۔ نتیجہ اکثر خاطر خواہ نکلتا ہے میرا کچھ نہیں بگڑتا۔ لیکن کاموں کا مطلع صاف ہوتا ہے۔ قرض کے معاملے میں بھی یہی اصول جزئی ترمیم کے ساتھ کام میں لاتا ہوں۔

لکھنے میں ظاہری ارادے کو بھی دخل ہوتا ہے اور میں خود بھی ارادہ کرتا ہوں لیکن دراصل میرے لکھنے میں میرے ارادے کو اتنا نہیں جتنا ایک خاص لمحے کو دخل ہوتا ہے۔ یہ میں کبھی نہ دریافت کر سکا کہ وہ لمحہ کب اور کیسے میسر آسکتا ہے۔

اندازِ تحریر میں لکھنے میں ابتدا، ارتقا اور عروج وغیرہ کی بات ملحوظ نہیں رکھتا۔ مخلصانہ اور بے تکلف گفتگو میں ان امور کی پابندی نہیں کی جا سکتی اور نہ کرنا چاہیئے۔ مجھے مضمون نگاری کے آداب و تسلیمات بھی نہ آئے۔ میں قارئین کو اپنا اچھا اور بے تکلف دوست سمجھ کر گفتگو کرنا شروع کرتا ہوں ـــــ اچھا اور بے تکلف

ا؎ سہیل کی سرگذشت صفحہ ۲۸۰۔

دوست ہی نہیں بلکہ اچھا اور بے تکلف خاندان بھی جس میں جوان، بوڑھے، بیمار، تندرست، ملول، مسرور، سبھی ہوتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو اس حلقے میں ایک اچھے رفیق کی حیثیت سے پیش کرتا (کم از کم نیت اور کوشش ضرور ایسی ہوتی ہے)

"اچھی گفت گو کسی پروگرام کے تحت نہیں ہوا کرتی کہ اور یوں ہو گا۔ گفتگو کرنا ایک سفر کی مانند ہے۔ جس میں مختلف اشخاص اور مختلف حالات وحوادث سے سابقہ ہو ایک اچھا آدمی ہم سفر کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے اور اس کے رنج وراحت کو اپنے رنج وراحت پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ شرافت ہی کی نہیں۔ اچھے لکھنے والے کی بھی پہچان ہے۔ لکھنے میں اور گفتگو کرنے میں بھی رونا گڑگڑانا، رعب بٹھانا اور قابلیت جتانا نااہلوں کا کام ہے۔ میرے مضامین غزل کی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ مربوط اور مسلسل نظم کی مانند نہیں۔ ان مضامین میں جو باتیں غیر متعلق اور بہکی بہکی معلوم ہوتی ہیں وہ میرے ... کی شریعت کے عین مطابق ہیں۔ میں خود بھی بہکتا ہوں اور ... دوں کو بھی بہکنے کی فرصت دیتا ہوں۔ عقل کی باتیں دیر تک ... سکتی ہیں نہ سنائی جا سکتی ہیں۔

ضمیمہ

اُستاد رُشید، بنظرِ اُلطاف

○

جناب ڈاکٹر محمود حسین خاں مرحوم کے زمانۂ وائس چانسلری اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے دورِ چیئرمینی شعبۂ اردو میں ۲۳ فروری ۱۹۶۷ء کو کراچی یونیورسٹی میں "انجمن اردو" کے زیرِ اہتمام ایک نہایت شاندار مذاکرہ بعنوان "رشید احمد صدیقی" منعقد ہوا تھا جس میں راقم کو بھی اپنے استادِ محترم کے متعلق اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی۔ یہ تقریر جب بعد ازاں قلم بند ہو کر "العلم" بابت جنوری تا مارچ ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی تو اس پر جناب رشید صاحب کا گرامی نامہ موصول ہوا اور حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا "صدق جدید" میں ایک ادارتی نوٹ بھی شائع ہوا۔ کتاب ہٰذا کے ضمیمہ میں تقریر مذکور کے ساتھ یہ دونوں یادگار چیزیں بھی بمصداق "نوشتہ بماند سیاہ بر سپید" شامل کی جا رہی ہیں۔

○

رشید صاحب

"الطاف صاحب مکرم تسلیم!

"العلم" کا شمارہ (جنوری تا مارچ) کل موصول ہوا۔ آپ نے جو مضمون مجھ پہ لکھا ہے نظر سے گذرا۔ آپ کے کرم کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے اس عزت و محبت سے مجھے یاد فرمایا۔ آپ کا جتنا شکر گذار ہوں اتنا ہی اپنے سے شرمندہ ہی نہیں سراسیمہ بھی، وہ اس لئے کہ تعریف اپنے ساتھ ذمہ داری

لاتی ہے اور ذمہ داری مواخذہ ۔ آپ جیسے عزیز دوست میری تعریف میں جو کچھ کہیں گے وہ اللہ کی طرف سے دی ہوئی نعمت ہے جس کا خدا حساب مانگے گا!! اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ البتہ بعض باتیں آپ نے ایسی لکھی ہیں جو باوجود کوشش مجھے یاد نہیں آرہی ہیں ۔ لیکن ان پر گفتگو کرنے کا یہ وقت نہیں ۔ انشاء اللہ پھر کبھی ۔

مفتی انتظام اللہ شہابی کی خدمت میں میرا اسلام پہنچائیے ۔

دعاگو ۔ رشید احمد صدیقی ۔

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی

پچھلے مہینہ کراچی سے دو سہ ماہی رسالے وصول ہوئے اور دونوں میں ایک ایک بات حلقہ "صدق" کے لئے قابل ذکر نظر آئی۔ پہلا رسالہ انجمن ترقی اردو کا معلوم ومعروف رسالہ "اردو" بابت اپریل ۶۷ء ہے۔ دوسرا سہ ماہی رسالہ "العلم" جنوری تا مارچ ۱۹۶۷ء ہے جس میں پڑھنے کے قابل وہ تقریر ہے۔ جو زبانی ایک مذاکرہ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ایک شاگرد سید الطاف علی بریلوی نے کی تھی۔ رشید صاحب کی مصوری اور لوگوں نے بھی کی لیکن ان شاگرد رشید کا رنگ سب سے انوکھا اور سب سے چوکھا ہے اور جو لوگ رشید بات سے ذوق رکھتے ہیں ان سب کے پڑھنے کے قابل ہے "صدق" میں اگر یہ مضمون چھپنے کے لئے آتا تو اس کے عنوان کی طرح کچھ یوں پڑتی ۔

اُستاد "رشید" بنظر "الطاف" صدق جدید

تقریر

جناب وائس چانسلر صاحب . خواتین و حضرات - ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے ازراہ مہربانی میرے تعارف میں جس فیاضی سے کام لیا ہے اس کے لئے میں ان کا شکر گذار ہوں . آج کا مذاکرہ جناب پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کے بارے میں ہے . جس میں مجھے بھی اظہار خیال کی دعوت دی گئی ہے . در آں حالیکہ میں رشید صاحب کا ایک نالائق شاگرد ہوں ۱۹۲۸ء میں مجھے موصوف کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا لیکن دوسرے نصابی مضامین کی طرح چونکہ اردو کی درسی کتابوں سے بھی میں دلچسپی نہ لے سکا - اس لئے میرے استاد نے مجھے منہ نہ لگایا . حتیٰ کہ زمانۂ طالب علمی میں معمولی جان پہچان تک نہ ہو سکی تعلیم ختم ہونے کے بعد ۱۹۳۵ء سے جب میرا آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے تعلق ہوا تو اس زمانہ میں البتہ ان سے قریبی رابطہ قائم ہوا مگر اس کی نوعیت بھی کچھ اس طرح کی تھی کہ میرا ایک سلسلۂ مضامین" کانفرنس گزٹ" میں شائع ہونے کے بعد جب میرے معزز دوست ڈاکٹر سراج الحق قریشی نے اس کو "مسلمان کی دنیا" کے نام سے کتابی شکل میں طبع کرایا تو ایک روز رشید صاحب سے ارشاد بک ڈپو میں مڈبھیڑ ہو گئی اور میں نے ان کو یہ نوید سنائی کہ میری کتاب "مسلمان کی دنیا" چھپ گئی ہے تو فوراً بیساختہ فرمایا .

"یہ واقعہ کب پیش آیا ؟"

اس فقرہ کی بلاغت کسی تشریح کی محتاج نہیں ہے . مطلب یہ کہ تم ہو ہی کیا جو تمہاری کتاب کچھ ہو سکتی ہے . اسی طرح جب میں نے سہ ماہی رسالہ "مصنّف" کا اجراء کیا تو ایک صحبت میں رشید صاحب، مسٹر آل احمد سرور اور خواجہ منظور حسین صاحب تینوں نے مل کر مجھ پر اعتراض کیا کہ میں نے یہ کیا مہمل رسالہ نکالا ہے اور کہ علیگڑھ سے جو چیز نکلے وہ اس کے شایان شان ہونی چاہیئے .

الغرض میرا اور رشید صاحب کا عرصہ تک اسی قسم کا معاملہ رہا لیکن میں جانتا تھا کہ ان کو میری اصلاح مقصود ہے۔ چنانچہ میری تحریر میں ان کے نقطۂ نظر سے جب روانی آگئی تو انھوں نے میری قدر دانی میں بھی بخل سے کام نہ لیا اور اعتماد کی بعض ایسی منزلیں بھی آئیں کہ مثلاً نواب سر احمد سعید خاں بہادر آف چھتاری نے اپنی خود نوشت سوانح عمری تیار کی اور رشید صاحب کو بغرض نظر ثانی دی تو موصوف نے میرے غریب خانہ پر خود تشریف لا کر نواب صاحب کا مسودہ میرے حوالہ کر دیا اور جو کام وہ خود کرتے مجھ سے کرایا۔ رسالہ "مصنف" اور "مجلس مصنفین" سے بھی ان کا شغف رفتہ رفتہ بڑھ گیا۔ قریب قریب ہر مجلس میں وہ خود اور ان کے حوارئین شعبۂ اردو ذوق و شوق کے ساتھ شرکت فرماتے اور جب ان کا نمبر آتا تو دعوت بھی کرتے اور مضامین و مقالات بھی مرحمت فرماتے۔

مجلس مصنفین کا ذکر آیا ہے تو ایک لطیفہ سنیئے کہ ایک مجلس میں ایک ایسے عالم نے جو بہت بڑے فلسفی اور منطقی بھی تھے (۵۱) فل اسکیپ صفحات پر لکھا ہوا تحقیقی مقالہ بعنوان "مسئلہ علم قرآن کی روشنی میں" پڑھا، پورے سوا دو گھنٹے میں مقالہ ختم ہوا جس کے بعد حسب دستور حاضرین سے اس پر تبصرہ کرنے کی فرمائش کی گئی۔ سب سے پہلے مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی (نواب صدر یار جنگ بہادر) سے گذارش کی گئی کہ کچھ اظہار خیال کریں۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ "جب صاحبِ مقالہ ہی اپنے مقالہ کو نہیں سمجھے تو میں کیا سمجھا جو اس پر کچھ کہوں۔" نواب صاحب کے بعد رشید صاحب سے عرض کیا گیا کہ آپ کچھ فرمائیے۔ جس پر وہ بولے کہ "آج مجلس مصنفین مجلس مصنفین ہو گئی ہے۔" سب حاضرین ہنس پڑے اور پوری محفل زعفران زار بن گئی۔

جناب پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کی سب سے پہلے مجھے یونیورسٹی کی ۱۹۲۵ء میں گولڈن جوبلی کے موقع پر زیارت ہوئی۔ مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں یہ سب سے بڑا اور سب سے زیادہ نمائندہ قومی اجتماع تھا۔ ایک ہفتہ کے پروگرام میں ڈائس پر آل انڈیا بلکہ بین الاقوامی شہرت کے مالک اکابر تشریف فرما ہوتے اور ان کے رعب ووقار کے باعث مشکل سے کسی کی ہمت ہوتی تھی کہ ڈائس پر قدم رکھے لیکن دو دُبلے پتلے اور انتہائی سادہ کپڑوں میں ملبوس شخص لمحہ بہ لمحہ ڈائس پر چڑھتے اترتے نظر آتے اور بڑے بڑے مشاہیر سے سرگوشیاں کرتے دکھائی دیتے تھے میں نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون ہیں جو اس آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ ہر بڑے آدمی سے باتیں کر رہے ہیں تو بتایا گیا کہ ان میں سے ایک مولانا سید طفیل احمد منگلوری اور دوسرے پروفیسر رشید احمد صدیقی ہیں۔ اس کے بعد ۱۹۵۰ء تک میں نے علی گڑھ میں یہ مسلسل دیکھا کہ کوئی سی بھی علمی، تعلیمی اور انتظامی صحبت برپا ہو رشید صاحب کے بغیر مکمل نہ سمجھی جاتی تھی اور ان کا ہنس مکھ چہرہ اور دل آویز شخصیت ہر مقام پر کارفرما نظر آتی تھی۔

دُبلے پتلے اور کمزور صحت ہونے کے باوجود میں نے ان کے صبر و استقلال، قوتِ برداشت اور ہمت وجرأت کا بھی یہ منظر دیکھا کہ ان کے گردہ کے بہت سخت آپریشن ہوئے اور مدتوں ان کی زندگی تلوار کی دھار پر رہی۔ اتنا گہرا اور بڑا زخم تھا کہ ان کے حبیب لبیب پروفیسر حمیدالدین خاں ٹارچ کی مدد سے اس میں روشنی کر کے جیسے کسی سُرنگ کو دیکھا جاتا ہے، روزانہ ڈریسنگ کرتے تھے۔ اسی تکلیف کے عالم میں تاوقتیکہ بالکل مجبور نہ ہو جاتے۔ سائیکل رکشہ میں بیٹھ کر اور تکیوں کا سہارا لے کر وہ کلاس

پڑھانے تشریف لاتے۔ شدید کرب و بے چینی کے عالم میں ایسی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی کے ساتھ غالبؔ کے اشعار کی تشریح کرتے کہ اس کا آج تک دل پر گہرا نقش ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس ہولناک مصیبت سے بالآخر انہیں نجات ملی اور وہ مثل سابق ٹینس کھیلنے لگے جس کا انہیں بہت شوق تھا۔

رشید صاحب کے متعلق عام طور پر مشہور ہے کہ وہ بہت کم آمیز اور تنہائی پسند آدمی ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ انہوں نے لکھا کہ "میں اس آدمی سے بہت خوش رہتا تھا جو مجھ سے کم سے کم ملتا" ان کا ایک مخصوص حلقۂ احباب تھا جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، علامہ سید سلیمان ندوی، اصغر گونڈوی، سہیل اعظم گڑھی، جگر مراد آبادی، مولانا سید سلیمان اشرف، نواب صاحب چھتاری، سید نصیر الدین علوی، پروفیسر حمید الدین خاں، ڈاکٹر محمد اصغر، مولانا ابوبکر شیث، ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں، مولوی اکرام اللہ خاں ندوی، محمد ایوب عباسی، پروفیسر محمد حاذق اور شفاء الملک حکیم عبد الطیف وغیرہ شامل تھے۔ ان اصحاب سے وہ کھل کر ملتے۔ ان کے مکانات پر جا کر کافی وقت گذارتے۔ اور خود اپنے مکان پر بھی نہایت خوشدلی اور خاطر و تواضع سے پیش آتے۔ باقی ساری دنیا سے وہ دور دور رہتے۔ عام شعراء سے ان کی بیزاری تو ضرب المثل بن گئی تھی۔ اسی طرح دوسرے اور تیسرے درجہ کے نثر نگاروں اور مصنفین سے ان کو بلا کی وحشت ہوتی تھی۔ کسی قیمت پر اپنا قیمتی وقت انہیں دینے کو تیار نہ ہوتے۔ انہوں نے اپنا مکان بھی طلسماتی قسم کا بنوایا تھا جس کے زنان خانہ میں راحت و آرام کے جملہ سامان مہیا تھے حتیٰ کہ ٹینس کورٹ بھی تھا اور ورانڈہ اتنا لمبا چوڑا تھا کہ اس میں ان کے بچے اطمینان سے اسکیٹنگ کرتے تھے۔ اس زنانہ حصّہ کے کون سے کمرہ میں وہ

خود بیٹھتے اور کام کرتے تھے یا کن کمروں میں وہ اپنے متذکرۂ بالا مہمانوں کو ٹھہراتے اور پر تکلف دعوتیں دیتے تھے۔ ایسے سربستہ راز تھے کہ کم از کم مجھے تو متعدد بار ان کے مکان کے اندر جانے کے باوجود بھی کچھ پتہ نہ چل سکا۔ مردانہ حصہ اس کے برعکس اس شان کا تھا کہ چبوترہ نما ایک چیز پر چھپر پڑا ہوا تھا۔ کچا فرش، چند بانس کی کھٹیاں اور دو چار ٹوٹے ہوئے مونڈھے۔ مردانے کے کھلے صحن میں پھولوں کی چمن بندی اور لان وغیرہ کے بجائے بُری بُری صورت کی ترکاریاں، مثل بیگن، گوبھی اور ٹنڈے وغیرہ بو دیے گئے تھے۔ چھپر کے نیچے ایک کھٹیا پر عزیزی احسان میاں (ڈاکٹر احسان رشید ایم اے، پی، ایچ، ڈی) بیٹھے یا لیٹے ہوئے مصروف مطالعہ نظر آتے تھے اور شہید ملت خان لیاقت علی خاں سے ملاقات کرانے کے سلسلہ میں نواب صدیق علی خاں صاحب کی طرح ان کی خاص ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ کسی غیر ضروری آدمی کو رشید صاحب سے نہ ملنے دیں اور خوش اخلاقی کے ساتھ اس کو نو دو گیارہ کر دیں۔

ایک دل چسپ واقعہ خود میرے ساتھ پیش آیا کہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے جب وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے "انٹر یونیورسٹی بورڈ" کے ایک کام کے سلسلہ میں مجھے رشید صاحب کے پاس بھیجا۔ اس وقت احسان میاں موجود نہ تھے۔ لہٰذا میں نے دروازہ کھٹکھٹا کر اپنی آمد کی اطلاع دی۔ ایک ملازمہ برآمد ہوئی جسے میں نے اپنا نام بتایا۔ تھوڑی دیر میں وہ واپس آئی اور کہا کہ پروفیسر صاحب موجود نہیں ہیں۔ میں نے اُن کے بیان کو باور کر لیا اور کہا کہ ذرا ٹھہرو۔ میں ایک پرچہ لکھ کر دیتا ہوں جس وقت رشید صاحب تشریف لائیں ان کو دے دینا۔ یہ کہہ کر میں ایک

مونڈھے پر بیٹھ گیا اور ذاکر صاحب کا پیغام لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اسی دوران ڈاکٹر محمد اصغر صاحب تشریف لائے جن کو دیکھتے ہی ملازمہ مکان کے اندر گئی اور پھر کیا دیکھتا ہوں کہ رشید صاحب مسکراتے ہوئے باہر چلے آ رہے ہیں، اب جو انہوں نے مجھے اور میں نے ان کو دیکھا تو بس مزا ہی تو آ گیا۔

اشخاص کی طرح رشید صاحب دوسرے اور تیسرے درجہ کی نثری کتابوں اور مجموعہ ہائے کلام کے مطالعہ سے بھی گریز کرتے تھے۔ اگر کوئی مصیبت کا مارا ادیب یا شاعر بغرض نقد و تبصرہ یا بالفاظ دیگر برائے حصولِ تحسین اپنی کوئی تخلیق ان کے سر ہی منڈھ دیتا تو اس کو وہ پہلی فرصت میں کسی دوسرے "اہل" آدمی کے حوالے کر دیتے تھے۔ اسی قبیل کا ایک قصہ سنیئے کہ ایبٹ روڈ لکھنؤ کے فٹ پاتھ پر میں کسی ضرورت سے جا رہا تھا۔ اتنے میں، میں نے دیکھا کہ برابر کی گلی سے ایک تیز تانگہ پر جناب رشید صاحب چلے آ رہے ہیں۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی تانگہ کو رکوایا اور جوں ہی میں قریب گیا تو ایک کتاب جو ان کے ہاتھ میں تھی میرے ہاتھ میں تھما کر تانگہ کو اسی سابقہ تیز رفتاری سے چلوا دیا اور "آناً فاناً" نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں حیرت زدہ سلام و مزاج پرسی تک نہ کر سکا۔ کتاب کو دیکھا تو وہ کسی شاعر کا مجموعہ کلام تھا جس کو اس نے نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ رشید صاحب کی خدمت میں "باستدعائے تبصرہ" پیش کیا تھا۔ رشید صاحب کے لئے یہ کتاب وبال جان بنی ہوئی تھی جوں ہی پہلی فرصت میں مجھ جیسا "اہل" آدمی ان کی زد پر آیا۔ انہوں نے اس کے سر ڈال کر سبکدوشی حاصل کر لی۔ یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ وہ شاعروں سے بہت گھبراتے ہیں اور جوں ہی کسی شاعر نے کلام سنانے

کے لئے اپنی بیاض نکالی تو وہ اس کو طمنچہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

علی گڑھ کے بزرگ عام طور پر رشید صاحب کو بڑا کام ٹالو اور سست و کاہل انسان سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ کل ہند انجمن ترقی اردو کی شاخ علی گڑھ میں قائم ہوئی اور رشید صاحب "بالاتفاق آرا" اس کے سکریٹری منتخب ہوئے تو اسی سستی اور کاہلی کے تصور کے تحت مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے نہایت لطیف احتجاج کرتے ہوئے فرمایا کہ "ان کو ناحق سکریٹری بنایا یہ تو انجمن کو بھی اپنے ساتھ چادر اوڑھا کر گہری نیند سو جائیں گے۔"

لیکن ناقدین ... ئے ہیں رشید صاحب کی زندگی کے مذکورۂ بالا مشتے نمونہ از خروارے واقعات سے ان کی کم آمیزی یا مردم بیزاری وغیرہ کی جو کیفیت ظاہر ہوتی ہے اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے قیمتی اوقات کو فضول کاموں میں صرف ... ہیں چاہتے تھے اور اپنی تمام ذہنی، دماغی، جسمانی اور روحانی صلاحیتوں اور توانائیوں کو اپنے آرٹ اور فن کے لئے بچا بچا کر رکھتے تھے۔ ہر وہ چیز اور کام جو طبیعت پر گراں گذرے اور اس سے ان کی صلاحیتِ کار پر مضر اثر پڑنے کا امکان ہو اس سے وہ اپنے آپ کو دور رکھتے تھے۔

طبیعت میں بلا کی، امن پسندی اور ہر طرح کے رگڑے جھگڑے سے علیحدہ رہنا بھی ان کے کردار کی نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ عرض کروں کہ ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا مسلم یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں سہ روزہ سالانہ اجلاس تھا۔ شعبۂ اردو کی صدارت بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے فرمائی۔ اور وہ ان دنوں چونکہ کسی وجہ سے رشید صاحب سے ناراض تھے لہٰذا

اپنے خطبۂ صدارت میں انہوں نے ان پر اور ان کے شعبۂ اردو پر بہت کڑی نکتہ چینی کی۔ تہلکہ خیز اعتراضات کی بھرمار کردی۔ ہم علی گڑھ کے لوگوں کو اپنی علی گڑھی عصبیت کے تحت اس پر بڑا غصہ آیا اور ہم لوگوں نے مولوی صاحب مرحوم سے بدلہ لینے کا یہ منصوبہ بنایا کہ پیلی بھیت (یو، پی) میں جلد ہی منعقد ہونے والی پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جس کے صدر نواب جمشید علی خاں آف باغپت ایم، ایل اے مرحوم تھے، اس میں شعبۂ اردو کی صدارت کے لئے ہم لوگ رشید صاحب کو بنا چنا کرلے گئے اور ان سے اصرار کیا کہ اپنے خطبۂ صدارت میں جی بھر کر مولوی صاحب کی خبر لیں، لیکن جب رشید صاحب نے اپنا خطبہ پڑھا تو اس میں مولوی صاحب کے خلاف ایک لفظ بھی نہ تھا بلکہ ان کی اردو کی ملک گیر خدمات کی تعریف و توصیف میں پورا زور قلم صرف کر دیا تھا۔ آپ رشید صاحب کی اس بات کو اونچی شرافت اور بھل مانسی پر محمول کریں گے جو یقینی تھی لیکن میں پھر بھی عرض کروں گا کہ دراصل وہ جھگڑے کو بڑھا کر اپنے اوقاتِ عزیز اور ذہنی توانائیوں کو ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔

جہاں تک میرا اندازہ ہے رشید صاحب کو روپے پیسے کا لالچ نہیں تھا۔ ساری زندگی قناعت اور متوسط الحالی میں گذاری۔ اپنی تصانیف سے بھی کوئی قابل ذکر مالی منفعت حاصل نہیں کی ۱۹۴۶ء کا ذکر ہے حیدر آباد دکن میں نفیس اکیڈمی کے مالک مسٹر اقبال سلیم گاہندری نے مجھ سے بااصرار فرمائش کی کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کی کوئی تصنیف ان کے لئے حاصل کروں۔ علیگڑھ واپس آکر جب میں نے رشید صاحب سے اس کا ذکر کیا تو فرمایا: "اجی ہٹاؤ بھی، میں اس جھنجھٹ میں نہیں پڑتا۔" اس دوران گاہندری صاحب کے میرے پاس یاد دہانی کے برابر خط آتے رہے، جس کی بنا پر ایک روز مجھے خیال آیا کہ رشید صاحب

کی قریب قریب تمام کتابیں ان کے اُن متفرق مضامین کا مجموعہ ہیں جو وقتاً فوقتاً "علیگڑھ میگزین اور کانفرنس گزٹ وغیرہ میں پہلے چھپ چکے تھے لیکن مشہور رسالہ "سہیل" علی گڑھ میں ان کے جو اداریئے وغیرہ شائع ہوئے ہیں ان سے اب تک کوئی کام نہیں لیا گیا ہے. لہٰذا کیوں نہ اُن سے ایک کتاب کھڑی کر دی جائے، مگر دشواری یہ پیش آئی کہ "سہیل" کا مکمل فائل نہ علیگڑھ کی کسی لائبریری میں تھا اور نہ شعبہ اردو میں اور نہ خود رشید صاحب کے پاس. اب اسے اتفاق کہیئے کہ میرے دفتر کانفرنس میں جو دفتری تھا وہ سہیل کے زمانۂ اشاعت ۲۷-۱۹۲۶ء اور ۳۶ء میں مسلم یونیورسٹی پریس میں جلد بندی کا کام کرتا تھا اور جب رسالہ چھپ چھپا کر تیار ہو جاتا تو وہ اس کا ایک ایک پرچہ چُرا کر اپنے گھر لے جاتا تھا اور اس کے پاس سب شمارے محفوظ تھے. ایک دن اس نے مجھے "سہیل" کی تلاش میں متفکر پایا تو کہنے لگا کہ "صاحب میں آپ کو سب پرچے لا کر دے سکتا ہوں آپ مجھے کیا دیں گے." میں نے حاتم کی قبر پر لات مارتے ہوئے اس کو ایک روپیہ فی پرچے کا آفر دے دیا اور اس نے خوشی خوشی سہیل کے وہ ساتوں ضخیم شمارے جو شائع ہوئے تھے میرے حوالے کر دیئے. پرچے ہاتھ لگتے ہی میں نے جھٹ پٹ ان میں سے اداریوں کے حصوں کو علیحدہ کر کے اور انہیں یکجا کر کے اس مجموعہ کا نام "سہیل کی سرگزشت" قرار دے دیا. ان ہی دنوں حضرت مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی بھی جن سے رشید صاحب کی ۱۹۲۱ء سے پر لطف ملاقات تھی. میرے پاس ٹھہرے ہوئے تھے لہٰذا ان کو میں نے کتاب کا مقدمہ لکھنے پر لگا دیا مفتی صاحب نے بھی میری طرح قلم سے کم اور قینچی سے زیادہ کام لیا. اس زمانہ میں زندہ ادیبوں نے اپنے کو (خدانخواستہ) مرا ہوا قرار دے کر اور گویا عالم برزخ سے اپنی اپنی آپ بیتیاں آل انڈیا ریڈیو دلّی سے بعنوان "اپنی یاد میں" نشر کرنے کا سلسلہ

شروع کر رکھا تھا۔ رشید صاحب نے بھی اسی قسم کی اپنی ایک آپ بیتی کچھ عرصہ پہلے نثر کی تھی جو چھپ بھی گئی تھی۔ اس آپ بیتی کو من وعن مفتی صاحب نے اپنے مقدمہ میں انڈیل دیا اور اس طرح وہ خاصہ کی چیز بن گیا۔ ان کاموں کے بعد میں نے اقبال سلیم گاہندری کو یہ ساری کہانی لکھ کر دریافت کیا کہ کیا اس چیز سے آپ کا کام بن جائے گا؟ فوراً تار سے جواب آیا کہ مسودہ کا پانچ سو روپے کا وی پی کر دیجئے جس کی بلاتاخیر تعمیل کی گئی اور جب روپے آگئے تو میں ان کو لے کر جناب رشید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ موصوف میری داستان سن کر اور روپے دیکھ کر بہت لطف اندوز ہوئے لیکن فرمایا کہ بھئی یہ روپے میں نہیں لوں گا۔ تمہاری کارگزاری ہے تم ہی لے لو۔ میں نے کہا کہ میں اس شرط پر انہیں قبول کروں گا کہ آپ ان کو اپنی طرف سے "بیت المصنف" کے لئے عطیہ قرار دینے کی تحریر دے دیں۔ چنانچہ تحریر ہو گئی اور میں نے انصاف سے کام لے کر سو روپے تو حضرت مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کو بطور صلۂ مقدمہ نگاری نذر کئے اور چار سو روپے سے حضرت نواب صدر یار جنگ، بہادر کے کتب خانہ کی چند نادر کتابوں کو نقل کرانے کی اجرت ادا کر دی جو مجھ پر واجب تھی۔ جس زمانہ میں رشید صاحب نے پانچ سو روپے کی یہ رقم لینے سے انکار کیا اس وقت روپیہ کی قیمت بہت زیادہ تھی اور موجودہ زمانہ کے انہیں کم از کم تین ہزار کے برابر سمجھنا چاہیئے۔ یہ واقعہ رشید صاحب کی فراخدلی، فیاضی اور روپیہ سے محبت نہ ہونے کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ اپنی پرائیویٹ زندگی میں اور کس کس طرح انہوں نے دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ رحمی سلوک کئے ہوں گے ان کا اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ ایک مختصر سی صحبت میں جناب پروفیسر رشید احمد صدیقی کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنا اور ان کے آرٹ اور فن کا تفصیلی جائزہ

لینا محال ہے۔ علاوہ بریں اپنے سے زیادہ واقف کار حضرات کے مقابلہ میں اپنے آپ کو میں اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ تاہم آخر میں اپنے ایک خاص تاثر کا اظہار میرے لئے ناگزیر ہے۔ آپ نے عربی کے معجز نما شاعر متنبیؔ کا نام سنا ہو گا اس نے اپنے عہد کے حکمرانوں بالخصوص سیف الدولہ بادشاہ حلب (۹۴۴ء تا ۹۶۷ء) کے لئے جیسے لافانی قصائد لکھے ہیں ان کی تاریخی اہمیت آپ سے پوشیدہ نہیں ہے متنبیؔ نو سال تک سیف الدولہ کی لاجواب مداحی کرتا رہا جس میں اس کی فتوحات، مجاہدات، ذاتی کردار، منصفانہ طرز حکمرانی اور بذل وسخا کے گن گائے ہیں لیکن جب اس کی اور اس کے ممدوح کی شہرت تمام عالم اسلامی میں گاؤں گاؤں اور گھر گھر پہنچ گئی تو اس کے حاسد بھی بکثرت پیدا ہو گئے اور اس کے خلاف سنگین سازشیں رونما ہونے لگیں جن کی بنا پر وہ سیف الدولہ کے یہاں سے فرار ہو کر اس کے ہم عصر کافور بن عبداللہ اخشیدی والیٔ مصر و شام و حجاز کے پاس چلا گیا۔ یہ کافور نہایت بدصورت اور ذوق شعری سے عاری تھا۔ اس لئے اس نے متنبیؔ کو اپنے پاس ایک آزاد قیدی بنا کر رکھ لیا۔ یہ صورت حال متنبیؔ کے لئے بڑی پریشانی کا باعث بن گئی۔ ساڑھے چار سال بہ جبر و اکراہ کافور کے پاس گذرے اور بالآخر ایک روز خفیہ طریقہ پر حدود مصر و حجاز سے ناقابل گذر خوفناک پہاڑوں اور جنگلوں کے راستہ چل کر کوفہ پہنچ گیا۔ کوفہ میں اس کی آمد کی شہرت ہوئی تو شاہ مشرق رکن الدولہ کے وزیر ابن العمید نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ انعام واکرام سے نوازا، سیف الدولہ کو اطلاع ملی تو اس نے بھی نہایت قیمتی تحائف خاص اپنے لڑکے کے ہاتھ بھیج کر اسے اپنے حضور میں دوبارہ طلب کیا مگر عین اسی وقت وہ عضد الدولہ کی توجہ کا مرکز بن چکا تھا جس نے اسے شیراز بلا کر اس کی انتہا درجہ قدر دانی کی اور اس کے قصائد پر بہت کچھ فخر کیا۔

متنبّی کے اس ذکر سے یہ نتیجہ نکالنا مقصود ہے کہ زمانۂ قدیم میں جب کہ نشر و اشاعت کے ذرائع صفر کے برابر تھے۔ نہ اخبارات تھے، نہ ریڈیو اور نہ ٹیلی ویژن وغیرہ تو بادشاہوں اور حکمرانوں کے کارناموں کے پروپیگنڈے کا واحد ذریعہ باکمال شعراء اور ان کے قصائد ہی تھے جو ان کو عالمگیر شہرت کا مالک بناتے تھے۔ دوسری مثال شیخ سعدیؒ کی ہے کہ انہوں نے ابوبکر سعد بن زنگی کے لیے جو لکھ دیا اس نے اس کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ آج کی دنیا میں مذکورہ حکمرانوں کی شعراء کے لئے فیاضیوں کو ہم غلط بخششوں سے تعبیر کرتے ہیں اور خود قصائد کو لغو وفضول چیز تصور کرتے ہیں مگر جیسا کہ عرض کیا گیا پروپیگنڈا کے نقطۂ نظر سے جو لازمۂ حکمرانی ہے ان کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

بعینہٖ ایم اے او کالج اور مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کی قلمی کاوشوں کا آپ تجزیہ کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ایسے وقت میں جب کہ مسلمانان ہند کے پاس نہ اپنا پریس تھا اور نہ ریڈیو تک ان کی رسائی تھی۔ اس وقت رشید صاحب کی جادو نگاری نے اس کمی کی تلافی کی۔ ان کی تحریروں کی اثر انگیزی علیگڑھ کے معاملہ میں لازوال ہے۔ انہوں نے اپنے دارالعلوم کو اپنا ممدوح قرار دے کر اس کی چھوٹی سے چھوٹی چیز اور بے آب وگیاہ چٹیل میدانوں نیز کچی بارک گل منزل جیسے تھرڈ کلاس ہوسٹل کی شبانہ روز کی زندگی کو جیسے جیسے دل آویز طریقوں سے بیان کیا ہے اور علیگڑھ کے اکابر نیز دوسرے باکمالوں کو اپنے زور قلم سے جیسی جیسی بڑائیاں بخشی ہیں ان کو کبھی فراموش نہ کیا جا سکے گا۔

جس طرح متنبی جب تک کافور کی نظر بندی میں رہا سیف الدولہ اس کی ثنا خوانیوں سے محروم رہا۔ اسی طرح آج رشید احمد صدیقی علی گڑھ کی دنیا میں انقلاب برپا ہو جانے کے بعد سے وہاں محدود و مجبور ہو کر رہ گئے ہیں۔

کاش وہ کسی طرح پاکستان آجاتے اور جس طرح سرزمین بغداد و ایران متنبی کی قلمی ضیا باریوں سے جگمگا اٹھا اسی طرح رشید صاحب کی وجہ سے پاکستان کی علمی وادبی دنیا میں زندگی اور زندہ دلی کی ایک تازہ لہر آجاتی۔

اُٹھ کہ خورشید کا سامان سفر پیدا کریں
نفسِ سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

(اقبال)

سید الطاف علی بریلوی (علیگ)
۲۳ فروری ۱۹۶۷ء

مطبوعاتِ

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

نظامتِ تعلیمات (ڈائرکٹریٹ آف ایجوکیشن)

کراچی سے منظور شدہ کتابیں

— نثر —

اگلشنِ بے خار مصنفہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ .. .. ۲۴ روپئے

۲. رومن رسم الخط اور پاکستان۔ مصنفہ مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی ندوی ۱ روپیہ

۳. قدیم شہنشاہیاں۔ مصنفہ مولانا سید طفیل احمد منگلوری (علیگ) ۶ روپئے

۴. نقدِ ادب۔ مترجمہ۔ ل احمد اکبر آبادی ۶ روپے

۵. سرسید کا علمی کارنامہ۔ مصنفہ۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی ۳ روپے

۶. اردو زبان اور اسالیب۔ مصنفہ سید محمد محمود رضوی مخمور اکبر آبادی ۱۸ روپئے

۷. مشرقی و مغربی تہذیب۔ مصنفہ ڈاکٹر احسان محمد خاں ایم اے پی ایچ ڈی (لیڈز) قیمت .. .. ۶ روپئے

۸. راہی اور راہ نما۔ مصنفہ۔ سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۱۲ روپے

۹. ثقافت و انتشار۔ مترجمہ۔ اخلاص حسین زبیری ایم اے و انعام عظیم برنی ایم اے قیمت .. .. .. ۱۲ روپیہ

۱۰۔ **طالب علم کی ڈائری**۔ مصنفہ
سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۶ روپئے

۱۱۔ **مسلم خواتین کی تعلیم**۔ مصنفہ محمد امین
زبیری .. .. .. ۴ روپئے

۱۲۔ **نواب خان بہادر خاں شہید**۔ مصنفہ
سید مصطفےٰ علی بریلوی بی کام ایل ایل بی ۸ روپئے

۱۳۔ **عہد بنگش کی علمی سیاسی**۔ مصنفہ
اور ثقافتی تاریخ مفتی ولی اللہ
فرخ آبادی۔ مترجمہ حکیم شریف الزماں شریف
اکبر آبادی .. .. .. ۲۴ روپئے

۱۴۔ **اصولِ تدریس**۔ مترجمہ اخلاص حسین
زبیری ایم۔ اے ۱۰ روپئے

۱۵۔ **ہندوؤں کی تعلیم**۔ مؤلفہ۔ علامہ
مسلمانوں کے عہد میں سید
سلیمان ندوی .. .. ۵ روپئے

۱۶۔ **مشاہیر کے تعلیمی نظریئے**۔ مصنفہ
محمد حسین خاں زبیری ایم اے ۸ روپئے

۱۷۔ **پر اسرار کائنات**۔ مترجمہ۔ سید
محمد تقی ایڈیٹر "جنگ" ۱۲ روپئے

۱۸۔ **مفکرینِ تعلیم**۔ مصنفہ پروفیسر ضیاء الدین احمد
۱۴ روپئے

۱۹۔ **اصول واساسِ تعلیم**۔ مترجمہ۔ انعام
عظیم برنی ایم اے اخلاص حسین زبیری ایم اے
وغیرہ .. .. .. ۱۴ روپئے

۲۰۔ **تعلیمی نفسیات کا**۔ مصنفہ پروفیسر وحید الحق
بنیادی خاکہ صدیقی سابق پرنسپل
ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۸ روپئے

۲۱۔ **عظیم علمائے نفسیات**۔ مترجمہ۔
پروفیسر عبدالمجید قریشی ۲۴ روپئے

۲۲۔ **مادری زبان کی تعلیم**۔ مصنفہ۔
پروفیسر یونس حسن فروغ علوی ایم اے
قیمت .. .. .. ۶ روپئے

۲۳۔ **جان ڈیوی کا فلسفۂ تعلیم**۔ مترجمہ
سید عین الدین علوی ایم اے (علیگ) ۵ روپئے

۲۴۔ **تعلیمی مسائل پس منظر و پیش منظر**۔ مصنفہ
سید الطاف علی بریلوی بی۔ اے (علیگ) ۱۶ روپئے

۲۵۔ **مقاصدِ تعلیم**۔ مترجمہ سید محمد تقی
ایڈیٹر "جنگ" ۱۲ روپئے

۲۶۔ **ارتقائے انسانی**۔ مصنفہ سید
(موجودہ سائنس کی روشنی میں) طفیل احمد
منگلوری (علیگ) ۴ روپئے

۲۷۔ چند عظیم علمائے جراثیم۔ مرجمہ پروفیسر عبدالمجید قریشی ۲۰ روپئے

۲۸۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم۔ مصنفہ پروفیسر سعید احمد رفیق ایم اے ۶ روپئے

۲۹۔ خط و خطاطی۔ مصنفہ شیخ ممتاز حسین جونپوری ۳ روپئے

۳۰۔ جمہوریت اور تعلیم۔ مترجمہ سید محمد تقی جلد اول ایڈیٹر "جنگ" ۲۰ روپئے

۳۱۔ جمہوریت اور تعلیم۔ مترجمہ سید محمد تقی جلد دوم ایڈیٹر "جنگ" ۱۵ روپئے

۳۲۔ انگریزوں کی لسانی پالیسی۔ مصنفہ سید مصطفٰے علی بریلوی بی کام ایل ایل بی ۱۶ روپئے

۳۳۔ بچہ کا ذہنی و نفسیاتی ارتقاء۔ مرتبہ اخلاص حسین زبیری ایم اے و پروفیسر وحید الحق صدیقی۔۔ ۔۔ ۔۔ ۱۴ روپئے

۳۴۔ تعلیم و تربیت۔ مصنفہ ضیاء الدین احمد برنی۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۱۰ روپئے

۳۵۔ سائنس کے کرشمے۔ مصنفہ مسرور احمد توقیر ایم اے۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۸ روپئے

۳۶۔ علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں۔ مرتبہ سید الطاف علی بریلوی بی۔ اے (علیگ) و پروفیسر محمد ایوب قادری ایم اے قیمت۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۲۴ روپئے

۳۷۔ ان کہی کہانیاں۔ مصنفہ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی ۴ روپئے

۳۸۔ صوفیائے بہار اور اردو۔ از پروفیسر معین الدین دردائی ایم۔ اے (علیگ) قیمت۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۸ روپئے

حوالجات منظوری

+1. NO-D-1-G.S./A(12164)/67 DATED 28.5.1967.

+2. NO.D.E/F-PUB/(126)/7820-8170)/6C DATED 20.5.1969.

+3. NO.D.F.F-PUB/(11-A)/(1306-1630)/72 DATED 8.1.1972.

۳۹۔ مولانا غلام یحییٰ ہزاروی ۔ از
اشتیاق حسین اظہر ایم اے ۸ روپئے

۴۰۔ نظام مصطفےٰ صلعم کیا ہے؟ از
جسٹس قدیرالدین احمد ۲ روپئے

۴۱۔ تاریخِ شاہ عالم ۔ مترجمہ۔ ثناءالحق
صدیقی۔ ایم۔اے ۲۲ روپئے

۴۲۔ مسلمانانِ کراچی و ۔ تالیف۔ سید
سندھ کی تعلیم مصطفےٰ علی
بریلوی بی کام ایل ایل بی۔ مقدمہ۔ مرزا
علی اظہر برلاس بی اے بی ایل ۱۰ روپئے

۴۳۔ تعلیم و تعلم ۔ مرتبہ۔ سید الطاف علی
بریلوی بی اے (علیگ)، مقدمہ سید
عبدالقدوس ہاشمی ندوی ۱۴ روپئے

۴۴۔ تعلیم بالغان اور ۔ تصنیف۔ مولوی
اُس کی قومی اہمیت مظہر الرحمان
بچھرایونی۔ مقدمہ۔ پروفیسر ڈاکٹر محمود حسین
پی ایچ ڈی ۶ روپئے

۴۵۔ تعلیم کے ابتدائی اصول ۔ تصنیف
(حصہ اول) ڈاکٹر
محمد رفیع الدین ایم اے پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ
مترجمہ مولوی سبطین احمد بدایونی ۔ ۱۰ روپئے

۴۶۔ تعلیم کے ابتدائی اصول (تصنیف
(حصہ دوم) ڈاکٹر
محمد رفیع الدین ایم اے پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ
مترجمہ مولوی سبطین احمد بدایونی ۱۰ روپئے

۴۷۔ پاک و ہند میں تعلیمی ترقی۔ مترجمہ
سید احسن مارہروی ایم اے (علیگ) ۵ روپئے

۴۸۔ اقبال کے تعلیمی نظریات۔ تصنیف
محمد احمد صدیقی بی اے (آنرز) ایم اے بی ٹی
(علیگ)، و اخلاص حسین زبیری ایم اے ۱۶ روپئے

۴۹۔ ہسٹری آف ایجوکیشن ۔ تصنیف
(بزبان انگریزی) پروفیسر محمد حامی الدین
(جلد اول ۱۷۱۲ء تا ۱۷۵۰ء) خاں ایم اے ۲۴ روپئے

۵۰۔ رفقائے عظیم (گریٹ کمپینینس۔
تصنیف میکس ایسٹ مین۔ مترجمہ پروفیسر
محمد حامی الدین خاں ایم اے (علیگ) ۲۰ روپئے

۵۱۔ حیاتِ مابعد۔ تصنیف سید ضامن حسین
نقوی گویا جہاں آبادی۔ مقدمہ۔ ڈاکٹر

ایم۔ ایم احمد چیرمین شعبۂ فلاسفی کراچی یونیورسٹی
قیمت .. .. ۵ روپے

۵۲۔ تجددِ امثال۔ تصنیف سید ضامن حسین نقوی گویا جہاں آبادی۔ بمقدمہ ڈاکٹر ایم ایم احمد ایم اے پی ایچ ڈی ۴ روپے

۵۳۔ مقدرِ انسانی (ہیومن ڈسٹنی) تصنیف لی کامت دو نوائے مترجمہ پروفیسر عبدالمجید قریشی (علیگ) ۱۶ روپے

۵۴۔ یادیں اور خاکے۔ تصنیف سیدہ انیس فاطمہ بریلوی۔ بمقدمہ پروفیسر ڈاکٹر شوکت سبزواری ایم اے پی ایچ ڈی ۶ روپے

۵۵۔ پاکستان کا معاشی پس منظر۔ تصنیف سیدہ انیس فاطمہ بریلوی پیش لفظ ڈاکٹر سید ظہیر الدین ایم اے ڈی لٹ ۷ روپے

۵۶۔ مولانا محمد علی جوہر۔ حیات اور تعلیمی نظریات۔ مصنفہ ثناء الحق صدیقی ایم اے ۸ روپے

۵۷۔ مسلمانانِ پنجاب کی تعلیم۔ مصنفہ سید مصطفےٰ اعلی بریلوی بی کام ایل ایل بی ۲۰ روپے

۵۸۔ تجزیہ کلام غالب۔ مصنفہ سید رفیع الدین بلخی ایڈووکیٹ ۱۲ روپے

۵۹۔ ادب منزل بمنزل۔ مصنفہ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی بمقدمہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ایم اے پی ایچ ڈی ۱۲ روپے

۶۰۔ مکاشفاتِ کشفی۔ مصنفہ میجر خان بہادر مرزا ابوجعفر کشفی پیش لفظ۔ خان بہادر رضا علی وحشت۔ تعارف و تبصرہ سید الطاف علی بریلوی و پروفیسر جمیل مظہری ایم اے ۶ روپے

۶۱۔ وادیٔ نیل۔ تصنیف محمد قطب الدین ایم ایس سی عثمانیہ بمقدمہ پروفیسر شمیم اختر (کراچی یونیورسٹی) ۲۴ روپے

۶۲۔ تاریخی شہ پارے۔ از مرزا علی اظہر برلاس بی اے بی ایل ۲۰ روپے

۶۳۔ مسلمانانِ بنگال کی تعلیم۔ از سید مصطفےٰ اعلی بریلوی بی کام۔ ایل ایل بی ۲۰ روپے

(باقی دارد)

مکمل فہرست مطبوعات دفترِ کانفرنس سے طلب فرمائیے